ناول
بھاگ بھری
A Story Of Nuclear Disaster
صغرا زیدی

(A story of nuclear disaster)

میں سڑکیں کھڑیا موتیا
میں کنکیں سنئ بھُکھ
میں بھاگ بھری دا بالکا
میڈے دھیاں ورگے دکھ

محمود اعوان

میں رہگزر کا پھُول ہوں
میں بھُوک سنہری کھیت کی
میں بھاگ بھری کا بالکا
پر روگ میرے دھی رانی کے

ترجمہ: علی اکبر ناطق

پیش لفظ

میرا پہلا ناول ''چینی جو میٹھی نہ تھی'' ۲۰۱۳ء میں ہالینڈ میں ولندیزی زبان میں شائع ہوا تھا۔ اُس ناول کی اشاعت کے دوران کچھ اِس طرح کے سوالات ذہن میں بار بار سر اٹھاتے رہے تھے کہ:

''اپنی زمین کے موجودہ حالات کو نظر انداز کر کے ،جنوبی امریکا میں جا بسنے والے ہندوستانیوں کو موضوع سخن کیوں بنایا؟''۔

اِس طرح کے بہت سارے سوالات نے دل و دماغ میں ایک بھونچال سا پیدا کر دیا تھا۔ بھونچال کی اس کیفیت نے بالآخر ایک نئے ناول کے کرداروں کو جنم دینا شروع کر دیا۔ پھر یوں ہوا کہ ان کرداروں نے ایک ناول کو تخلیق کر ڈالا۔ یہ ناول کم وبیش میرے وطن پر بیتنے والی تین دہائیوں کی عکاسی کرتا ہے۔ ماضی کے جھروکوں میں دیکھتے ہوئے یاد آتا ہے کہ سیکنڈری اسکول میں داخل ہوتے وقت زندگی کچھ کچھ سمجھ میں آنا شروع ہو گئی تھی۔ ذہن گو کہ بچپن ہی سے سوالات اٹھانے کا عادی تھا،لیکن اب ذہن میں کلبلانے والے سوالات کا افق وسیع ہونے لگا تھا۔ اسکول جانا یوں تو بچوں کو اکثر پسند ہوتا ہے،لیکن مجھے اپنے اسکول، اپنی نصابی وغیر نصابی کتابوں سے بے حد لگاؤ تھا۔ خاص طور سے مجھے یونی فارم کی کلف لگی ہوئی خاکی پتلون اور نیل سے اجالی گئی سفید براق شرٹ بہت ہی عزیز تھی۔ سیکنڈری اسکول کا یہ زمانہ جنرل ضیاء الحق کے دور کی ابتداء تھی، یعنی ۱۹۸۰ کا عشرہ...ایک روز ہمارے ہیڈ ماسٹر نے اپنے خصوصی خطاب میں یہ حکم صادر کیا کہ تمام طلباء ایک ہفتے کے اندر اندر پیلے رنگ کی قمیض، شلوار سلوالیں اب یہ مغرب زدہ لباس پہننا ممنوع ہوگا۔ جس وقت ہیڈ ماسٹر حکم صادر کر رہے تھے، انہوں نے خود پتلون شرٹ زیب تن کی ہوئی تھی۔ ہیڈ ماسٹر کا یہ حکم مجھ پر بجلی کی مانند گرا تھا کیوں کہ مجھے یکا یک اپنے پسندیدہ لباس پہننے کے حق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اب مجھے روزانہ اپنا ناپسندیدہ شلوار قمیض ہی پہننا تھا۔ اس جبری رویّے کی بنا پر میرا دھیان پڑھائی سے کافی حد تک ہٹ

گیا تھا۔ میں پانچویں جماعت تک اپنی کلاس میں پہلے یا دوسرے نمبر پر آتا تھا لیکن اب مجھے اوّل یا دوم آنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

کچھ ہی عرصے بعد اسکول میں ایک نیا قانون نافذ کیا گیا کہ تمام طلباء ظہر و عصر کی نماز باجماعت ادا کریں گے۔ گھر میں پہلے ہی والد صاحب قبلہ سے وقت پر نماز ادا نہ کرنے پر اکثر پھٹکار پڑا کرتی تھی۔ اب استاد بھی نماز پڑھوانے کے پیچھے تُل گئے تھے۔ میری کلاس کے استاد نے تو کلاس روم سے کرسیاں نکلوا کر دریاں بچھوا دی تھیں تاکہ نیچے بیٹھ کر سنت پیغمبر کے مطابق درس حاصل کیا جائے۔

ایک روز اسکول جاتے ہوئے دیکھا کہ گلی کے کونے پر ایک فوجی کھڑا ہے۔ اس نے مجھے اشارے سے پاس بلا کر محلے میں رہنے والے ایک بزرگوار کا پتہ دریافت کیا۔ وہ بزرگوار ہمارے گھر کے پچھواڑے ہی میں رہتے تھے۔ میں نے فوجی کو اشارے سے مطلوبہ گھر کی نشاندہی کردی۔ فوجی نے قریب کھڑی فوجی گاڑی کا دروازہ کھولا، اس میں سے انگریزی فلموں کے ہیرو کے مانند دھوپ کا چشمہ لگائے ہوئے ایک اور فوجی نکلا جس کے کندھوں پر ٹنکے ہوئے تین ستارے اسے دوسرے سپاہیوں سے ممتاز کر رہے تھے۔ فوجیوں کا یہ چھوٹا سا قافلہ محلے کے بزرگوار کے گھر کی طرف چلے گیا۔ اسکول سے واپس آنے پر معلوم ہوا کہ جنرل ضیاء الحق نے اس بزرگوار محلّہ کو ناظم صلواۃ مقرر کیا ہے۔ ان کی یہ ذمے داری ہوگی کہ محلے کے تمام افراد نماز باجماعت ادا کریں۔

کبھی کبھی صدر جانا ہوتا تو بس میں سے ایم اے جناح روڈ پر قائم طبقہ اشرافیہ کا کراچی گرائمر اسکول نظر آتا تھا۔ اس اسکول کے طلباء یونیفارم کے طور پر پتلون ہی پہنتے تھے۔ انہیں دیکھ خیال آتا تھا کہ اسلام کا نفاذ غالباً ایک مخصوص طبقے پر ہی کیا جارہا ہے۔

بچپن میں میرا شہر بڑی حد تک سیکولر تھا۔ لوگ خاص مواقع پر سڑک پر پردہ لگا کر اجتماعی طور پر فلم بینی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ خواتین بھی اس طرح کی سماجی سرگرمیوں میں برابر کی حصے دار ہوتی تھیں۔ اہل کراچی موسیقی کے کنسرٹ کا اہتمام کرنے کے لئے بہانے ڈھونڈتے تھے۔ پھر اسلام کی آمد کے ساتھ ہی شہر کا مزاج بدلنا شروع ہوگیا۔ تبلیغی جماعتوں کی ریل پیل ہوگئی، نئی نئی تنظیمیں جنم لینے لگیں۔ تب جن نوجوانوں کے ہاتھوں میں کرکٹ کے بلے اور ہاکیاں ہوا کرتی تھیں۔ اب ان کے ہاتھوں میں ہتھیار نظر آنے

لگے۔شہر میں لسانی اور فرقہ وارانہ فسادات معمول کا حصہ بن گئے تھے۔اب شہر میں موسیقی کی آہنگ کی جگہ ہتھیاروں کی گڑگڑاہٹ نے لے لی تھی۔انتہا پسندی اور عدم برداشت کے رویے شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی سمیت تمام فرقوں میں بلاتفریق سرایت کرتے جا رہے تھے۔تعلیمی اداروں اور مدرسوں سے نوجوان جوق در جوق جہاد افغانستان میں شریک ہونے جانے لگے تھے۔جب ایک دہائی تک دہکنے کے بعد جہاد افغانستان کی بھٹی قدرے سرد ہوئی تو جہاد کشمیر کا تندور دہک چکا تھا۔

عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد سماجی تعلقات شہر سے نکل کر ملکی سطح پر استوار ہوئے تو معلوم ہوا کہ میرا شہر ہی نہیں بلکہ سارا ملک ہی انتہا پسندی کا شکار ہو چکا تھا۔

زیرِ نظر ناول اس مٹی پر گزرنے والی قیامتوں کی داستان ہے،اس داستان میں نہ تو کوئی علامت نگاری ہے اور نہ ہی ناول نگاری کے کسی مخصوص اسکول کی عکاسی،کبھی کبھی اس کہانی میں الفاظ تازیانوں کی مانند برسے ہیں۔ یہ چابک اور تازیانے اس ناول کے کرداروں نے بے حس معاشرے کی پشت پر برسائے ہیں!....

صفدر زیدی

دی ہیگ،ہالینڈ

مشرف عالم ذوقی کی نظر سے

ڈومینک لیپیرے کی کتاب ''از نیویورک برننگ'' خالد حسینی کی ''دی کائٹ رنر''، محسن حامد کی ''دی ریلکٹنٹ فنڈامینٹلسٹ'' کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ فکر حاوی رہی کہ ہمارے اردو ادیب سماج وسیاست اور حقیقت نگاری سے وابستگی کا اعلان تو کرتے ہیں، لیکن حقیقت سے مستقبل کی جستجو تک جس اسلوب، لہجے اور ویژن کی ضرورت ہے، اس کا بڑی حد تک ان کے یہاں فقدان کیوں نظر آتا ہے؟۔

مذکورہ بالا تینوں ناولوں میں حقیقت کی سفاک عکاسی بھی ہے اور مستقبل کی تباہ کن دنیا کو دیکھنے کی کوشش بھی۔ اس حقیقت سے آنکھیں چرانا مشکل ہے کہ اب دنیا کا بڑا ادب سیاست کے جبر سے ہی برآمد ہوگا۔ ہم اس میں صرف ماضی کے تذکرے، تہذیبوں کے نوحے، نسل در نسل تعصبات کی پیوندکاری نہیں کر سکتے۔

صفدر زیدی نے ایک بڑے کینوس پر ناول لکھ کر ہمیں حیران کر دیا ہے۔ عالمی سیاست کی بساط پر دو کمزور مہرے ہندوستان اور پاکستان بھی ہیں۔ ہندوستان کی تقسیم بھی مذہب کی بنیاد پر ہوئی۔ ستر برسوں کے پاکستان کو مذہب کی زنگ آلود تلوار نے لہولہو کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

پاکستان آج بھی ضیاء الحق کی حکومت کے بعد طالبانوں اور دہشت گردوں کے سائے میں خوفناک حد تک خانہ جنگی کا شکار ہے۔ آپ تقسیم کے بعد پاکستان پر نظر ڈالتے ہیں تو بدترین دور کی بنیاد ضیاء الحق کی حکومت نے رکھنے میں کامیابی حاصل کی۔ ضیاء نے اسلام کا نعرہ تو دیا لیکن ملک انتہاء پسندوں کے ہاتھ میں تھما دیا۔۔۔

ناول میں اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ کس طرح اس دور میں انسانی حقوق کو مذہب اور انتہاء پسندی کے نام پر پامال کیا گیا۔ ہندوستان میں انتہاء پسندی کا تخم کانگریس نے بویا اور مذہبی دہشت نے ہندوستان کا امن وسکون چھین لیا۔

صفدر زیدی کی گہری نگاہ سے نہ تقسیم کا درد پوشیدہ رہا، نہ آزادی کے بعد کے ہندوستان اور پاکستان کا خون آلودہ منظر نامہ، جس کا شکار عوام ہوئے۔ صفدر نے حقیقت کو محسوس کرتے ہوئے کتاب کا انتساب اجڑی ماؤں کے نام کیا۔

مسلمان بہتر فرقوں میں تقسیم ہو گیا۔ مسجدیں الگ الگ ہو گئیں۔ دہشت اور انتہاء پسندی کے خوفناک سلسلۂ واقعات نے نہ ہندوستان کو سکون سے رکھا، نہ پاکستان کو۔ قیامتیں گزر گئیں۔۔۔ دونوں ممالک امریکی سامراجیت کے لئے آسان نوالے بن گئے۔

صفدر زیدی نے ناول کی شروعات انگلستان ۳۰۰۰ سے کی ہے۔ اور یہ شروعات بھی صفدر زیدی کی باریک بینی اور دور اندیشی کا نتیجہ ہے، یہ دور اندیشی عالمی سیاست پر ان کی مضبوط گرفت کے ساتھ ان کی درد مندی اور تاریخی شعور کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتی ہے۔

تاج محل محبت کی علامت ہے۔ لیکن سنہ تین ہزار میں ہنرمندوں کی ٹیم نے دریائے ٹیمز کے کنارے باوقار طریقے سے ایسا ہی ایک تاج محل ایستادہ کر دیا ہے۔ ایسا اس لئے کیا گیا کہ اگر ہندوستان دوبارہ کبھی آباد ہو تو یہ امانت وہاں منتقل کی جا سکے۔

کیا مذہب کا تہذیب پر غالب آجانا ہندوستان کی تباہی و بربادی ثابت ہوا؟

کیا ہند و پاک کو مذہب و انتہاء پسندی کی حکومت تباہ و برباد کر دے گی؟۔ تاج محل زندہ ہے۔۔۔ یعنی محبت کا انفرادی و اجتماعی رنگ برقرار ہے۔۔ لیکن مذہبی جنون نے ہر بار انسانی سماج و معاشرے کو نقصان ہی پہنچایا ہے۔۔۔ یہ کچھ ایسے سوالات ہیں جو اس ناول میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔۔۔ ان کے جوابات صاحب اقتدار سے زیادہ عوام کی خاموشی، بے حسی اور مایوسی میں پوشیدہ ہے۔ موجودہ حالات اور سیاسی منظر نامے کے پیش نظر ماضی اور مستقبل کے کولاژ سے صفدر نے ایک ایسے موضوع کو اٹھانے کی کوشش کی ہے، جہاں راستہ بھی ہے، زندگی بھی۔ یہ ناول موجودہ سنگین حالات کے لئے چیلنج بھی ہے، عوام میں بیداری پیدا کرنے کا مشن بھی۔

میں ان کی جرأت رندانہ کو سلام کرتا ہوں۔

مشرف عالم ذوقی

تقریظ

سفدر زیدی کا ناول 'بھاگ بھری'' پاکستانی معاشرے کے کھوکھلے پن، ذہنی وفکری انحطاط، اور سماجی استبداد کی لہوانگیز داستان ہے۔ چھوٹی چھوٹی کہانیوں نے مل کر اس ناول کو جنم دیا ہے۔ ان داستانوں میں فرد سے فرد کا قلبی رابطہ منقطع ہو چکا ہے۔ اور معاشرہ اپنی تہذیب کھو کر بے چہرہ ہو گیا ہے۔ اب سماج میں جنگل کا قانون ہے اور یہی قانون دستور تسلیم کر لیا گیا ہے۔

یہ ناول ایک ایسے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے جس میں ہر طاقتور شخص اپنا قانون مسلط کرنا چاہتا ہے۔ گویا وہی حق پر ہے دوسرا باطل پر۔ یہ ناول اشرافیہ شکن ہے جو مذہبی، سیاسی اور طبقاتی معاشرت کا تشکیلی بیانیہ ہے۔ اس ناول میں عوامی حرکیات اور متعلقات گہرے اور عمیق ہیں۔ بنیادی طور یہ ایک ماحولیاتی ناول ہے جس کی تخصیص مشکوک ماحولیات میں پوشیدہ ہے۔ اس میں عمیق ثقافتی اور حساس قسم کا موضوعی احتجاج نمایاں ہے۔ اور یہ احتجاج مزاحمت بن کر قرطاس پر پھیل جاتا ہے۔ ناول کے بیانیے نے طبقاتی اونچ نیچ کے نسل در نسل تعصبات کو ایک ڈرامائی لہجہ دیا ہے۔ اس میں علاقائی، لسانی اور مذہبی سامراجیت کا اندوہناک تجزیہ ہے۔

''بھاگ بھری'' سیاسی اور معاشرتی سطح پر مائل بہ زوال معاشرے کا تھریلر ہے۔ جس کو پڑھ خوف سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ناول میں صوبہ سندھ اور پنجاب کی معاشرتی، سیاسی، ثقافتی سفاکیوں، تشدد پسندی اور تذلیلِ بشر کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ ناول ماضی کے سیکولر ناسٹلجیا کو ذہن میں سمائے عہد حاضر میں مذہب کے جبر اور تشدد پسندی کے خلاف ایک نعرہ احتجاج اور نعرہ قلندری ہے۔

اس ناول یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ افغانستان سے کشمیر اور کراچی سے بلوچستان تک ''اسلام'' معدوم ہو چکا ہے۔ اور لوگ شیعہ، سنی، بریلوی، دیوبندی اور اہل حدیث ہونے پر فخر کرنے لگے ہیں۔ اب اسلام کی

آفاقی جہت معدوم ہو چکی ہے۔اس ناول میں افسانوی مکالماتی اسلوب بہت گہرا، کاٹ دار اور اثر انگیز ہے۔معاشرے کی عکاسی الفاظوں میں اس طرح کی گئی ہے کہ ذہن میں فلم سی چلنے لگتی ہے۔

''ہم غریبوں کو بھگوان جتنا کم دیتا ہے ہم کو بھوک اتنی ہی زیادہ لگتی ہے''۔

سندھ اور پنجاب میں وڈیرہ گردی اور ظلم کی مندرجہ بالا مکالمہ بھرپور عکاسی کرتا ہے۔جس سے اس علاقے کی دہقانی معاشرت کا سفاک مزاج سمجھ میں آتا ہے۔

''دور کرو اس حرام زادے پلید کو!۔۔اس کو مویشیوں کے باڑے میں جانوروں کے ساتھ باندھ دو!۔۔اس خبیث کو تین دن بغیر کھائے پیے باندھ کر رکھنا!۔۔تاکہ اس کے کان کھل جائیں اور حکم عدولی اس کے ذہن سے نکل جائے''۔

اس ناول میں ان مکالمات کو پڑھ کر پاکستانی معاشرت کی حقیقی شکل نظر آتی ہے۔

''کافروں کا ایک علاج،۔۔۔۔ الجہاد، الجہا، ۔۔۔انقلاب، انقلاب،۔۔۔۔۔اسلامی انقلاب۔۔۔کرچی تا خیبر مُلا عمیر رہبر،۔۔کابل کی آزادی تک جنگ رہے گی، جنگ رہے گی،۔۔ایران کی بربادی تک جنگ رہے گی، جنگ رہے گی،۔۔۔کراچی تا کابل طالبان، طالبان''۔

اس ناول کے کرداروں میں ہر کردار ایک کہانی ہے،جن کا لہجہ اپنے تعصبات اور سفاکی کی وجہ سے جدا ہے۔بھاگ بھری، (ساون) خالد، وڈیرہ حیدر شاہ، پروفیسر صاحب اور کرنل ولید کے کردار بہت توانا ہیں۔

''بھاگ بھری'' پاکستان کی حشر سامانیوں، عدم مساوات اور ریاستی جبر پر نوحہ کناں ہے۔اس ناول نے لفظی مصوری کے اظہار اور پُر اثر جمالیاتی علامتوں کے استعمال سے معاشرتی خول میں بند دیمک زدہ معاشرے کے چہرے سے نقاب اُلٹ کر رکھ دی ہے۔

احمد سہیل

ٹیکساس، امریکہ

اہم کردار

بھاگ بھری (ماں): ایک نچلی ذات کی ہندو عورت جو ایک زمیندار کے لئے جبری مُشقت کرنے پر مجبور ہے۔

ساون (خالد سُفیانی) بھاگ بھری کا بیٹا جو گھر سے بھاگ کر انتہا پسند مسلمانوں کے ہاتھ چڑھ جاتا ہے۔ اُس کا نام ساون سے تبدیل ہو کر خالد ہو جاتا ہے۔

وڈیرہ حیدر شاہ۔۔۔ گاؤں کا بڑا زمیندار، جس کی زمینوں پر بہت سے مرد عورتیں اور بچے جبری مزدوری کرتے تھے۔ بھاگ بھری اور ساون بھی اِسی وڈیرے کے جبری مزدور تھے۔

پروفیسر صاحب: برطانوی طلباء کے استاد۔

وڈیرہ جعفر شاہ۔۔۔۔۔ بڑے زمیندار کا چھوٹا بھائی۔

قاری صاحب: ایک مدرسے کے مہتمم

کرنل ولید۔۔۔۔۔ جو آگے چل کر میجر جنرل کے عہدے پر فائز ہو کر ایٹمی ہتھیاروں کے انچارج بنیں گے۔

پہلا حصہ

انگلستان ۳۰۰۰ء

انیس نقوی

(۱)

بین الاقوامی انجینئرز اور ماہر ہنر مندوں کی ایک ٹیم نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔ اِن کی انتھک محنت اور قربانیوں کے نتیجے میں محبت کی علامت 'تاج محل' دریائے ٹیمز کے کنارے اتنے ہی باوقار طریقے سے ایستادہ تھا جیسے کہ وہ کبھی دریائے جمنا کے کنارے بر! جمان اپنی خوبصورتی سے چاندنی کو شرمایا کرتا تھا۔
چند ہی روز میں تاریخ انسانی کا یہ عجوبہ ہر خاص و عام کے لئے کھلنے والا تھا۔ انگلستان کی مختلف یونی ورسٹیز (جامعات) کے منتخب طالب علم اس شاہکار کا دورہ کرنے کو تیار تھے۔ جنوبی ایشیا کی سیاسی تاریخ کے پروفیسر کی نگرانی میں اِن طالب علموں کو ہندوستان کی تہذیب کو محفوظ رکھنے والے عجائب گھروں کا دورہ کر کے مختلف مضامین پر مقالے تحریر کرنا تھے۔ اِن طالب علموں میں شامل سوزن ہندوستان کی سیاسی تاریخ پر تحقیق کر رہی تھی جبکہ فلپ کا تعلق بھی اس کی یونیورسٹی سے ہی تھا مگر دونوں کے نظریات میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔
سوزن سمجھتی تھی کہ ہندوستان کی بربادی کی ذمہ داری ترقی یافتہ دنیا پر عائد ہوتی ہے۔ جبکہ فلپ کا خیال تھا کہ اس تباہی کے ذمے دار ہندوستان و پاکستان خود ہی تھے۔
طالب علموں کا یہ گروپ پروفیسر صاحب کی سربراہی میں تاج محل کے دورے کے لیے لندن سے روانگی کے لیے تیار تھا۔ ہوا میں معلق، مقناطیسی طاقت سے چلنے والی برق رفتار ٹرین میں سوار ہونے کے لیے سب لوگ پلیٹ فارم پر اکھٹے ہو چکے تھے، ہوا کے ایک تیز جھونکے کے ساتھ ٹرین نمودار ہوئی۔ سب اپنے انگوٹھے اسکین کرتے ہوئے ٹرین میں سوار ہو گئے۔ یوں تو سوزن نے ہندوستان کی تمام مشہور تاریخی عمارات کے بارے میں پڑھ رکھا تھا لیکن تاج محل کی محبت سے وابستگی اُسے سب سے ممتاز بناتی تھی۔ وہ اکثر ملکہ ممتاز محل پر رشک کرتی تھی کہ اُسے کسی نے اِس قدر ٹوٹ کر چاہا تھا۔ اُس نے تاج محل کو صرف تصاویر اور فلموں میں ہی دیکھا تھا۔ وہ بہت ہی خوش تھی کیوں کہ آج وہ اِس شاہکار کو اپنے ہاتھوں سے چھونے والی تھی۔ وہ اپنی

سوچوں کے تانے بانے بُن ہی رہی تھی کہ ٹرین میں لگے اسپیکرز سے اعلان ہوا۔

''ہمارا اگلا اسٹیشن آگرہ ہوگا۔تاج محل دیکھنے والے مسافروں سے گزارش ہے کہ اس اسٹیشن پر اتر جائیں''۔

اِس اعلان کو سُن کر وہ اپنی خیالی دُنیا سے باہر نکل آئی۔لندن سے کوئی سو کلومیٹر کا فاصلہ کچھ منٹوں میں طے ہوگیا تھا۔سب طالب علم اپنا اپنا سامان سنبھالے ٹرین سے اُتر آئے۔سوزن کو تاج محل دیکھنے کی زیادہ ہی بے تابی تھی اس لئے وہ خود کار زینے پر دوڑتے ہوئے چڑھ گئی اور سب کے اسٹیشن سے باہر آنے کا انتظار کرنے لگی۔ابھی اِس سیر کا ایک چھوٹا سا مرحلہ باقی تھا۔اِن سب کو سڑک پار کر کے ایک کیبل کار میں سوار ہونا تھا۔اِن لوگوں کو کیبل کار کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔سب جلدی سے اِس میں سوار ہو گئے۔کار بلند ہونے کے فوراً بعد ہی سب کی نظروں نے سنگِ سفید سے ترشے ہوئے شاہکار کو تلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔

''وہ رہا تاج محل!فلپ نے زوردار نعرہ مارتے ہوئے ایک طرف کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔سرسبز باغوں کے بیچوں بیچ،سفید مرمر سے تراشا ہوا تاج محل کسی بڑے سے زمرّد میں جڑے موتی کی طرح نظر آرہا تھا۔سب اِس انمول نظارے کو اپنے کیمروں میں محفوظ کرنے میں مصروف ہو گئے تھے لیکن سوزن تاج محل کے سحر میں کھوئی ہوئی تھی۔سب کیبل کار سے اُتر کر پروفیسر صاحب کے ہمراہ تاج محل کے صدر دروازے کی طرف چلنے لگے۔اِس عجوبے کے مینیجر دروازے پر پہلے ہی سے سب کے منتظر تھے۔انہوں نے بڑھ کر پروفیسر صاحب سے ہاتھ ملایا،خیر آمدی کلمات کے تبادلے کے بعد پروفیسر صاحب نے تمام طلباء سے اُن کا تعارف کروایا۔مینیجر نے سب کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔یہ سب ایک بڑے سے ہال کے اندر داخل ہوئے جہاں ایک طرف بہت سے لاکرز دیواروں کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔دوسری دیواروں کے ساتھ بہت سی مشینیں لگی ہوئی تھیں۔اِن مشینوں سے انگوٹھے اسکین کر کے،تاج محل کو دیکھنے کا ٹکٹ،ایک دفعہ کے استعمال کرنے کو دستانے اور جوتے نکالے جاسکتے تھے۔تاج محل کی دیواروں کو بنا دستانے پہنے چھونا منع تھا۔سب نے اپنا غیر ضروری سامان لاکرز میں رکھنے کے بعد مشینوں سے دستانے اور جوتے نکال کر پہن لیے۔

''آپ سب نے اِس پروجیکٹ کی تفصیلات آن لائن دیکھ لی ہوں گی!پھر بھی میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ایک ایک ٹائل کو بغیر نقصان پہنچائے نکالنا کوئی آسان کام نہ تھا''مینیجر نے کہا۔

مینیجر نے بہت فخر سے سب کو مزید آگاہ کیا:

''جن حالات اور تباہی سے ہندوستان اور وہاں کے لوگ گذرے تھے، ایسے حالات میں تاج محل کی منتقلی ایک دیوانے کا خواب تھا۔ اس مشن کی تکمیل میں ہمارے بہت سے ساتھیوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے''۔ یہ بتاتے ہوئے منیجر کے چہرے پر فخر کی تاب ناکی کے ساتھ خوف کا سایہ صاف عیاں تھا۔

''تاج محل کو اِس عزم کے ساتھ یہاں منتقل کیا گیا ہے کہ اگر ہندوستان کبھی پھر آباد ہوا تو اِس امانت کو دوبارہ وہاں منتقل کر دیا جائے گا''۔ منیجر کے لہجے سے اُس کا عزم جھلک رہا تھا۔

''مجھے شک ہی ہے، ہم نے کبھی ہندوستان کو اُس کا کوہِ نور واپس نہ کیا! ہم بھلا اتنا بڑا ہیرا کیسے واپس کریں گے''۔ سوزن نے فلپ کے کان میں کاناپھوسی کرتے ہوئے کہا۔

''ہم نے تاج کی اصل عمارت کو ماحول کے اثرات سے محفوظ کر کے اُسے ریت سے ڈھانپ دیا ہے تاکہ اُس کی کبھی اصل حالت میں تجدید کی جا سکے''۔

منیجر نے ایک بار پھر اپنے اِس عزم کا اظہار کیا کہ تاج محل یہاں پر ہمیشہ کے لئے منتقل نہیں کیا گیا ہے۔

''میں آپ کو اب زیادہ دیر تک تاج کے دیدار سے محروم نہیں رکھوں گا''۔ یہ کہہ کر اُس نے تاج محل کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

سُرخ راجھستانی پتھروں سے بنے ایک قلعہ جیسے دروازے سے سب لوگ داخل ہوئے تو تاج محل کو اتنے قریب سے دیکھ کر سب ششدر رہ گئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ سفید پتھر سے بنی یہ عمارت بے جان نہیں۔ یہ خاموش تو کھڑی ہے پر گویا ہے۔ خاموشی کی زبان میں اپنی کہانی سنا رہی ہے۔ نہ جانے اِن سنگ مرمر کے پتھروں نے کیا کیا دیکھا اور سُن رکھا ہے۔

سب افراد شفاف پانی کے ساتھ ساتھ بنی ایک راہداری پر چلتے چلتے دُودھیا سیڑھیاں چڑھ کر تاج کے صحن تک پہنچ گئے۔ اب سب لوگ سر اٹھائے تاج محل کے چاروں اطراف ایستادہ میناروں کو دیکھ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ چاروں مینار تاج کی نگہبانی پر مأمور ہوں۔ فلپ عربی زبان کا ماہر تھا، وہ میناروں پر کندہ آیات قرآنی پڑھ کر سب پر رعب جما رہا تھا۔

''اب آپ لوگ انفرادی طور پر تاج محل کی سیر کر سکتے ہیں۔ تاج محل ریسٹورنٹ ہمارا میٹنگ پوائنٹ ہے۔ پانچ بجے ہم سب دوبارہ ملیں گے''۔ پروفیسر صاحب یہ کہہ کر منیجر کے ساتھ چلے گئے۔

تاج کا گوشہ گوشہ دیکھتے ہوئے وقت تیزی سے گزر گیا۔

''پانچ بجنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں سب صحن میں آجائیں''۔

فِلپ نے یہ پیغام اپنی کلائی کی گھڑی کے ذریعے سب تک پہنچا دیا۔ سب لوگ فوراً ہی تاج کے سفید مرمری صحن میں جمع ہو گئے۔ وہاں سے وہ سب تیز تیز قدم اٹھائے ہوئے نزدیکی ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئے۔ ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے ہی ان کو ایسے لگا کہ ہندوستان کے کسی شہر میں آگئے ہیں۔

ریسٹورنٹ کا اندرونی ماحول بالکل کسی ہندوستانی فِلم کے ایک سیٹ کی طرح لگ رہا تھا۔ مصوّروں کے خوبصورت فن پارے جا بجا دیوار پر آویزاں تھے مٹی کے دیوں اور لالٹینوں کے شعلوں سے روشنی تھرتھراتی ہوئی منعکس ہو رہی تھی۔

ریسٹورنٹ میں ایک حصہ ہندوستانی حقّوں کے لئے بھی مخصوص تھا۔ اُن کی نظر سامنے ایک لمبی سی میز پر پڑی۔ وہاں پروفیسر صاحب اور منیجر پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ سوزن غور سے ریسٹورنٹ کی ایک دیوار کو دیکھ رہی تھی۔ وہاں انڈس ویلی کی تہذیب کے آثار کی بہت خوبصورت نقاشی کی گئی تھی۔

سوزن نے دل ہی دل میں سوچا:

''آج سے تقریباً پانچ ہزار سال پہلے یہ ہندوستانی لوگ شہروں کو ایک منظّم طریقے سے بسانا جانتے تھے''۔

وہ تاریخ کی بھول بھلیوں میں کھوئی ہوئی تھی، اُس کا دل وہاں سے ہٹنے پر آمادہ نہ تھا کہ فِلپ کی آواز نے اس کو چونکا دیا:

''محترمہ! سب لوگ کھانے کی ٹیبل پر بیٹھ چکے ہیں اور آپ کے منتظر ہیں''۔ وہ اپنے خیالوں سے نکل آئی اور جھینپتی ہوئی فِلپ کے ساتھ کھانے کی میز کی طرف چل دی. ان دونوں کے بیٹھنے کے بعد پروفیسر صاحب نے منیجر کا ایک بار رسمی طور پر شکریہ کیا اور اُن سے اپنے خیالات کا اظہار کرنے کو کہا۔

منیجر نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر کہا:

''تمام تفصیلات تو آپ سب نے آن لائن دیکھ لی ہیں مگر ایک بات اہم ہے کہ اس عجوبے کو دیکھنے کے لئے اگلے تین سال تک کے ٹکٹ بک ہو چکے ہیں اس کا مطلب یہ ہے اِس پروجیکٹ پر جو کچھ خرچ ہوا ہے وہ تین سال میں تقریباً واپس مل جائے گا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ تاج محل ایک ایسا شاہکار ہے کہ جس کو

دیکھنے کے لئے ہندوستان میں سیاحوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ گو کہ انگلستان میں سیاحوں کی آمد بہت ہے لیکن تاج کی وجہ سے یہ آمد دُگنی سے زیادہ ہونے کا امکان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سیاحت سے متعلق تمام سیکٹرز میں اس کا مثبت اثر پڑے گا، روزگار بڑھے گا اور نئے ہوٹلز تعمیر ہوں گے۔ یہ عمارت ہمارے ملک کے لئے ایک خوش بختی کی علامت ہوگی۔ اور کیوں نہ ہو یہ عمارت محبت کے نام پر تعمیر ہوئی تھی۔ محبت خوش بختی ہی کا دوسرا نام ہے۔ آپ سب کا یہاں آنے پر ایک بار پھر شکریہ''۔

یہ کہہ کر منیجر صاحب اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔

''میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ میں سے کئی طالب علم سوالات پوچھنے کے لئے بے تاب ہیں''۔

پروفیسر صاحب نے اپنے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا:

کیا آپ کے خیال میں مذہب کا کلچر پر غالب آجانا ہندوستان کی تباہی کا باعث تھا؟

البرٹ نے سوال کیا۔

''اس سوال کا جواب بہت تفصیل چاہتا ہے۔ مختصر الفاظ میں اس سوال کا جواب ممکن نہیں. میری تجویز ہے کہ سوالات کا دور ہوسٹل میں ہی بہتر رہے گا۔ آپ سب کو ایک ناول ای میل کیا جائے گا جس میں ہندوستان کی تباہی کے مختلف عوامل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ناول کے کچھ باب مشترکہ طور پر روزانہ پڑھیں، اور اس پر اظہار خیال اور مباحثہ کریں۔ آیئے اب ہم سب بوفے کی طرف چلتے ہیں۔ آج کا کھانا اٹھارویں صدی کے مغلیہ کھانوں پر مشتمل ہے''۔

پروفیسر صاحب نے یہ کہہ کر سب کو بوفے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

کھانے کے بعد پروفیسر صاحب نے منیجر صاحب کا ایک بار پھر شکریہ ادا کیا۔ سب لوگ لاکرز سے اپنا سامان نکال کر باہر کی طرف چل پڑے۔ یہ سب ایک بار پھر تاج محل کو بلندی سے دیکھنا چاہتے تھے۔ سب نے اپنے کیمرے کیبل کار میں داخل ہونے سے پہلے ہی تیار کر لیے تھے۔

اس بار منظر کچھ زیادہ ہی دلکش تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ تاج اپنے اوپر پڑنے والی سفید روشنی میں نہایا ہوا تھا، جیسا کہ چاند زمین پر اتر آیا ہو یا شاید کوئی دوشیزہ سفید براق لباس عروسی زیب تن کیے کسی کا ہاتھ زندگی بھر کو تھامنے کے لئے تیار کھڑی ہو۔

(۲)

ہاسٹل کے میٹنگ ہال کے بیچ نصب ایک بڑی سی انگیٹھی میں آگ روشن تھی۔ البرٹ وقفے وقفے سے کچھ خشک لکڑیاں انگیٹھی میں ڈال دیتا تھا تاکہ ماند پڑتے ہوئے شعلوں کو نئی زندگی دی جاسکے۔ یہ لکڑیاں جنگل سے حاصل نہیں کی گئی تھیں، بلکہ لیبارٹریز میں تیار ہوئی تھیں، کیونکہ یورپ میں کم بارشوں کی وجہ سے جنگلات کے رقبے کافی گھٹ چکے تھے۔ البرٹ ساری دنیا سے ہندوستانی لوک داستانوں کو اکھٹا کر رہا تھا۔ وہ ہندی، اردو، پنجابی، بنگالی اور جنوبی ہندوستان کی کئی زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ داستانیں اکھٹا کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے داستان گوئی کا مشرقی فن بھی سیکھ لیا تھا۔ اسی وجہ سے سب نے اس سے پروفیسر صاحب کے تجویز کردہ ناول کو سنانے پر اصرار کیا تھا۔ اُس نے اس درخواست کو بہت خوشی سے قبول کرلیا تھا۔ ویسے بھی داستانیں سننا، سنانا اور ان کو محفوظ کرنا اس کا مشغلہ تھا۔ البرٹ نے اپنے الیکٹرونک ریڈر کو آن کیا اور کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا۔ سوزن نے اس کی کرسی کے برابر ٹیبل پر پانی سے بھرا گلاس لاکر رکھ دیا۔

''یہ کہانی ۱۹۸۵ء میں ہندوستان کے اس حصے میں شروع ہوتی ہے جس کا نام اس وقت پاکستان تھا۔ ناول کا ابتدائی کردار ایک اچھوت عورت ہے جس کا نام بھاگ بھری ہے۔ بھاگ بھری کا مطلب ہے خوش نصیب یا اچھے نصیبوں سے بھری۔ بھاگ بھری نے ایک بڑے زمیندار، حیدر شاہ کی زمین پر بنی ایک چھوٹی سی کٹیا میں آنکھ کھولی تھی۔ اس کے ماں باپ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں بنجاروں کی طرح سفر میں رہتے تھے۔ اُن کو جہاں بھی کام ملتا تھا وہیں چھوٹی سی کٹیا بنا کر رہنے لگتے تھے۔ بے روزگار ہونے پر بیل گاڑی پر اپنا سب کچھ لاد کر پھر کسی انجانی منزل کی طرف روزگار کی تلاش میں نکل جاتے تھے۔ بھاگ بھری کے باپ کو ایک روز وڈیرے حیدر شاہ کی زمینوں پر کام مل گیا۔ اس نے اپنے بیل کے مرنے کے بعد دوسرا بیل خریدنے کے لئے حیدر شاہ سے قرضہ لیا اور یوں وہ وڈیرے کے بچھائے ہوئے معاشی جال میں پھنس گیا۔

اب یہ چھوٹا سا خاندان قرضہ ادا کئے بنا گاؤں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ یہ گاؤں اُن کے لئے کے ایک کُھلا زندان تھا۔ بھاگ بھری نے آنکھ کھولتے ہی ماں کو کھیتوں میں کام کرتے دیکھا تھا، سو اُس نے بھی بچپن سے ہی ماں کے ساتھ کھیتوں میں کام کرنا شروع کر دیا تھا، یہ بے چاری باپ کو کبھی نہ دیکھ پائی تھی۔ وہ گود میں ہی تھی کہ اُس کا باپ نمونیا کا شکار ہو کر چل بسا تھا۔

جب بھاگ بھری کی ماں کپاس کے گالے چنتی تھی تو وہ بھی اپنے ننھے ننھے پاؤں پر اُچک کر روئی کے گالوں کو توڑنا چاہتی تھی پر کپاس کے پودے اس کے جسم سے کہیں زیادہ بلند تھے۔ وقت کے دھارے نے اس کا قد تیزی سے بڑھا دیا تھا۔ اب وہ تیرہ برس کی ہوگئی تھی پر دیکھنے میں اپنی عمر سے بڑی لگتی تھی۔ وڈیرے کے چھوٹے بھائی جعفر شاہ کی آنکھیں ہر وقت اس پر ٹکی رہتی تھیں۔ ایک روز وہ اصطبل میں گھوڑوں کی لید کو ہاتھ گاڑی میں بھر رہی تھی کہ وڈیرے نے اُسے ایک درندے کی طرح جھنجھوڑ کر اپنی ہوس مٹا ڈالی۔ یوں تو وہ اچھوت تھی اس کو چھونا منع تھا لیکن کچھ دیر کے لئے وہ اچھوت نہ رہی تھی۔ چاہے کچھ لمحوں کے لئے ہی سہی، لیکن اُس کی ذات وڈیرے کی ذات کے برابر آ ہی گئی تھی۔ وہ روتی پیٹتی اپنی کٹیا میں آئی اور ماں کی آغوش میں سسک سسک کر اپنے درد کا مداوا ڈھونڈنے لگی۔ کچھ ماہ میں اس کی ماں کو یقین ہو گیا کہ اس کی پھول سی بچی پیٹ سے ہو چکی ہے۔ سہمی ہوئی ماں فریاد لے کر وڈیرے کے پاس گئی۔

''سائیں! میری بیٹی کے ساتھ چھوٹے سائیں نے ظلم کیا ہے، ہم کہیں کے نہیں رہے'' بھاگ بھری کی ماں نے چادر وڈیرے کے پاؤں میں رکھ کر فریاد کی۔

''تم لوگوں کی ذات کو میں اچھی طرح جانتا ہوں''۔ اِدھر اُدھر منہ کالا کراتی پھرتی ہو اور الزام ہم شریفوں پر رکھتی ہو! وڈیرے نے اپنی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کہا۔

''سائیں! آپ کے سوا ہمارا سہارا کون ہے''؟

ماں نے وڈیرے کے قدموں میں بیٹھ کر کہا۔

''دیکھ! یہ الزام اگر دوبارہ تیری زبان پر آیا تو تیری زبان کو نکلوا کر اپنے کتوں کے آگے ڈلوا دوں گا''۔

اس نے گرجدار آواز میں کہا۔

ماں کے حلق سے خوف کے مارے آواز نکلنا بند ہو گئی۔

''چل! کھڑی ہو اور گھر جا! میں کچھ کرتا ہوں''۔ وڈیرے نے اسے پاؤں کی ٹھوکر سے دھکیلتے ہوئے کہا۔

وہ ایک آس دل میں لیے اپنی کٹیا کی طرف چل دی۔

اگلے ہی روز وڈیرے نے ایک اچھوت مزدور سے جو بھاگ بھری کے باپ سے بھی بڑا تھا اس کے پھیرے پھروا دیے۔

ان اچھوت مزدوروں کی لغت میں ''نہ'' کے لفظ کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ طاقتوروں کا حکم بجالانا ہی ان کا دھرم تھا''۔

البرٹ نے یہاں تک کہانی سنانے کے بعد اپنے الیکٹرونک ریڈر سے سارنگی کی ایک دُھن چھیڑ دی، جس سے فضا اور بھی زیادہ افسردہ ہوگئی۔

پھر آگے کیا ہوا؟۔

فِلپ اور کیتھرین نے ہم آواز ہو کر کہا۔

کیتھرین البرٹ کی گرل فرینڈ تھی یہ دونوں پچھلے ایک سال سے ایک ساتھ رہ رہے تھے۔ وہ قبل مسیح کے ہندوستانی سماج پر تحقیق کر رہی تھی۔

البرٹ نے داستان دوبارہ سنانا شروع کی:

''کچھ ماہ بعد بھاگ بھری نے ساون کے مہینے میں رِم جھم برسات کے دوران ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اِس بچے کے نقوش اور رنگ وروپ کہیں سے بھی دراوڑی نسل جیسے نہیں تھے۔ اس کا رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا اور ناک ستواں تھی۔ بھاگ بھری نے اس کا نام ساون رکھا۔ وقت سے پہلے پیدا ہونے کی وجہ سے وہ بہت کمزور تھا۔ بھاگ بھری کی ماں کو یقین تھا کہ وہ بچ نہیں پائے گا لیکن کمزور سا ساون بہت سخت جان نکلا۔ اچھوت مزدوروں کی برادری میں زمیندار کے لئے مفت میں کام کرنے کے لئے ایک اور بچے کا اضافہ ہوگیا تھا''۔

''کیا ان بچوں کے مزدوری کرنے پر کوئی پابندی نہیں تھی؟ کیا بچوں کو لازمی بنیادی تعلیم کے لئے اسکول بھیجنا لازمی نہیں تھا''؟

ایک طالب علم سے سوال کیے بِنا نہیں رہا گیا۔

ہاں! وہاں قانون تو ہوتے تھے پر ان کا نفاذ نہیں ہوتا تھا۔

''اگر قانون کو نافذ ہی نہیں کرنا ہو تو ان کو اُسے بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے''؟

فِلپ بھی بیچ میں بول پڑا:

''شاید دُنیا کو یہ دکھانے کے لئے کہ یہ ایک مہذب ملک ہے یا پھر اس لئے کہ بعض دفعہ بیرونی امداد قانون سازی سے مشروط ہوتی تھی''۔

البرٹ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

سوزن نے پوچھا:

''کیا اس نئے پیدا ہونے والے ساون کی زندگی بھی اس کی ماں کی طرح تھی یعنی جدید دور کے غلاموں جیسی''؟

البرٹ نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''میرے خیال میں اگر آپ سب داستان کو مزید سنیں تو آپ سب کو اور مجھے بھی پتہ چل جائے گا کہ ساون کی زندگی کیسی تھی''؟

یہ کہہ کر البرٹ نے داستان سنانا شروع کر دی:

''جیسے کہ، پرانی لوک کہانیوں میں شہزادی کی جان طوطے میں ہوتی تھی، ویسے ہی بھاگ بھری کی جان ساون میں تھی۔ وہ اس ننھی سی جان کے آغوش میں آنے سے اپنا ہر دکھ بھول گئی تھی۔ پر اُس دکھ کا وہ کیا کرتی جو اُسے اپنے آدمی کے ہاتھوں روز جھیلنا پڑتا تھا۔ اس کا آدمی گھر آ کر روز کسی نہ کسی بہانے اس کو مارتا تھا۔ وہ اس کی مار کو خاموشی سے سہہ لیتی تھی، اُس کی ماں نے اِس کو سکھایا تھا کہ آدمی عورت کے لئے بھگوان سمان ہوتا ہے''۔

ایک روز اس کا آدمی حسبِ معمول اِس کو مار رہا تھا کہ اُس کو کھانسی کا دورہ پڑا اور اس کے پھیپھڑے شدید کھانسی کو برداشت نہ کر سکے اور وہ وہیں دم توڑ گیا۔

بھاگ بھری کی آنکھ نے اپنے آدمی کی موت پر کوئی آنسو نہیں بہایا۔

اُس کے دن رات ایسے ہی گزرتے رہے۔ وہ صبح صبح اصطبل کی صفائی کرتی پھر دوسرے مویشیوں کے باڑے کی صفائی کا کام اور پھر دن بھر کھیتوں میں مزدوری۔

ساون اب بڑا ہوتا جا رہا تھا اس کا زیادہ وقت وڈیرے کے پالتو جانوروں کے ساتھ گزرتا تھا۔ وہ جانوروں سے اور جانور اس سے بہت مانوس تھے۔ جلد ہی اُس نے جانوروں کو چرانے کے لئے جنگل لے جانا شروع کر دیا۔ لال گائے نے جو بچھیا دی تھی وہ تو اس کو بہت ہی پسند تھی وہ بھی ساون کے پیچھے پیچھے بھاگتی اٹھکیلیاں کرتی پھرتی تھی۔ جانوروں کے ساتھ اس کا وقت بہت اچھا گزرتا تھا لیکن وڈیرے اور اُن کی اولادیں اُس سے ہمیشہ حقارت سے اور اکثر ٹھوکریں مار کر بات کرتے تھے۔ اُس کو اس بات کا ادراک تھا کہ وہ نیچ ذات ہے، قابل نفرت ہے، لیکن جانور اُس پر ہمیشہ محبت سے اپنی زبان پھیرتے تھے۔ غلاموں جیسی زندگی گزارتے گزارتے اب ساون دس برس کا ہو چکا تھا اُس نے جنگلی درختوں سے شہد اکھٹا کرنے کا ہنر سیکھ لیا تھا۔ وہ شہد اکھٹا کر کے اپنی ماں کو لا کر دیتا تھا۔ وہ اس کو فروخت کر کے کچھ پیسے کما لیتی تھی۔ وڈیرے سے تو ان کو صرف سال میں ایک دفعہ اناج اور کپڑے کا ایک جوڑا ہی ملتا تھا۔ شہد بیچنے سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ بھی پچھلے دو سالوں سے بند ہو گئی تھی۔ جب سے فصل پر نئی دوا کا چھڑکاؤ شروع ہوا تھا، جنگل میں سے شہد کی مکھیاں بھی بنجاروں کی طرح کسی اور جگہ کوچ کر گئی تھیں۔

وقت کا پہیہ بہت تیزی سے گردش کر رہا تھا اب ساون کو چودھواں برس لگ گیا تھا۔ اس کا چودھواں برس لگنا بھاگ بھری پر، بہت بھاری تھا۔ وہ اُس سے بات بات پر لڑنے لگا تھا۔ اُس کی آواز بھاری ہو گئی تھی جس کے آگے اُس کی ماں کا نرم گفتار لہجہ دب کے رہ جاتا تھا۔ پڑوسیوں کی کٹیا میں فلمیں دیکھ کر اُس پر شہر دیکھنے کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔

ایک روز اس نے ماں سے، بہت خوشامدی لہجے میں کہا:

''اماں! بس اک بار مجھے شہر دکھا دو، میں پھر دوبارہ ضد نہیں کروں گا''۔

''تجھ کو میں نے کتنی بار سمجھایا ہے کہ ہم لوگ وڈیرے کا قرضہ اتارے بنا گاؤں سے باہر نہیں جا سکتے'' بھاگ بھری نے بیٹے کو پیار سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سمجھایا۔

''قرضہ پورا ہونے تک گاؤں سے نہیں نکل سکتے'' ساون نے وڈیرے کی نقل اتارتے ہوئے ماں

کا جملہ دہرایا۔

''ہاں! میں تجھ کو کتنی بار یہ بات بتا چکی ہوں'' ماں نے دوبارہ اپنی بات دہرائی۔

''میں نے تو وڈیرے سے کبھی بھی کوئی قرضہ نہیں لیا!

ایک پیسے کا بھی قرضہ'' ساون نے جواب طلب نظروں سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''پتر! قرضہ تو میں نے بھی کبھی نہیں لیا تھا، قرضہ تو میرے باپ نے لیا تھا، اپنا بیل خریدنے کو۔ وہ خود تو مر گیا لیکن قرض ہمارے سر چڑھ گیا'' بھاگ بھری نے یہ بات اپنے پیر کو زمین پر پٹختے ہوئے کہی، ساون خاموش کھڑا رہا۔

''یوں سمجھ لے کہ میں اپنے باپ کا قرضہ چکا رہی ہوں اور تو اپنی ماں کا'' اُس نے ساون کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

وہ بدستور خاموش کھڑا رہا، یہ اُس کے ضد کرنے کا انداز تھا۔

''تو ان باتوں کو چھوڑ، چل! آ! روٹی کھا لے'' یہ کہہ کر وہ ساون کے لئے مٹی کی ہانڈی سے ساگ نکال کر باسی روٹی پر رکھنے لگی۔ ابھی وہ روٹی پر ساگ رکھنے بھی نہ پائی تھی کہ باہر سے وڈیرے کے آدمی کی آواز آئی جو اُسے پکار رہا تھا۔

بھاگ بھری بیٹے کو کھانا دینے میں مصروف تھی اس لئے اس کو جواب دینے میں ذرا دیر ہو گئی تھی۔ وڈیرے کے آدمی سے صبر نہ ہو سکا وہ کٹیا کے اندر گھس آیا۔

''کیا میں تیرا نوکر ہوں جو باہر کھڑا ہو کر تیرا انتظار کروں''؟

وڈیرے کے آدمی نے دھاڑتے ہوئے کہا۔

بھاگ بھری گھبرا کر جلدی سے باہر کو نکلی۔ وڈیرے کے آدمی نے اپنی لاٹھی سے اسے دروازے کی طرف دھکیلا۔۔۔۔

وہ شاید اس کم ذات کو ہاتھ لگا کر اپنا ہاتھ پلید نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ساون نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔۔۔ وڈیرے کے آدمی کو بالوں سے کھینچ کر گرا دیا اور اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ بھاگ بھری نے اسے دھکیل کر اس کے سینے پر سے اُتارا۔ وڈیرے کے آدمی نے پلٹ کر ساون کو اپنی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ وہ اُس

سے مار کھا کر ادھ مُوا ہو کر زمین پر لیٹ گیا۔ اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ بھاگ بھری بے چاری ہانپتی کانپتی ہاتھ جوڑتے ہوئے وڈیرے کے آدمی کے پیچھے چل دی۔

''سائیں! بچہ ہے غلطی ہوئی ہے اسے معاف کردو'' وہ وڈیرے کے آدمی سے اُس کے پیچھے چلتے چلتے فریاد بھی کرتی جارہی تھی۔

''بکواس بند کر! اور حویلی کے باہر گند کا کنواں اٹ گیا ہے اسے جا کر خالی کر اور وہاں سے گند اٹھا کر کھیتوں میں پھیلا۔

چل!۔ چل!۔ چل!''

یہ کہہ کر وہ اُطاق کی طرف چلا گیا۔ بھاگ بھری تیز تیز قدم اٹھاتی حویلی کے پچھواڑے کی طرف چل دی۔

(۳)

اگلے ہی روز دن ڈھلے وڈیرے کا آدمی بھاگ بھری کی کٹیا پر آدھمکا۔ دونوں ماں بیٹے ابھی کھیتوں سے واپس ہی لوٹے تھے۔

''بھاگ بھری!... ساون کو بڑے سائیں نے اطاق پر بلایا ہے''۔

وڈیرے کے آدمی نے ایک زوردار آواز میں کٹیا کے باہر سے ہی حکم جاری کر دیا۔ ساون اس کی آواز سن کر باہر کو نکلا تو بھاگ بھری بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ وہ اس کو اُطاق پر اکیلے نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔ اپنے اوپر ہونے والے تشدد کے بعد سے ساون وڈیرے اور اس کے آدمیوں کو دل ہی دل میں گالیاں بکے جا رہا تھا۔ وڈیرے کا آدمی آگے چل رہا تھا۔ آج اس نے لاٹھی کے بجائے کندھے پر ایک جدید رائفل ٹانگ رکھی تھی۔

بھاگ بھری کی کٹیا اُطاق سے زیادہ دور نہیں تھی، وہ لوگ کچھ ہی دیر میں وہاں پہنچ گئے۔ اطاق پر گاؤں کے اہم لوگ سرکنڈے سے بنی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے جبکہ ایک اونچی سی چوبی کرسی پر بڑا وڈیرہ حیدر شاہ اوور اس کی ساتھ والی کرسی پر چھوٹا وڈیرہ جعفر شاہ براجمان تھا۔

ان دونوں وڈیروں نے کلف لگے سفید بے داغ کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ بڑے وڈیرے نے سر پر کالے رنگ کی بڑی سی پگڑی پہنی ہوئی تھی جو کہ قبیلے کا سردار ہونے کی نشانی تھی۔ چھوٹے وڈیرے نے ایک قیمتی محراب دار ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ بھاگ بھری وہاں آ کر ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے ساون کو کہنی مار کر اسے بھی ہاتھ جوڑنے کو کہا۔ چھوٹے وڈیرے جعفر شاہ نے بھاگ بھری کو دیکھ کر اپنی مونچھوں کا بل دے کر اسے اپنی مردانگی اور حاکمیت کا احساس دلایا۔ بھاگ بھری نے اپنے اور وڈیرے جعفر شاہ کی ناجائز اولاد ،ساون کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر شاید اُسے اس کے ظلم کا احساس دلانا چاہا۔ ساون جیسے جیسے بڑا

ہوتا جا رہا تھا اس میں چھوٹے وڈیرے کی مشابہت نمایاں ہوتے جا رہی تھی۔

''نمک حرام! اگر تو حلال زادہ ہوتا تو میرے آدمی کے اوپر ہاتھ اٹھانے کی کبھی بھی ہمت نہیں کرتا۔ تو نے میرے آدمی پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت کیسے کی''؟۔

وڈیرے نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ بھاگ بھری کانپ کر رہ گئی۔

ساون سر جھکائے خاموشی سے کھڑا رہا۔ اس نے اپنی ماں سے بچپن سے ایک ہی سبق سیکھا تھا کہ وڈیروں اور ان کے بچوں کے سامنے کبھی بھی سر نہ اٹھانا اور نہ کبھی ان سے آنکھیں ملانا۔

وڈیرے نے ساون کو خاموش دیکھ کر ایک بار پھر گرج دار آواز میں اپنا سوال دہرایا۔

''سائیں! اس کو معافی دیں۔۔ میں اس کی طرف سے معافی مانگتی ہوں... یہ ابھی ناسمجھ ہے''۔ بھاگ بھری اپنی پیوند لگی قمیص کا دامن پھیلاتی ہوئی وڈیرے سے مزید فریاد کرنے لگی۔

ساون اب بھی خاموش کھڑا رہا اور ٹس سے مس نہ ہوا۔

''تو زبان کھول حرام زادے''!

وڈیرے کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔ ساون بدستور زمین میں نظریں گاڑے خاموش کھڑا تھا۔

شاید ایسا وڈیرے کی زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا کہ کوئی نوکر اس کا حکم بجالانے سے انکار کر رہا تھا۔ یہ انکار کسی آزاد انسان کی طرف سے نہیں بلکہ ایک اچھوت غلام ماں کے غلام اور حرام زادے بیٹے کی طرف سے تھا۔ اب وڈیرے کا صبر جواب دے چکا تھا۔ وہ کرسی سے اٹھا اور اس نے دھان پان سے ساون کو اپنی ٹھوکروں سے مارنا شروع کر دیا۔

ساون زمین پر لیٹا بغیر اُف کیے وڈیرے کی ٹھوکریں سہتا رہا یہاں تک کہ وڈیرہ اس کو مارتے مارتے ہانپ کر واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔

آج ساون کو وڈیرے کا حکم نہ مان کر خوشی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو اس کے ان لحیم شحیم موٹی موٹی مونچھوں اور ڈراؤنی داڑھیوں والے وڈیرے کے مسلح محافظوں سے زیادہ طاقتور سمجھ رہا تھا۔

یہ محافظ کاندھے پر ہتھیار لادے وڈیرے کی جھڑکیاں سنتے تھے۔

''اگر میرے ہاتھ میں یہ ہتھیار ہوتے تو میں وڈیرے کو اس کے خاندان سمیت بھون ڈالتا''۔ زمین

پر گھٹنے پیٹ میں گھسائے لیٹے ساون نے دل ہی دل میں سوچا۔

''دور کر دو! اس حرام زادے پلید نسل کو! اس کو مویشیوں کے باڑے میں جانوروں کے ساتھ باندھ دو۔ اس خبیث کو تین دن تک کھانے پینے کے بغیر باندھ کر رکھنا! تا کہ اس کے کان کھل جائیں اور حکم عدولی اس کے خون سے نکل جائے''

وڈیرے نے کھڑے ہو کر یہ حکم اپنے آدمیوں کو سنایا اور اجرک کو غصے میں اپنے کندھے پر ڈال کر حویلی کی طرف چل پڑا۔

بھاگ بھری چھوٹے وڈیرے کے قدموں میں بیٹھ کر اُس سے اپنے بیٹے کی جان بخشی کی بھیک مانگنے لگی۔ اُس نے بھاگ بھری کو ٹھوکر سے پیچھے ہٹایا اور اٹھ کر بڑے وڈیرے کے پیچھے حویلی کی طرف چل پڑا۔ وڈیرے کے مسلح آدمی ادھ موئے ساون کو اٹھا کر جانوروں کے باڑے کی طرف گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ اس کے کانوں میں اس کی ماں کے سسکنے کی آوازیں اور گاؤں کے معزز لوگوں کی وڈیرے کے فیصلے کے بارے میں تحسین کی سرگوشیاں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

اسے جانوروں کے ساتھ باندھے جانے کے فیصلے پر کوئی غم نہیں تھا۔ وہی تو اس کے سچے سجن تھے، وہ اُن کو روز جنگل میں چرانے لے جاتا تھا، ان کو نہر میں نہلاتا تھا۔ اور ان سے دل کی باتیں کرتا تھا۔ اس کو لالی سے تو بے حد لگاؤ تھا۔ کچھ سال پہلے وہ ایک چھوٹی سی بچھیا تھی اور اب وہ دو بچھڑوں کو جنم دے چکی تھی۔ اس کے لال رنگ کی وجہ سے ساون نے اس کا نام لالی رکھا تھا۔ کچھ ہی دیر میں جانوروں کا باڑہ آ گیا تھا پر اُس کی ہمت اب بالکل جواب دے چکی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ وڈیرے کے آدمی اسے گھسیٹتے ہوئے باڑے کے اندر لے آئے۔

انہوں نے اس کے ہاتھ کمر کے پیچھے موڑ کر مضبوطی سے ایک لمبی سی رسی سے باندھ دیے اور رسی کے دوسرے سرے کو اس کی ٹانگوں سے لپیٹتے ہوئے جانوروں کے کھونٹے سے باندھ دیا۔ نہ جانے کتنی دیر کے بعد اس کو ہوش آیا تو جانوروں کے گوبر اور پیشاب کی مانوس مہک کی شدت نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے۔ اُسے ایک ایک کر کے سارے واقعات یاد آنا شروع ہو گئے۔ پسلیوں پر وڈیرے کی ٹھوکروں کی وجہ سے وہ کروٹ لینے پر قادر نہیں تھا۔ اسے تین دن تک بغیر کھائے پیئے جانوروں کے کھونٹے سے ہی بندھا

رہتا تھا۔ کھانے کا سوچتے ہی اسے بھوک لگنے لگی۔ ویسے بھی اسے بھوک بہت لگتی تھی۔ دن میں کئی بار ماں سے کھانا مانگتا تھا۔ یہ سب کچھ سوچتے سوچتے اس پر نقاہت طاری ہونے لگی۔ اور وہ دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔

نہ جانے کتنی دیر کے بعد اسے اپنے چہرے پر ایک کھردری اور گیلی زبان کے پھرنے کا احساس ہوا۔

یہ زبان اس کے رخساروں، آنکھوں اور ہونٹوں کو گرمی اور نمی پہنچا رہی تھی۔ زبان کے اس مساج سے اس کو مکمل طور پر ہوش آ گیا۔ اس نے نیم اُجالے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ اس کی لالی تھی جو اسے بالکل ایسے ہی چاٹ رہی تھی کہ جیسے وہ اپنی بچھیا کو چاٹتی تھی۔ ساون کے چہرے کو چاٹتے چاٹتے لالی اس کے برابر میں لیٹ گئی۔ ساون اپنی چہیتی گائے کا اشارہ سمجھ گیا تھا وہ ہمت کر کے گھسٹتا گھسٹتا اپنے منہ کو لالی کے تھنوں کے قریب لے آیا۔ کچھ ہی دیر کی جدوجہد کے بعد گرم گرم تازہ دودھ زندگی کا سندیسہ بن کر اس کے جسم میں منتقل ہونا شروع ہو گیا۔ لالی کے تھنوں سے دودھ پینا ساون کے لئے کچھ نیا نہیں تھا وہ جنگل میں اکثر لالی کے دودھ سے اپنی بھوک کو مٹایا کرتا تھا۔ پیٹ بھر کے دودھ پینے سے اس کو پیشاب آ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ اس کے پاس اسی حالت میں فارغ ہونے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ وڈیرے کے ملازم جب بھی جانوروں کو باہر لے جانے یا ان کا دودھ دوہنے آتے تو اس کی ٹھوکروں سے تواضع کرتے۔ بس دل ہی دل میں وہ ایک ہی آرزو کرتا تھا کہ وہ لوگ لالی کو اس کے برابر ہی باندھا کریں۔ چار دن اور تین راتیں اس نے جانوروں کے باڑے میں جانوروں کی طرح رہ کر گزار دیں۔ آخرکار وڈیرے کے آدمیوں نے آ کر اس کے ہاتھ پیر کھولے، اُس کے ہاتھ چار دن تک کمر کے پیچھے بندھے رہنے سے شل ہو گئے تھے۔ دو آدمیوں نے اس کو بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ وڈیرے کے آدمیوں نے ناک پر کپڑا رکھ لیا تھا کیوں کہ انہیں ساون کے وجود سے سخت بدبو آ رہی تھی۔ کچھ دیر میں ساون کا دوران خون معمول پر آ گیا۔

''ہل! بابا! ہل!'' وڈیرے کے آدمی نے ساون کو آگے کی طرف ایسے ہانکا جیسا کہ وہ کوئی جانور ہو۔

ساون نے باہر کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ اس کی چال میں کوئی نقاہت نہ تھی۔

''وڈیرے نے جس کو بھی یہ سزا دی وہ کبھی اپنی ٹانگوں پر چل کر نہیں گیا۔ اس نیچ عورت کی اولاد کو دیکھو کیسے مزے سے چل رہا ہے''۔ وڈیرے کے ایک بندوق بردار آدمی نے دوسرے آدمی سے کہا:

''ہاں سائیں! یہ چھوکرا دِکھنے میں دھان پان سا ہے پر ماننا پڑے گا اس میں جان بہت ہے'' دوسرے ساتھی نے پہلے والے کی ہاں میں ملاتے ہوئے کہا۔ ان کو کیا معلوم تھا کہ لالی کے صحت بخش دودھ نے ساون کو کمزور نہ ہونے دیا تھا۔ اگر ان کو یہ معلوم ہو جاتا کہ ساون نیچ ذات نے لالی کا دودھ پیا ہے جو کہ وڈیرے کی خاص گائے تھی تو وڈیرہ گائے اور ساون دونوں کو ہی گولی مار دیتا۔

وڈیرے کا ملازم ساون کو کٹیا کے دروازے سے اندر دھکیل کر واپس چلا گیا۔

(۴)

وڈیرے کی سزا نے ساون کو مزید چڑچڑا اور سرکش بنا دیا تھا۔ بھاگ بھری اس کے تلخ مزاج سے بہت پریشان تھی۔ اُس کی کوشش ہوتی تھی کہ ساون وڈیرے کے آدمیوں کے سامنے نہ آئے۔ یہ موسم اچھا تھا کیوں کہ کپاس کی چنائی شروع ہو چکی تھی۔ وہ اپنے لخت جگر کو سارا دن چنائی کے کام میں اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ کام بہت زیادہ تھا، وڈیرے کی زمینوں کی حد بھاگ بھری کو کبھی سمجھ نہیں آتی تھی، تاحد نظر اس کی ہی زمینیں تھیں۔ وڈیرے نے چنائی کے موسم کے لئے دوسرے علاقوں سے بھی مزدور منگوائے ہوئے تھے۔ اُن میں زیادہ تر بچے اور عورتیں تھیں کیوں کہ بچوں اور عورتوں کو کم مزدوری دینا پڑتی تھی۔ ہفتے بھر چنائی کے بعد ساون کی ڈیوٹی مردوں کے ساتھ کپاس کے بوروں کو ٹرک میں لادنے پر لگ گئی تھی۔

دن بھر میں دو ٹرک کپاس سے بھر چکے تھے۔ ان ٹرکوں کو رات بھر کا سفر کر کے کپاس کو جننگ فیکٹری تک پہنچانا تھا۔ ٹرکس کے ڈرائیورز اور مزدور کپاس لدوانے کے بعد شام کا کھانا کھانے اطاق پر چلے گئے تھے۔ بھاگ بھری دو دفعہ ساون کو کھانے کے لئے بلا چکی تھی۔

ساون نے ماں سے کہا:

''اماں تو روٹی کھالے مجھے بھوک لے گی تو خود کھالوں گا'' اس کے دماغ میں اٹھنے والے خیالات کی ہلچل نے اس کی بھوک اڑا دی تھی۔ اس کو یقین تھا کہ اگر وہ کپاس کے بوروں میں چھپ جائے تو وہ شہر پہنچ جائے گا۔ وہ یہ سوچتے سوچتے ٹرکوں کے آس ہی پاس منڈلاتا رہا۔ اس نے ایک ٹرک میں گھسنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

اس نے دل ہی دل میں موٹی سی گالی دے کر کہا:

''کتنا ٹھونس ٹھونس کر ان بوروں کو ٹرک میں بھرا ہے کہ ذرہ برابر بھی جگہ نہیں''۔

اس نے ہمت نہیں ہاری، ایک بورے میں اس کو ایک بڑا سا سوراخ نظر آیا۔ ساون نے بورے میں سے کپاس نکالنا شروع کر دی۔ وہ بورے میں سے نکالی ہوئی کپاس جمع کر کے کھیت میں ڈال آیا تا کہ کسی کو شک نہ ہو۔ اس نے بورے میں اپنے دبلے پتلے جسم کے لئے کافی جگہ بنالی تھی۔ وہ دم سادھ کر بورے میں گھس کر بیٹھ گیا۔ اسے اپنا وجود وڈیرے کے کُتے کالُو کی طرح لگ رہا تھا جو اکثر کپاس کے ڈھیر میں گھس کر بیٹھ جاتا تھا۔

موٹر اسٹارٹ ہونے کی زوردار آواز سے وہ خیالات کی وادی سے نکل آیا۔ ٹرک نے آہستہ آہستہ گاؤں کی کچی سڑک پر رینگنا شروع کر دیا تھا، کپاس کے بورے میں دبک کر بیٹھنے کی وجہ سے اس کو جھٹکے تو نہیں لگ رہے تھے پر اس کی کمر پسینے سے شرابور ہو چکی تھی۔ کمر پر بہتے پسینے نے اس کو کچھ ٹھنڈک پہنچائی تو خنکی کے احساس سے اس کی آنکھ لگ گئی۔ کچھ گھنٹوں کے بعد اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کو بھوک نے بری طرح ستایا ہوا تھا۔ اسے اپنا معدہ سکڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ویسے بھی اس نے شام کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ اسے ماں کا کہنا یاد آ رہا تھا جو وہ اسے اس کے بار بار کھانا مانگنے پر کہتی تھی:

''ہم غریبوں کو بھگوان جتنا کم دیتا ہے ہم کو بھوک اتنی ہی زیادہ لگتی ہے''۔

بھوک اور ماں میں نہ جانے کیا رشتہ ہے اسے بھوک کی شدت میں ہمیشہ ماں ہی یاد آتی تھی۔ یہ سب سوچتے سوچتے اس کی آنکھ دوبارہ لگ گئی۔ اس بار گاڑیوں کے کان پھاڑنے والے ہارنز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ ٹرک رُکا ہوا تھا اور کچھ دور سے لوگوں کے زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بورے میں بیٹھے بیٹھے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس لئے وہ بورے سے باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی گرمیوں کی راتوں کا گرم جھونکا اس کے جسم سے ٹکرایا۔ اس کے پسینے سے شرابور جسم کو یہ گرم ہوا بادِ نسیم کی طرح لگی۔ وہ بوروں پر احتیاط سے رینگتا ہوا سب سے اوپر والے بورے تک جا پہنچا تا کہ اطراف کا جائزہ لے سکے۔ ٹرک سڑک کے کنارے بنے ہوٹل پر رُکا ہوا تھا۔ وہاں اور بھی بہت سے ٹرک، بسیں اور کاریں موجود تھیں۔ ہوٹل کے باہر بہت سی چارپائیاں جابجا بچھی ہوئی تھیں۔ ان چارپائیوں پر لوگ آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے۔ ان کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو ٹرک تک آ رہی تھی۔ اس خوشبو نے ساون کی بھوک کو ناقابل برداشت کر دیا تھا۔ جب کبھی وڈیرہ اپنے اُطاق پر مہمانوں کی دعوت کرتا تھا تو وہاں سے ایسی ہی خوشبو آتی تھی۔ وہ

اکثر اُطاق کے پیچھے جا کر اس کھانے کی خوشبو سونگھنے کے لئے کھڑا ہو جاتا تھا۔

اُس نے سوچا کہ: ''اس کی ماں کے ہاتھ کے پکائے ہوئے کھانوں میں ایسی خوشبو کیوں نہیں آتی تھی''؟

اُس کو اپنے پکڑے جانے کا خوف تھا اور یہ خوف اس کی سوچ پر غالب آ گیا۔ اُس نے چاروں طرف ہوشیاری سے نظر دوڑائی۔ ٹرک کے پاس کوئی نہیں تھا اور یوں بھی ٹرک کے ارگرد کافی اندھیرا تھا۔ وہ ایک چھپکلی کی طرح رینگتا ہوا ٹرک سے اتر گیا اسے نہ تو اپنی منزل کا پتہ تھا اور نہ ہی اسے سمت کا کوئی اندازہ تھا۔ کہیں دور سے اذان کی آواز آنا شروع ہوئی۔ وہ اذان کی آواز کی سمت چل پڑا۔ کچھ ہی دور چلنے کے بعد اُسے روشنیاں نظر آنے لگیں۔ اُس نے اپنے قدموں کی رفتار بڑھا دی۔ وہ بہت دیر تک خالی پیٹ چل رہا تھا، اب اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ وہ شہر سے باہر نکلنے والی سڑک پر نڈھال ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے منہ میں پیاس سے کانٹے پڑے ہوئے تھے۔

ٹریکٹر، ٹرالیاں، بیل گاڑیاں شہر سے باہر کی طرف جا رہی تھیں، اُجالا پھیلنے لگا تھا۔

''راتیں اتنی لمبی کیوں ہوتی ہیں؟!'' ساون نے پھیلتے ہوئے اجالے کو دیکھ کر یہ سوچا۔

اس سے پہلے کہ اس کا خیال کسی اور طرف بھٹکتا اسے ایک چھوٹے سے ٹرک پر تربوز لدے ہوئے نظر آئے، وہ بے اختیار ٹرک کی طرف بڑھ گیا، ابھی اس کا ہاتھ تربوز کی طرف بڑھا ہی تھا کہ کسی نے چور چور کا شور مچا دیا۔ اس نے اپنی ساری طاقت جمع کر کے ایک طرف کو دوڑ لگا دی۔ بھاگتے بھاگتے وہ ایک جگہ پر آ کر رک گیا، وہ شہر کے مرکزی بازار میں پہنچ چکا تھا، بازار کی تمام دکانیں کھل چکی تھیں، قریب ہی ایک جگہ بہت سے لوگوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ ساون بھی اسی طرف بڑھ گیا، وہ سوچ رہا تھا کہ وہاں کوئی تماشہ ہو رہا ہے۔ وہ لوگوں کے بیچ میں سے ہوتا ہوا آگے جا کر کھڑا ہو گیا۔ تماش بینوں کے درمیان ایک چادر بچھی ہوئی تھی جس پر مختلف دوائیں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ ایک ادھیڑ عمر شخص اپنے زورِ بیان کے ذریعے مردانہ کمزوری کو دور کرنے کی دوائیں بیچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ساون کو وہاں دیکھ کر ایک آدمی نے اسے باہر دھکیلتے ہوئے کہا:

''تو یہاں کیا کر رہا ہے؟ یہ بچوں کے کام کی چیزیں نہیں!۔ چل! بھاگ یہاں سے''!

ساون وہاں سے چل پڑا، کچھ دور چل کر اسے ایک کھانے کا ڈھابہ نظر آیا۔ وہاں میزوں پر گلاس الٹے رکھے ہوئے تھے اور جگ پانی سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر اس کی پیاس شدت اختیار کر گئی، وہ بے اختیار ٹیبل کی طرف بڑھ گیا، ابھی اس نے گلاس ہاتھ میں اٹھایا ہی تھا کہ ڈھابے کے مالک نے اُسے دور سے چپل پھینک کر مارنے کے ساتھ ایک موٹی سی گالی بک کر وہاں سے بھاگنے کو کہا، شاید ساون اپنے حلیے سے کوئی اچھوت یا کوئی بھکاری لگ رہا تھا۔ وہ منہ اٹھا کر ایک طرف کو بھاگ لیا۔ بھاگتے بھاگتے اس کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھانے لگا۔ وہ ایک لمبی اور اونچی سی دیوار کے سائے میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

(۵)

کچھ نوجوان باریش لوگوں نے ایک بڑا سا فولادی دروازہ کھولا۔ ایک ڈبل کیبن گاڑی اس دروازے سے باہر آئی، اس گاڑی کے کھلے ہوئے حصے میں چار افراد خودکار ہتھیار تانے چوکس بیٹھے تھے۔ اس گاڑی کے پیچھے ایک سیاہ رنگ کی لینڈ کروزر باہر آئی جس کے شیشوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس لینڈ کروزر کے پیچھے ایک اور ڈبل کیبن گاڑی تھی، اس میں بھی مسلح محافظ سوار تھے۔ لینڈ کروزر کی پچھلی سیٹ پر براجمان ایک خشخشی داڑھی والے آدمی نے دیوار کے ساتھ بے ہوش پڑے ہوئے ساون کو دیکھ کر گاڑی رکوانے کے بعد وہ بہت وقار کے ساتھ نیچے اُترا، اُس کے اترتے ہی دوسری گاڑیوں میں سوار مسلح محافظین نے اُسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ خشخشی داڑھی والے آدمی نے ساون کی گردن پر ہاتھ رکھ کر اس کی شہ رگ میں زندگی کی حرارت محسوس کر کے اسے چار دیواری کے اندر لے جا کر اُس کو ابتدائی امداد فراہم کرنے کی ہدایت کی۔ یہ ہدایت دے کر وہ خود گاڑی میں بیٹھ گیا۔ قافلے کو رکا ہوا دیکھ کر فولادی دروازے سے کچھ اور باریش نوجوان وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے صاف ستھری شلوار قیصیں پہن رکھی تھیں۔ اُن کی شلواروں کے پائنچے ٹخنوں تک چڑھے ہوئے تھے، کچھ کے کندھوں پر چار خانوں والا مفلر پڑا ہوا تھا۔ اِن میں سے بعض نے محراب نما سندھی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ اِن نوجوانوں نے ساون کو اٹھایا اور فولادی دروازے کے اندر لے گئے۔ یہ کئی ایکڑ پر پھیلی ہوئی ایک عظیم الشان مدرسے کی عمارت تھی۔ اس میں ملک کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے طلباء قیام پذیر تھے۔ خشخشی داڑھی اور مضبوط جسم والے شخص قاری سفیان اس مدرسے کے سربراہ تھے۔ انیس سواسی کی دہائی سے اب تک یہ مدرسہ ہزاروں مجاہدین کو افغانستان بھیج چکا تھا۔ مدرسے کے بہت سے اساتذہ بھی جنگِ افغانستان اور جہادِ کشمیر کے غازی تھے۔ قاری صاحب اس وقت ایک بہت اہم مشن میں مصروف تھے۔ انہیں مدرسے کے تربیت یافتہ نوجوان مجاہدین کی ایک بڑی کھیپ افغانستان کے سرحدی علاقوں کی

طرف روانہ کرنی تھی۔

ساون کو باریش نوجوانوں نے ایک چارپائی پر اُسے لٹادیا۔ ایک عمر رسیدہ شخص نے ان نوجوانوں کو چارپائی کے قریب بجلی کا پنکھا نصب کرنے کی تاکید کی۔ ایک نوجوان دوڑ کر اس کا حکم بجالایا۔ بوڑھے آدمی نے نزدیک ہی نصب شدہ برقی واٹر کولر سے ایک گلاس میں پانی لے کر ساون کے منہ پر چھڑکنا شروع کردیا۔ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے اُس کے لیے آبِ حیات ثابت ہوئے۔ ساون نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ اِسی آدمی نے اس کو بیٹھنے کے لیے سہارا دے کر پانی پینے کو دیا۔ ساون نے بھرا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کرڈالا۔

''مجھے بہت بھوک لگی ہے، میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا'' ساون نے اپنے دیہاتی سرائیکی لہجے میں کہا:

''ہاں ہاں! کھانا ضرور ملے گا، یہ لو! تھوڑا پانی اور پی لو!''

اس دفعہ بوڑھے آدمی نے پانی میں کچھ نمک اور شکر گھول کر ساون کو پینے کو دیتے ہوئے کہا۔ اس نے یہ پانی بہت رغبت سے پیا۔ پانی پی کر اس کے جسم میں توانائی بحال ہونا شروع ہوگئی۔ اس دوران بوڑھے آدمی نے ایک نوجوان کو کھانے لانے کو کہا۔ کچھ ہی دیر میں وہ جوان کھانے کی ٹرے لے کر آیا، ایک پلیٹ میں چاول تھے جن پر بکرے کے گوشت کا سالن ڈالا ہوا تھا، ایک پیالے میں دہی بھی موجود تھی۔ کھانا لانے والے نے چپُ چاپ ٹرے اس کے سامنے لاکر رکھ دی تھی کھانے سے ویسی ہی خوشبو آرہی تھی جیسی وڈیرے کے کھانے سے آتی تھی۔ وہ بچپن سے جس کھانے کو چھپ چھپ کر سونگھتا آیا تھا آج وہ پلیٹ بھر اس کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ ساون نے کسی کی طرف نظر اٹھائے بغیر گوشت کے بڑے سے ٹکڑے کو منہ میں ڈالا۔ آج اس نے زندگی میں پہلی بار بکرے کے گوشت کا ذائقہ چکھا تھا۔ اس گوشت کا ذائقہ اور مصالحے کی خوشبو اس کے سارے منہ پھیل گئی، وہ فوراً ہی مٹھی میں چاول بھر کر منہ میں ٹھونس کر جلدی جلدی چبانے لگا۔

''ماں کبھی کبھی چاول پکاتی تھی پر ان کا مزا ایسا نہیں ہوتا تھا''، اس نے کھاتے کھاتے سوچا۔ سب لوگ اس کے اردگرد کھڑے حیرانی سے اسے دیکھ رہے تھے اور وہ بے نیازی سے جلدی جلدی اپنی بھوک مٹا رہا تھا۔ کھانے کے بیچ میں ہی اس کی آنکھیں خُمار سے بند ہونے لگیں۔ وہ خالی پلیٹ گود میں رکھے رکھے ہی

سو گیا۔

مغرب کی اذان سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

''یہ!لو نئے کپڑے اور چپل، سامنے غسل خانے ہیں، تم نہا کر یہ کپڑے پہن لو!۔تم کو قاری صاحب نے بلایا ہے''۔

ایک لمبی داڑھی والے آدمی نے اسے کپڑے تھماتے ہوئے حمام کا رستہ دکھایا اور خود مدرسے میں بنی سرخ اینٹوں اور سنگ مرمر کے میناروں والی مسجد کی طرف نماز پڑھنے چلا گیا۔ساون حمام کی طرف جاتے ہوئے اپنے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔''یہ کتنی عجیب سی عمارت ہے!وڈیرے کی حویلی تو اس عمارت کے آگے کچھ بھی نہیں'' اس نے اپنے دل میں مدرسے کی عمارت کا وڈیرے کی حویلی سے موازنہ کیا۔وہ حمام والی عمارت میں آیا۔ یہاں ایک لائن میں بہت سے حمام بنے ہوئے تھے۔جن میں ٹھنڈا پانی اور صابن موجود تھا۔اس نے جی بھر کے غسل کیا اور رگڑ رگڑ کر میل کو اتارا۔غسل کے بعد وہ اپنے آپ کو بالکل ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہا تھا جیسے کہ ابھی نہر سے نہا کر نکلا ہو۔وہ نئے کپڑے پہن کر چارپائی پر آکر بیٹھ گیا۔نماز ختم ہو چکی تھی، بہت سے نوجوان مسجد سے نکل کر مدرسے کے رہائشی حصوں کی طرف جا رہے تھے۔اسے سامنے سے ایک لمبا آدمی اپنی طرف آتا دکھائی دیا جس کے کندھے پر ایک بندوق لٹک رہی تھی۔

''وڈیرے کے آدمی بھی ایسے ہی ہتھیار کندھوں پر رکھے پھرتے تھے'' اس آدمی کو دیکھ کر اور وڈیرے کے آدمیوں کے بارے میں سوچ کر اسے خوف محسوس ہونے لگا۔اسی دوران وہ لمبا آدمی اُس کے قریب آگیا۔

''چلو!تم کو قاری صاحب نے بلایا ہے''۔اس آدمی نے بہت نرم انداز میں پشتو لہجے میں اِس سے کہا۔

وہ سہما سہما اس آدمی کے ساتھ چل پڑا، کافی دور چل کر اس عمارت کے کونے میں ایک گھر نظر آیا۔اس گھر کے دروازے پر دو آدمی بندوقیں گود میں لیے کرسیوں پر چوکس بیٹھے ہوئے تھے۔دونوں نے بڑھ کر ساون سے مصافحہ کیا۔یہ اُس کے لیے بالکل نئی بات تھی۔اُس سے زندگی میں شاید ہی کسی نے اس عزت دینے والے انداز میں مصافحہ کیا ہو۔مصافحہ کرنے کے بعد انہوں نے ساون کے لیے دروازہ کھولا۔ساون کے ساتھ آنے والے آدمی نے اُس سے اندرونی دروازے کے پاس آکر چپلیں اتارنے کو کہا۔ساون نے

چپلیں اتار دیں۔ اُس کو چپلیں اتار کر بہت ہی سکون ملا، اس نے ساری عمر ننگے پیر ہی گزاری تھی۔ وہ لمبے آدمی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ دیواروں کے ساتھ ہر طرف گاؤ تکئے لگے ہوئے تھے۔ دیوار کے بیچ خشخشی داڑھی اور کسرتی جسم والا ایک آدمی بیٹھا تھا جس نے سر پر سندھی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے تین مختلف رنگوں کے ٹیلی فون رکھے ہوئے تھے۔ یہ وہی قاری سفیان تھے جنہوں نے ساون کو بے ہوشی کی حالت میں دیکھ کر اُس کی مدد کرنے کا حکم دیا تھا۔ انہوں نے ساون کی طرف شفقت بھری نگاہ سے دیکھتے ہوئے بیٹھنے کو کہا۔ وہ سہم کر بیٹھ گیا۔ اس نے ساری زندگی لوگوں کے سامنے کھڑے ہو کر ہی گزاری تھی۔ اس کو اس طرح عزت سے بیٹھنا عجیب لگ رہا تھا۔

''بیٹا! سندھی بولتے ہو یا سرائیکی''؟۔ قاری صاحب نے سرائیکی زبان میں، بہت نرمی سے سوال کیا۔

''سرائیکی'' ساون نے مختصر سا جواب دیا۔

''کیا نام ہے تمہارا''؟ قاری صاحب نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ساون'' اس نے پھر اختصار سے کام لیا۔

''کس گاؤں کے رہنے والے ہو بیٹا؟!'' گوٹھ نور محمد کا۔

یہ جواب دیتے ہوئے ساون کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

''ہندو ہو''؟۔ قاری صاحب نے اپنے شک کو یقین میں بدلنے کے لیے سوال کیا۔

جواب میں ساون نے اثبات میں سر ہلایا۔

''پوجا کے لئے مندر جاتے ہو؟'' قاری صاحب نے سوال کیا۔

''نہیں'' اس نے انکار میں سر کو ہلاتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہیں جاتے ہو؟'' ساون سر جھکائے خاموش رہا۔

''تم کو پتہ ہے کہ ہندو کسے کہتے ہیں''؟ قاری صاحب نے ساون کے دماغ کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔

''معلوم نہیں''.....ماں نے بتایا تھا کہ میں ہندو ہوں''۔

اُس نے بدستور سر جھکائے جواب دیا۔

''کیا تم مسلمان بننا چاہو گے؟'' قاری صاحب نے بلا تکلف اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتے

ہوئے کہا:

''نہ''، ساون کا جواب بہت مختصر تھا۔

''کیوں نہیں''؟۔ قاری صاحب نے ساون کے کورے جواب کی وجہ جاننے کے لئے پوچھا۔

''مسلمان عورتوں اور بچوں کو مارتے ہیں۔ اُن سے مفت میں مزدوری کرواتے ہیں اور گوٹھ سے نہیں نکلنے دیتے''۔ ساون نے ایک سانس میں ساری بات کہہ ڈالی۔ اس کی سادگی اور سچائی نے قاری صاحب کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

''کون مارتا ہے تمہارے گوٹھ میں عورتوں اور بچوں کو''؟۔

قاری صاحب نے تجسس سے پوچھا۔

''وڈیرے اور اس کا بھائی میری ماں کو مارتے تھے۔ اور اس نے مجھے بھی مار کر جانوروں کے ساتھ باندھ دیا تھا'' مجھے تین دن تک کھانا بھی نہیں دیا تھا۔ بس میں اسی لیے گاؤں سے بھاگ آیا۔ اب میں وہاں کبھی واپس نہیں جاؤں گا''۔

اب ساون ذرا کھل گیا تھا۔

''کیا نام ہے تمہارے وڈیرے کا''؟۔ قاری صاحب نے حیرانی سے سوال کیا۔

''وڈیرہ حیدر شاہ اور وڈیرہ جعفر شاہ''۔

جواب دیتے ہوئے اُس کے چہرے پر نفرت عیاں تھی۔

وڈیرہ حیدر شاہ اپنے علاقے کا بہت مشہور وڈیرہ تھا۔ وہ دو دفعہ اسمبلی کا ممبر بھی رہ چکا تھا۔ اُس کی ذاتی شکار گاہ پر عرب شیوخ اور پاکستانی فوج کے افسران اکثر شکار کھیلنے آتے تھے۔

''تم سے کس نے کہا کہ یہ بے غیرت وڈیرے مسلمان ہیں''؟

قاری صاحب نے گرج دار آواز میں اتنی نفرت سے کہا کہ ساون کانپ کے رہ گیا۔ قاری صاحب کو اندازہ ہو گیا کہ وہ ڈر گیا تھا۔

انہوں نے ساون کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

اُس کے قریب آنے پر انہوں نے اس کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر کہا:

بیٹا! یہ وڈیرے کافر تو کیا، کافر سے بھی بدتر ہیں۔ کوئی مسلمان کسی انسان پر ظلم کر ہی نہیں سکتا۔

''پر، وڈیرے نے تو گاؤں میں ایک بہت بڑی مسجد بھی بنوائی ہے۔ اس کا گنبد نیلے شیشے کا ہے جو سورج اور چاند کی روشنی میں بہت چمکتا ہے''۔ ساون نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے یہ بات بتائی۔

''بیٹا! یہ ذرا مشکل باتیں ہیں، تم کو سمجھ نہیں آئیں گی۔ ان کالے کافروں نے مسلمانوں کا بھیس بدلا ہوا ہے۔ یہ داڑھی بھی رکھتے ہیں اور نماز بھی پڑھتے ہیں مگر اندر سے شیطانوں سے بھی بدتر ہیں''۔ قاری صاحب نے یہ بات اس کے سر پر بہت محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہی۔ ساون کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے! اسے زندگی میں پہلی بار کسی مرد نے بیٹا کہہ کر پکارا تھا۔ قاری صاحب کی بات سن کر وہ ساکت بیٹھا رہا۔

''بیٹا! کیا مسلمان بنو گے، ہمارے جیسے''؟

انہوں نے بہت نرمی سے ایک بار پھر دریافت کیا۔

''کیا مسلمان بن جانے سے روز ایسا کھانا ملے گا''؟ ساون نے جواب دینے کے بجائے سوال کر ڈالا۔

''ہاں بلکہ اس سے بھی اچھا کھانا اور سونے کے لیے آرام دہ بستر بھی'' قاری صاحب نے ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ یہ جملہ ادا کیا۔

ساون کسی گہری سوچ میں چلا گیا۔

''تم کو یہاں وڈیرے سے ڈرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ وہ اب تمہاری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے گا''۔ قاری صاحب نے اسے سوچ میں ڈوبے دیکھ کر کہا۔

''کیسے بنتے ہیں مسلمان''؟۔

اُس نے بہت تجسس سے پوچھا۔

بہت آسان ہے بیٹا! جو میں کہوں تم دہرانا۔ اس کے بعد تم مسلمان بن جاؤ گے۔ اِس مدرسے میں رہنے والے سب لوگ تمہارے بھائی ہوں گے اور تم میرے بیٹے۔ میں تم کو پڑھنا لکھنا سکھاؤں گا۔ بولو! منظور ہے مسلمان ہونا؟۔ قاری صاحب نے ایسے پوچھا کہ جیسے ان کو یقین ہو کہ ساون انکار نہیں کرے گا۔

''ہوں... ٹھیک ہے''۔ یہ کہہ کر اس نے ہاں کر دی۔

''کوئی اور سوال پوچھنا چاہتے ہو''؟۔قاری صاحب نے دریافت کیا۔

''کیا میں وہ بندوق چھو سکتا ہوں''۔ ساون نے قاری صاحب کے سامنے رکھی ہوئی کلاشنکوف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں!۔اسلحہ مسلمان مرد کی زینت ہے''۔

قاری صاحب نے یہ کہہ کر، کلاشنکوف کے میگزین کو نکال کر اس کے بولٹ کو دو دفعہ آگے پیچھے کر کے تسلی کی کہ اس میں کوئی گولی تو نہیں۔اس حفاظتی عمل کے بعد انہوں نے کلاشنکوف ساون کو تھما دی۔

ہتھیار ہاتھ میں آتے ہی اس کو اپنے اندر ایک بجلی سی دوڑتی محسوس ہوئی۔وہ اپنے آپ کو اچانک ایک بہت طاقتور انسان سمجھنے لگا تھا۔وہ رائفل سے فلموں والے انداز کی نقلیں اتار کر منہ سے فائرنگ کی آوازیں نکالنے لگا۔اس کے تصور میں وڈیرا، اور اس کا بھائی سامنے کھڑا تھا۔وہ اِن دونوں کو بے دردی سے خیالی گولیوں سے بھون رہا تھا۔

''مدرسے میں سب طالب علموں اور اساتذہ کو خبر کر دو کہ کل عشاء کی نماز کے بعد ساون کو داخل اسلام کیا جائے گا۔باورچی سے کہو کل دو گائیں ذبح کرے۔کل سب لوگ اس خوشی میں بریانی کھائیں گے''۔ قاری صاحب نے یہ بات کمرے کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے آدمی کو مخاطب کر کے کہی۔اُس آدمی نے یہ سنتے ہی اٹھ کر قاری صاحب کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور اسلام زندہ باد کا پرجوش نعرہ لگایا۔کمرے میں بیٹھے ہوئے تمام افراد نے اس نعرے کا زوردار جواب دیا۔

''اس کے رہنے کا انتظام کشمیری طلباء کے ساتھ کر دو''۔ایک اور آدمی کو قاری صاحب نے حکم جاری کیا۔

''بیٹا!اب تم جا کر آرام کرو''۔انہوں نے ساون کے ہاتھ سے کلاشنکوف لیتے ہوئے کہا اور اُسے گلے لگا کر رخصت کر دیا۔

قاری صاحب کا ایک محافظ ساون کو طلباء کے رہائشی حصے کی طرف لے گیا۔یہ حصہ تین منزلہ عمارت پر مشتمل تھا جس میں بہت سے چھوٹے بڑے کمرے بنے ہوئے تھے۔محافظ ساون کو دوسری منزل پر ایک کمرے میں لے آیا۔وہاں قالینِ پر نفاست سے چار بستر بچھے ہوئے تھے، دیوار کے ساتھ چار الماریاں

نصب تھیں۔کمرے میں اس وقت کوئی موجود نہ تھا۔

''تم آخری والے بستر پر آرام کرو۔ اس کمرے میں تین طلباء اور رہتے ہیں۔ ابھی اِن کے درس کا وقت ہے۔میں اُن کو تمہارے متعلق بتا دوں گا''۔ یہ کہہ کر محافظ ساون سے گلے مل کر چلا گیا۔ساون فوراً ہی گدّے پر نیم دراز ہو گیا۔اسے نرم نرم فوم کے گدّے پر لیٹنے میں بڑا لطف آ رہا تھا۔

فوم کے نرم و گداز گدّے پر چند مرتبہ کروٹ بدلتے بدلتے اس پر ایک خُمار سا چھانے لگا۔دروازے پر دی جانے والی دستک سے اس کی آنکھ کھل گئی۔دستک دینے کے بعد تین گورے چٹے لڑکے اندر آ چکے تھے۔ وہ ہڑا بڑا کر گدّے پر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ان تینوں اجنبی لڑکوں نے باری باری اُسے گلے سے لگا کر خوش آمدید کہا۔ایک دوسرے سے گلے ملنا مدرسے کے طالب علموں کی روایت تھی۔ساون ذہنی طور پر ابھی تک پرانی دنیا کا باسی تھا جہاں ہر کوئی اس سے جھڑک کر بات کرتا تھا۔وہاں پر اس کے لئے ہاتھ ملانا ناممکن تھا اور کسی کے گلے لگنا تو اس نے خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ایک گورے چٹے لڑکے نے جس کی عمر پچیس برس کے لگ بھگ ہو گی، گلے ملنے کے بعد اس طرح گفتگو کا آغاز کیا:

''میرا نام علی اکبر ہے، میرے برابر میں جو ہیں ان کا نام محمد عمر اور تمہارے برابر میں جو کھڑے ہیں ان کا نام محمد علی ہے۔ہم تینوں کشمیر کے رہنے والے ہیں۔علی اور عمر کا تعلق پاکستانی کشمیر سے ہے جبکہ میں کشمیر کے اس حصے سے تعلق رکھتا ہوں جس پر ہندوستان نے قبضہ کیا ہوا ہے''۔

علی اکبر نے یہ سب اردو میں کہا۔وہ ریڈیو سُن سُن کر اردو سمجھنے لگا تھا لیکن بولنے سے قاصر تھا۔اردو بولنے میں اس کی زبان لڑکھڑا جاتی تھی۔ساون نے سرائیکی زبان میں کچھ یوں جواب دیا:

''میں گوٹھ نور محمد کا رہنے والا ہوں اور گوٹھ سے بھاگ کر آ گیا ہوں۔میرے گوٹھ پر وڈیرے نے قبضہ کیا ہوا ہے''۔

علی اکبر نے کچھ اس طرح جواب دیا:

''کوئی بات نہیں، ہم ہندستان سے کشمیر آزاد کروانے کے بعد تمہارے گوٹھ کو وڈیرے کے چنگل سے چھڑوالیں گے۔چلو! اب بیٹھ کر باتیں کریں''۔اس نے کمرے میں بچھے ایک قالین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔اسی دوران اس کے دوسرے ساتھی کچھ خشک میوے الماری سے نکال کر ایک پلیٹ میں سجانے

لگے۔

''چائے پیو گے''؟۔ایک کشمیری طالب علم نے پوچھا۔ساون نے اثبات میں سر ہلا دیا۔یہ سن کر وہ لڑکا چائے بنانے چلا گیا۔

مدرسے میں مختلف زبانیں بولنے والے طلباء ساتھ ساتھ رہنے کی وجہ سے دوسری زبانیں بھی سمجھ لیتے تھے۔اس لئے ان کشمیری لڑکوں کو ساون کی سرائیکی سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔علی اکبر نے خشک میوے کی پلیٹ ساون کے سامنے بڑھاتے ہوئے کہا:

''یہ خشک خوبانیاں کشمیر کا خاص تحفہ ہیں۔وہاں گاؤں کے لوگ ان کو گھروں کی چھت پر دھوپ میں سکھاتے ہیں۔ذرا چکھ کر دیکھو یہ ذائقہ تم زندگی بھر نہ بھول پاؤ گے''۔ساون نے فوراً ایک سنہرے رنگ کی خشک خوبانی کو منہ ڈالا۔نہایت لذیذ اور انجان ذائقہ اس کے منہ میں پھیل گیا۔آج سے پہلے اس نے خشک خوبانی کو نہ دیکھا تھا۔

''کیسا ذائقہ ہے''؟۔کشمیری طالب علم نے پوچھا۔

''بہت مزیدار''۔ساون نے دوسری خوبانی منہ میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔اسی دوران دوسرا طالب علم چائے لے آیا اور سب مل کر چائے پینے لگے۔چائے پینے کے دوران عشاء کی اذان کی آواز آنے لگی۔

تینوں طالب علموں نے جلدی جلدی چائے ختم کی اور ایک طالب علم نے ساون سے کہا:

''چلو عشاء کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ہمارے ساتھ نماز پڑھنے چلو''۔

ساون نے جواب دیتے ہوئے کہا:

''مجھے قاری صاحب کل مسلمان کریں گے۔ابھی تو میں مسلمان نہیں ہوں''۔

''ہاں!بات تو یہ صحیح کہتا ہے۔اِبھی اس پر نماز فرض نہیں''ایک طالب علم نے کہا۔باقی دونوں طلباء نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

ایک طالب علم نے اُس سے کہا:

''تم سو جاؤ،عشاء کے بعد ہمارا ایک درس ہے۔تم سے صبح ملاقات ہوگی''۔یہ کہہ کر تینوں اُس سے مصافحہ کرتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

صبح سویرے اذان کی آواز نے اُس کو جگا دیا۔ کشمیری طلباء شاید اذان سے پہلے ہی نماز کے لئے جا چکے تھے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے کی کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ کھڑکی سے کھیتوں کا نظارہ بہت دلکش تھا۔ اُسے اپنا گاؤں یاد آ گیا۔ ایک لڑکا کھیتوں کے بیچ پگڈنڈی سے جانوروں کے گلّے کو ہانکتا ہو جا رہا تھا۔ اُسے بے اختیار وڈیرے کے جانور یاد آ گئے جو ملکیت تو وڈیرے کے تھے پَر وہ مانوس اُس سے ہی تھے۔ وہ اپنے خیالوں میں مگن تھا کہ کشمیری طلباء کمرے میں آ گئے۔ ایک طالب علم کے ہاتھ میں بڑا سا مٹی کا پیالہ تھا۔

طالب علم نے پیالہ ساون کو دیتے ہوئے کہا:

''یہ لو! جلدی جلدی یہ کھیر کھا لو۔ تم کو ہمارے ساتھ میدان میں دوڑ لگانے جانا ہے۔ اور دوڑ لگانے کے لئے مسلمان ہونا ضروری نہیں''۔

اُس نے مٹی کے پیالے سے چمچہ نکال کر ایک طرف رکھا اور جلدی جلدی ہاتھ سے کھیر کھانے لگا۔ طلباء اُس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔

جس دوران ساون کھیر کھا رہا تھا، طلباء نے دوڑنے کے لئے جوگرز پہننے شروع کر دیئے۔ ساون کے پاس جوتے نہیں تھے۔ اُس نے جلدی جلدی سے کھیر ختم کی اور چپلیں پاؤں میں ڈال کر اپنے نئے ساتھیوں کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔

وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ چلتے چلتے مدرسے کی پچھلی سمت آ گیا، اُس کے سامنے ایک بہت بڑا کھیل کا میدان تھا۔ وہاں موجود فٹ بال کے گول کی نشانی بتا رہی تھی کہ مدرسے کے طالب علم صرف پڑھتے ہی نہیں بلکہ کھیلوں میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ ساون نے دیکھا کہ وہاں بہت سے طالب علم اکھٹے تھے۔ گھٹے ہوئے جسم کا ایک پستہ قد آدمی سب کو سیٹی بجا کر ایک لائن میں کھڑا ہونے کو کہہ رہا تھا۔ اُس آدمی نے ساون اور اِس کے ساتھیوں کو بھی لائن میں دوسرے طلباء کے ساتھ کھڑا ہونے کو کہا۔ سیٹی بجتے ہی سب کو دور نظر آنے والی دیوار کو چھو کر واپس آنا تھا۔ ساون کو یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اُس کی عمر جنگل میں جانوروں کے پیچھے دوڑتے دوڑتے ہی گزری تھی۔ سیٹی بجتے ہی سب دوڑ پڑے۔ اِن دوڑنے والوں کے بیچ میں ایک وہ ہی تھا جو ننگے پاؤں دوڑ رہا تھا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے سب سے آگے نکل گیا اور ابھی سب آدھے رستے ہی میں تھے کہ وہ دیوار کو چھو کر واپس آ چکا تھا۔ جیسے ہی وہ واپس آیا تو سیٹی بجانے والے آدمی نے اُس کو بڑھ کر گلے

لگالیا۔ کچھ ہی دیر میں باقی طلباء بھی آگئے۔ سب کی سانس پھولی ہوئی تھی؛

جب سب کے اوسان بحال ہوگئے، تو سیٹی بجانے والے آدمی نے کہا:

''میں نے کراچی سے کشمیر تک نوجوانوں کی جسمانی تربیت کی ہے۔ ایسا گھوڑے کی مانند بھاگنے والا نوجوان میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ شاباش بیٹا! کیا نام ہے تمہارا؟''

''ساون''

اُس نے مختصر جواب دیا؛

سیٹی بجانے والے نے اپنے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سو روپے کا کرارا نوٹ نکالا اور کہا:

''یہ لو بیٹا! تمہارا انعام۔ آج سے تم میرے خاص شاگرد ہو''۔

ساون نے سو روپے کا نوٹ ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھا اور سوچنے لگا:

''ایک دفعہ اُطاق پر وڈیرے نے ناچنے والیوں کو بلوایا تھا۔ وہاں بڑے بڑے لوگ آئے تھے۔ وہ سب اسی رنگ کے نوٹوں کو ناچنے والی عورتوں پر لٹا رہے تھے''۔ اس نے چھپ کر یہ ناچ دیکھا تھا؛

وہاں موجود طالب علموں نے اُسے مبارکباد دینا شروع کی تو وہ خیالات کے بھنور سے نکل آیا۔ دوڑ کے بعد سب نوجوانوں نے مل کر کسرت کی۔

''آپ سب لوگ جائیں''۔ ناشتے کا وقت ہونے پر کسرت کے انچارج استاد نے سب کو ناشتے کے ہال میں جانے کا حکم دیا۔

ساون اپنے ساتھیوں کے پیچھے چل پڑا۔ وہ ان کے ہمراہ ایک ہال میں اندر آیا۔ وہاں سلیقے سے دسترخوان بچھے ہوئے تھے۔ تنور سے آتی ہوئی تازہ نان کی خوشبو نے ماحول کو معطر کر رکھا تھا۔ ساون نے دیکھا کہ ہال کے آخر میں کئی تنور تھے جن سے تازہ تازہ روٹیاں اتر رہی تھیں۔ وہ دسترخوان پر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بیٹھ گیا۔ اُس کے ساتھی اُس کو اپنے برابر بٹھا کر بہت فخر محسوس کر رہے تھے۔ ابھی کھانا لگنے میں کچھ دیر تھی۔

ساون نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے ایک ساتھی سے پوچھا:

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ مجھے انعام میں کتنے روپے ملے''؟

’’کیا تم کو نہیں معلوم‘‘؟ ساتھی نے حیرانی سے پوچھا۔

ساون نے جواب میں کہا:

’’نہیں! مجھے بھلا کیا پتہ کہ روپے کیسے گنتے ہیں؟

گوٹھ میں ہم سب مفت میں کام کرتے تھے۔ ہم کو صرف اجناس اور کپڑا فصل کٹنے پر ملتا تھا‘‘.

’’تم کو پورے سو روپے انعام میں ملے ہیں۔ اُستاد نے آج تک کسی دس کا نوٹ نہیں دیا ہے‘‘۔

ساون کے کشمیری ساتھی نے فخر کے ساتھ اُس کو بتایا۔

’’ایک بات تو بتاؤ‘‘! ساتھی نے پوچھا۔

’’کون سی بات‘‘؟ ساون نے کہا۔

’’تم ان سو روپوں کا کیا کرو گے‘‘؟

ساون یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا۔

وہ کچھ دیر سوچ کر بولا:

’’میں روز ایک نئی فلم دیکھوں گا اور روز ایک نئی قسم کی مٹھائی کھاؤں گا‘‘۔

شش۔۔۔ شش۔ ساتھی نے منہ پر انگلی رکھ کر کہا:

ہم دینی علوم کے طالب علم ہیں۔ فلمیں وغیرہ دیکھنا ہمارا کام نہیں۔ یہاں فلموں اور گانوں کی بات نہ کرنا۔ رہی مٹھائی کی بات، تو جتنا دل کرے کھانا۔ بازار میں حلوائی کی دکان ہے جو روز تازہ مٹھائی بناتا ہے۔ قاری صاحب کو بھی اس کی مٹھائی بہت پسند ہے۔ ابھی یہ لوگ باتیں کر ہی رہے تھے کہ سب کے سامنے مدرسے کے ملازموں نے ناشتہ لگانا شروع کر دیا۔ تازہ تازہ نان اور چنے کا سالن دیکھ کر اس کی بھوک اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ کھانے کے فوراً بعد سب میں چائے تقسیم ہونے لگی۔

وہ چائے پیتے ہوئے سوچنے لگا کہ:

’’گوٹھ میں صبح سے شام تک کام کرتا تھا تو اُس کو مشکل سے روٹی پر ساگ رکھ کر کھانا نصیب ہوتا تھا۔ وڈیرے کے ملازموں کی لاتیں اور گالیاں ہی اس کی اصل خوراک تھیں۔ یہ عجیب دنیا ہے جہاں نہ اس کو کوئی گالی دیتا ہے اور نہ ہی کمتر سمجھتا ہے۔ مسلمان کتنے اچھے ہوتے ہیں‘‘۔

''چلو! اب میں تم کو کمرے تک چھوڑ آؤں۔ ہمارے درس کا وقت ہونے کو ہے''۔ ساتھی نے ساون کو خیالوں میں گم دیکھ کر کہا۔

''نہیں، میں خود چلا جاؤں گا، مجھے رستہ یاد ہوگیا ہے''۔ اس نے اپنے ساتھی کو بڑے اعتماد سے کہا۔ اور یہ کہہ وہ کمرے کی جانب چل دیا۔

اس کے پاس کرنے کے لئے کچھ نہ تھا۔ نہ اسے کپاس کے پھول چننا تھے، نہ جانوروں کو چرانے کے لئے جانا تھا اور نہ ہی وڈیرے کی اُطاق میں جھاڑو لگانا تھی۔ اُس کا وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ وہ وقت گزارنے کے لئے اپنے ساتھیوں کی کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

وہ سوچنے لگا کہ:

''نہ جانے یہ لوگ ان کیڑوں مکوڑوں جیسی لکیروں کو کیسے پڑھ لیتے ہیں۔ شاید مجھے بھی ایک دن پڑھنا لکھنا آجائے گا''۔

کمرے کی نیم کھلی کھڑکی سے ایک چڑیا بھٹک کر اندر آگئی۔ وہ باہر کا رستہ نہ پا کر اِدھر اُدھر گھبراہٹ سے اڑنے لگی۔ پرندے کی اس بے تکی اُڑان سے وہ خیالوں سے نکل آیا، اُس کو اس معصوم چڑیا کو اس کمرے کی قید سے آزادی دلانے کا خیال آگیا۔ اُس نے کمرے کی کھڑکیوں کو مکمل طور سے کھول دیا اور ایک چادر سے چڑیا کو کھڑکی کی طرف اڑا دیا۔ اسے لگ رہا تھا کہ شاید چڑیا ایسے ہی قیدی بن گئی ہے جیسے وہ اپنے گاؤں میں قید تھا۔ وقت گزارنے کے لئے وہ لیٹ گیا۔ یوں وقت دِھیرے دھیرے گزرنے لگا۔

کسی نے دروازے پر دستک دی، اُس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

باہر قاری صاحب کا خاص محافظ کھڑا تھا، جس نے اپنے مخصوص انداز میں رائفل کندھے پر لٹکائی ہوئی تھی۔

اُس نے ساون کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا:

''چلو بیٹا! تم کو قاری صاحب بلا رہے ہیں، وہ پیچھے میدان میں موجود ہیں''۔

ساون نے جلدی سے چپل پہنے اور محافظ کے پیچھے چل دیا۔ رہائشی عمارت کے سامنے میدان میں قاری صاحب کچھ باریش افراد کے ساتھ کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ وہ آدمی بھی تھا جس نے اسے سو روپے کا نوٹ

انعام میں دیا تھا۔ قاری صاحب نے قریب آنے پر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

''شاباش بیٹا! مجھے اُستاد نے بتایا ہے کہ تم گھوڑے کی رفتار سے دوڑتے ہو، میں تم سے بہت خوش ہوں۔

دیکھو! یہ جو سب گائیں سامنے کھڑی ہیں، تمہارے اِسلام لانے کی خوشی میں ذبح ہوں گی۔ سب لوگوں کی پلاؤ اور بریانی کی دعوت ہوگی''۔

قاری صاحب کی بات سنتے ہوئے اس کی رخساروں پر آنسو بہنے لگے اور وہ سسکیوں کو نہ روک پایا۔

''کیا ہوا بیٹا''؟۔ قاری صاحب نے پوچھا۔

''مجھے لالی یاد آرہی ہے''۔ ساون نے رندھی ہوئی آواز سے کہا۔ ''یہ لالی کون ہے بیٹا!؟۔ کیا تمہاری کوئی بہن ہے''؟۔ قاری صاحب نے اندازے سے کہا۔

''نہیں، وہ وڈیرے کی گائے کا نام ہے، وہ مجھ سے بہت مانوس تھی۔ وہ بالکل سرخ گائے کی طرح تھی''۔ ساون نے کھونٹے سے بندھی ایک گائے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

قاری صاحب نے کچھ سوچنے کے بعد کہا:

''کوئی بات نہیں بیٹا، ہم اس گائے کو نہیں کٹنے دیں گے۔ کیا تم اس کی دیکھ بھال کر سکتے ہو''؟

ساون نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے پر ایک شرط ہے، جب یہ گائے دودھ دینے لگے تو اس کا دودھ پابندی سے حجرے میں بھجوانا''۔ قاری صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ساون نے سر ہلا کر رضامندی کا اظہار کیا اور گائے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ قاری صاحب اُسے گائے کے ساتھ کھیلتے ہوئے چھوڑ کر اپنے حجرے کی طرف چلے گئے۔ ابھی وہ گائے سے کھیلنے میں مصروف ہی تھا کہ اس کے کمرے کے ساتھی اُسے دوپہر کے کھانے کے لئے بلانے آگئے۔ دوپہر کے کھانے میں اسے مزیدار پالک گوشت اور نان کھانے کو ملا۔ سیر ہو کر کھانے کے بعد وہ کمرے میں آگیا۔ شدید گرم دن تھا۔ پیٹ بھر کے کھانے اور بجلی کے پنکھے کی فرحت بخش ہوا نے اس پر غنودگی طاری کر دی، وہ بے اختیار سو گیا۔

حجام کے آنے پر ایک ساتھی نے اسے نیند سے جگاتے ہوئے کہا:

''ساون! اٹھو، حجام آ گیا ہے''۔ وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ حجام نے ایک چادر قالین پر بچھا کر اس کو وہاں بیٹھنے کو کہا۔ اس کے بیٹھنے کے بعد حجام نے ایک تولیہ اس کے کندھوں پر ڈال کر ایک پچکاری سے اس کے بالوں پر پانی چھڑکنا شروع کر دیا۔ اس کے لئے یہ سب کچھ بہت عجیب تھا۔ سال میں ایک یا دو دفعہ اس کی ماں زبردستی پکڑ کر اس کے بال کاٹ دیتی تھی۔ گاؤں کا حجام اکثر اُطاق پر آ کر وڈیرے اور اس کے بچوں کے بال کاٹتا تھا۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو وڈیرے کے جیسا ہی سمجھ رہا تھا۔ بال کاٹنے کے بعد حجام نے اس کو آئینہ دکھایا۔ اس کو زندگی میں پہلی بار اپنا چہرہ اچھا لگا۔ اس کا ایک ساتھی ایک تھیلا ہاتھ میں لئے کمرے میں آیا اور اس نے تھیلے سے کپڑوں کا ایک نیا جوڑا نکالتے ہوئے کہا:

''یہ لو! قاری صاحب نے تمہارے لئے نیا کرتا اور شلوار بھیجا ہے غسل کر کے اسے پہن لو۔ عشاء کی نماز کے بعد اسلام قبول کرنے کی رسم ادا کی جائے گی''۔

ساون نے بہت خوشی سے نئے کپڑوں کو دیکھا اور ان کو ہاتھ میں تھامے غسل خانے کی طرف چل پڑا۔ اس کو کٹے ہوئے بالوں کی چبھن سے بہت الجھن ہو رہی تھی۔

وہ نہا کر واپس آیا تو اس کے لباس پر ایک طالب علم نے خوشبو لگاتے ہوئے کہا:

''غسل کے بعد خوشبو لگانا پیغمبر اسلام کی سنت ہے''۔

اُس کو یہ بات سمجھ نہ آئی پر اس نے کوئی سوال نہ کیا۔ اسے اب صرف اپنے مسلمان بننے کا انتظار تھا۔

اُسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ قاری صاحب کا محافظ اسے لینے کے لئے آن پہنچا۔

محافظ نے کمرے میں آ کر سب کو مخاطب ہو کر کہا:

''آپ لوگ چلیں! مسجد میں سب اساتذہ جمع ہو چکے ہیں''۔ ساون تو چلنے کو پہلے ہی تیار تھا۔ یہ سنتے ہی وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ تینوں کشمیری طالب علم بھی کمرے سے نکل آئے۔ ساون کے دائیں طرف دو طالب علم ساتھی اور بائیں طرف مسلح محافظ اور دوسرا طالب علم ساتھی تھا۔ آج وہ ایک ایسی شان سے چل رہا تھا کہ جیسے وڈیرہ گاؤں میں چلتا تھا۔ وہ سب چلتے ہوئے سنگ مرمر سے بنی مسجد کے قریب آ گئے۔ سیڑھیوں کے پاس سب نے جوتے اُتار دیئے۔ سب کی دیکھا دیکھی ساون نے بھی اپنے چپل اتار دیئے۔

مسجد کا ہال طلباء سے بھرا ہوا تھا۔ ہال کے ایک طرف قاری صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے آزو بازو کچھ اور باریش افراد بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اِن سب افراد کے سر دستاروں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے ایک ٹرے میں گلاب کے پھولوں کے ہار اور پتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اگربتیوں کے جلنے سے ماحول معطر ہو چکا تھا۔ قاری صاحب نے ساون کو اشارے سے اپنے پہلو میں بیٹھنے کو کہا۔ ساون وہاں جا کر بیٹھ گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

ایک باریش آدمی نے قاری صاحب سے اجازت لے کر قرآن کی تلاوت سے کاروائی کا آغاز کر دیا۔ کچھ دیر تلاوت کرنے کے بعد اُس نے مائیک قاری صاحب کے سامنے لا کر اِس طرح رکھا کہ ان کو اٹھنے کی زحمت نہ ہو اور وہ اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے مائیک کے ذریعہ سب حاضرین محفل سے مخاطب ہو سکیں۔

قاری صاحب نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا اور قرآن کی ایک آیت کی تلاوت کرنے کے بعد یوں گویا ہوئے:

''میرے نہایت ہی محترم اساتذہ کرام! اور جان سے عزیز طالب علمو! آج کے اس مبارک دن میں ایک شیعہ کافر وڈیرے کے ہاتھوں ستائے ہوئے نوجوان نے دین حق کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

عزیز طالب علمو! جب اِس نوجوان نے مجھے اپنی دُکھ بھری داستان سنائی تو میں نے اس سے کہا:

''کہ اسلام تو آیا ہی اِسی لئے ہے کہ مظلوموں کو ظالموں سے نجات دلائے۔ جیسے اسلام نے اس بے کس و بے یار و مددگار نوجوان کو ظلم سے نجات دلا کر اپنے دامن میں سمیٹا ہے اور اُسے سہارا دیا ہے۔ اسی طرح دین مبین اپنے مجاہدوں کی مدد اور ان کے طوفانی جذبہ جہاد سے اپنے کشمیری بھائیوں کو ہندو قابض افواج کے مظالم سے نجات دلائے گا۔ جیسے ہم مجاہدین نے رُوس کو افغانستان سے نکالا ہے۔ جیسے ہم نے سربین درندوں کو بوسینا سے نکال باہر کیا ہے، اِسی طرح سے ہم چینی کمیونسٹوں کو بھی ترکستان سے نکال پھینکیں گے۔ آخر کار ہم چیچنیا کو روسی درندوں سے پاک کر کے امام شامل کی رُوح کے روبرو سرخ رُو ہوں گے''۔

قاری صاحب کا پرجوش، ایمان افروز بیان یہاں تک پہنچا تھا کہ ایک نوجوان طالب علم نے کھڑے ہو کر زوردار نعرے لگانا شروع کر دیئے:

''ظالموں کا ایک علاج!۔ الجہاد، الجہاد، الجہاد،،،، الجہادُ''

تمام شرکائے محفل نے ان نعروں کو اتنی شدت سے دہرایا کہ مسجد کے در و دیوار سے یہ نعرے گونجنے لگے۔ کچھ دیر بعد قاری صاحب نے محفل کے شرکاء کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔ سب فوراً خاموش ہو گئے۔ مکمل سکوت کے بعد قاری صاحب نے ساون کی طرف شفقت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا:

''بیٹا! اب جو میں کہوں اسے دہراتے جاؤ''

ساون نے سر ہلا کر اقرار کیا۔

قاری صاحب نے کلمہ طیبہ پڑھا۔

ساون نے لڑکھڑاتی زبان سے اُسے دہرایا۔

عربی اس کی زبان پر رواں نہیں تھی۔ قاری صاحب نے کلمہ طیبہ کا مطلب اُس کو سمجھایا۔

اس کاروائی کے بعد قاری صاحب نے کہا:

''آپ سب کو اور ساون کو بہت بہت مبارک ہو کہ وہ دین اسلام میں داخل ہو چکا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے قاری صاحب نے گلاب کے پھولوں کا ہار ساون کے گلے میں ڈالا اور اس کے بعد کہا:

''بیٹا! ساون نام سے ہندو مذھب کی جھلک آتی ہے، تمہیں اس نام کو ترک کر دینا چاہیے۔ میں تمہیں آج نیا نام دیتا ہوں۔ آج سے تمہارا نام خالد ہے، خالد سفیانی، یہ نام حضرت خالد بن ولید سے منسلک ہے۔ وہ عظیم سپہ سالار کہ جس کی تلوار کے خوف سے عرب و عجم میں سکتہ طاری ہو جاتا تھا۔ اللہ تم کو ان کے جیسی بہادری اور شجاعت عطا کرے گا۔ تم صرف مسلمان ہی نہیں بنے ہو بلکہ میں نے تم کو اپنا بیٹا بھی بنایا ہے اور اسی لئے تمہارے نام کے ساتھ سفیان لگایا ہے''۔ یہ کہ کر قاری صاحب کھڑے ہو گئے۔ ان کے کھڑے ہوتے ہی تمام اساتذہ اور حاضرین محفل بھی کھڑے ہو گئے۔ قاری صاحب نے ساون کو بڑھ کر گلے لگا کر مبارکباد دی۔ قاری صاحب کے بعد سب اساتذہ نے ساون کو باری باری گلے سے لگایا۔ طلباء کی ایک بڑی تعداد نے پہلے ہی اس سے گلے ملنے اور مبارکباد دینے کے لئے صف بندی کر لی تھی۔

مائیک سے ایک استاد نے اعلان کیا:

''تمام طلباء کھانے کے ہال میں آ جائیں''

قاری صاحب دیگر اساتذہ کے ساتھ پہلے ہی کھانے کے ہال کی طرف جا چکے تھے۔ ساون کو اپنے نام

کے یوں اچانک بدل جانے پر بہت شدید دھچکا لگا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ کسی نے دن دھاڑے بہت بڑا ڈاکہ مار کر اس کو اس سے چھین لیا ہے۔ ''ساون'' جیسا سندر نام اس کو اس کی ماں نے دیا تھا۔ وہ اپنے نام کے چھن جانے کے غم سے نڈھال تھا اور بے دلی سے سب لوگوں سے گلے مل رہا تھا۔

کھانے کے کمرے میں داخل ہوتے ہی پلاؤ اور قورمے کی اشتہا انگیز خوشبو ''ساون'' عرف خالد سفیانی کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ کھانے کی خوشبو اس کے نام کے چھن جانے کے غم پر غالب آ گئی تھی۔ ہال میں دستر خوان پر طلبا، صف آرا ہو چکے تھے۔ ہر طالب علم اس کو اپنے برابر میں بیٹھنے کی دعوت دے رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی طالب علم کے برابر میں بیٹھتا، ایک استاد اسے ہال کے اگلے حصے میں لے گئے جہاں قاری صاحب دیگر اساتذہ کے ساتھ براجمان تھے۔ وہ اساتذہ کے درمیان بیٹھ گیا۔ کھانا لگ چکا تھا ایک استاد نے اپنے ہاتھ سے اس کی پلیٹ میں پلاؤ ڈال کر دیا۔ وہ بغیر کسی انتظار کے کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ پلاؤ اور قورمے کے بعد سب کو گرم گرم حلوہ پیش کیا گیا۔ سیر ہو کر کھانے کے بعد ساون کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگی تھیں۔

قاری صاحب نے اونگھتے ہوئے ساون کو یوں مخاطب کیا:

''بیٹا خالد! چلو! میں تم کو خود تمہارے کمرے تک چھوڑ کر آتا ہوں۔ رستے میں کچھ باتیں بھی ہو جائیں گی''۔

ساون نے قاری صاحب کی بات پر بالکل دھیان نہ دیا۔ قاری صاحب نے دوبارہ کہا:

''بیٹا خالد! میں تم سے کہہ رہا ہوں''۔

ساون کی توجہ نہ پا کر ایک استاد نے اس کا شانہ ہلا کر اس کی توجہ قاری صاحب کی طرف کروائی۔ وہ چونک کر قاری صاحب کی طرف دیکھنے لگ گیا۔ قاری صاحب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''کوئی بات نہیں بیٹا! تم کچھ دنوں میں اپنے نئے نام سے مانوس ہو جاؤ گے۔ آؤ چلو! میں تم کو تمہارے کمرے تک چھوڑ آؤں۔ تم کافی تھکے ہوئے محسوس ہوتے ہو''۔

قاری صاحب نے اساتذہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''آپ حضرات حجرے میں تشریف لے آئیں، قہوہ وہیں پئیں گے۔ آپ سب سے کچھ اہم امور

پر جاولہ خیال کرتا ہے"۔ "چلو! خالد بیٹا!"۔ ساون کو کھڑے ہوتا دیکھ کر قاری صاحب نے اس کو نئے نام سے پکارتے ہوئے کہا۔ خالد قاری صاحب کے پیچھے ہولیا۔ قاری صاحب نے اُس سے رستے میں کہا:

"بیٹا خالد! کل سے تمہاری تعلیم وتربیت شروع ہو جائے گی۔ ایک اُستاد تم کو اردو لکھنا پڑھنا سکھائیں گے اور ایک اُستاد تم کو بنیادی انگریزی کی تعلیم بھی دیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ تم دین کی تعلیم بھی حاصل کرو گے۔ روزانہ صبح تمہارے دن کا آغاز عبادت اور جسمانی ورزش سے ہوگا۔ اچھی خوراک اور کسرت تمہارے جسم کو مضبوط بنادے گی۔ ایک دن تم انشاء اللہ کا فروڈیرے سے بدلہ لینے کے قابل ہو جائے گے۔ تم کو اللہ نے غلامی کے لئے نہیں بلکہ غلاموں کو آزادی دلانے کے لئے پیدا کیا ہے"۔ یہ بات قاری صاحب نے اس کا کندھا دباتے ہوئے کہی۔ اس کے پاس ایسے الفاظ نہیں تھے کہ وہ قاری صاحب کی عالمانہ باتوں کا کوئی جواب دیتا۔ وہ اپنے گلے میں جھولتے گلاب کے پھولوں کی پتیوں کو اضطراب میں نوچتا رہا۔ قاری صاحب کی باتوں نے اس کے بدن میں بجلی سی دوڑادی تھی۔ باتیں کرتے کرتے دونوں طلباء کے رہائشی حصے کی طرف آچکے تھے۔ قاری صاحب نے رہائشی حصے کی سیڑھیوں کی طرف رک کر کہا:

"اچھا بیٹا! اب تم جا کر آرام کرو کل فجر کی نماز میں ملاقات ہوگی"

۔ یہ کہہ کر وہ اپنے حجرے کی طرف چل پڑے جہاں دیگر اساتذہ ان کے منتظر تھے۔ ان کا محافظ حسب معمول کندھے پر رائفل لٹکائے چوکنا ان کے پیچھے چل رہا تھا۔

خالد تھکا ہوا تھا اور خوف ختنہ بھی اس پر مُسلط تھا، اُس کو کچھ طلبا نے کہا تھا کہ مسلمان ہونے کہ بعد ختنہ ضروری ہوتی ہے۔ وہ فوراُ ہی اپنے بستر کی طرف بڑھ گیا۔ اسے بہت ہی مشکل سے نیند آئی۔ وہ آخرِ شب بہت خوفناک خواب سے بیدار ہوگیا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ بہت سے گدھ اُس کے عضوِ تناسل کو نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔

قاری صاحب نومسلم خالد کو اس کی رہائشی بلڈنگ تک چھوڑ کر واپس اپنے حجرے میں آگئے۔ وہاں پر اساتذہ اور دیگر جہادی کمانڈرز پہلے ہی سے موجود تھے۔ کمرہ قہوے کی مخصوص خوشبو سے مہک رہا تھا۔ ان کے کمرے میں آتے ہی وہاں موجود تمام افراد احتراماً کھڑے

ہوگئے۔ قاری صاحب نے سب کے پاس جا کر باری باری سب سے مُصافحہ ومعانقہ کیا۔ اس عمل

سے فارغ ہو کر انہوں نے سب سے تشریف رکھنے کی گزارش کی۔ سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تو قاری صاحب نے بسم اللہ پڑھنے کے بعد قرآن کی ایک آیت کی تلاوت کی، جس کا مطلب یہ تھا کہ ''اللہ نے مجاہدین کو فضیلت دی ہے بیٹھے رہنے والوں پر اور ان کو اجرِ عظیم کی بشارت دی ہے''۔

اس آیت کی تلاوت کے بعد انہوں نے مزید کہا:

''آپ سب حضرات کو ایک خوشخبری سنانے کے لئے یہاں جمع ہونے کی زحمت دی گئی ہے۔ ہمارے اِس مدرسے کا ایک سابق طالب علم اور میرا شاگرد عمیر۔۔۔وہی عمیر جس کی ایک آنکھ رُوسی قابض افواج سے جہاد کرتے ہوئے ضائع ہو گئی تھی...اُس کو اللہ نے رہبری کی توفیق عطا کی ہے۔ وہ مدارس کے بہت سے طلباء کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ بہت سے کمانڈرز نے اُس کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے۔ میں بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والا ہوں۔ تمام علمائے کرام نے مِل کر انُ کو ''حضرت مُلّا'' کا لقب دیا ہے۔

''حضرت مُلا عمیر'' کی آج مدرسے میں آمد متوقع ہے۔ آپ حضرات قہوہ پینے کے بعد کتب خانہ میں جمع ہو جائیں۔ جیسے ہی آپ کو میرا پیغام پہنچے آپ سب لوگ دوبارہ یہاں آجائیں۔ ہم انشا اللہ کابل کو ایرانی اور ہندوستانی ایجنسیوں کے چنگل سے چھڑا لیں گے انشا اللہ''۔ ''لفظ انشا اللہ'' قاری صاحب نے نہایت جوش میں اور ہاتھوں کو دُعائیہ انداز میں اٹھاتے ہوئے کچھ اس طرح کہا کہ حاضرین محفل بھی پر جوش انداز میں آمین کہے بغیر نہ رہ سکے۔

کچھ احباب کی پیالیاں خالی ہو چکی تھیں۔ قاری صاحب کے خادم نے اُن کی پیالیوں میں دوبارہ قہوہ ڈالنا شروع کر دیا۔ مدرسہ کے ایک استاد نے قہوے کی چُسکی لیتے ہوئے کہا:

''قاری صاحب ہمارے نومسلم نوجوان برادر کے اسلام میں ابھی ایک چھوٹی سی کمی ہے''۔

''وہ کیا؟''۔ قاری صاحب نے دریافت کیا۔

''اس کی سنّت کرانا ہو گی تا کہ وہ مکمل مسلمان بن جائے''۔

''ایک اور اُستاد گویا ہوئے اور انہوں نے اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے کہا:

''اگر آپ کہیں تو ڈاکٹر کو مدرسے میں بلا لیتے ہیں، وہ یہیں پر خالد کی ختنے کر دے گا''۔

قاری صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:

نہیں ہم خالد کی ختنے نہیں کرائیں گے۔ ہمارے کئی مجاہد جو مقبوضہ کشمیر میں جاسوسی اور جہاد کے مشن پر تھے، صرف مختون ہونے کی وجہ سے پہچانے گئے تھے۔ ہندوستانی فوجی کو جس پر بھی شبہ ہو وہ سب سے پہلے اُس کی شلوار اُتار کر دیکھتے ہیں۔ مختون ہونے پر عام طور سے وہ وہیں پر گولی مار کر سرکار سے اپنا انعام کھرا کر لیتے ہیں۔ خالد کے عضوِ تناسُل پہ لٹکی ہوئی کھال...اُس کے جہادی مشن کی ڈھال ثابت ہوگی...ویسے بھی اسلام کی ابتدا میں بہت سے اصحاب مشرف بہ اسلام ہوئے، میں نے کسی روایت میں نہیں پڑھا کہ انُ کی ختنے کرائی گئی تھیں۔ میں بہت سے یتیم بچوں کو گود لینے کی منصوبہ بندی کر رہا ہوں، ان کو ہم جہاد کی تربیت دیں گے، ان بچوں کی مسلمانیاں نہیں کرائی جائیں گی۔ اب ہم کو اللہ نے ایک پلا پلایا غیر مختون نوجوان دے دیا ہے تو ہم کو اس کی قدر کرنا چاہیے''۔

ایک استاد نے قاری صاحب کی دانش پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

''یہ بھی تو ممکن ہے کہ مجاہدین کا کوئی اور گروپ اس کی لٹکی ہوئی کھال کی وجہ سے اسے ہندو جاسوس سمجھ کر مار دے''۔

قاری صاحب نے جواب میں کہا:

''ہمارے لوگ مارے نہیں جاتے شہید کیے جاتے ہیں اور شہادت ہی ہمارے لئے سب سے بڑی سعادت ہے''۔

قاری صاحب نے یہ بات اُستاد کی اصلاح کرتے ہوئی کہی اور قہوے کی چُسکی لیتے ہوئے کہا:

''بس یہ طے ہے کہ خالد کی ختنے نہیں ہوں گی۔ اب آپ لوگ کسی اور موضوع پر بات کریں''۔ قاری صاحب نے یہ کہہ کر گفتگو کے موضوع کو بدل دیا۔ اس سے پہلے کہ کسی اور موضوع پر گفتگو شروع ہوتی ان کے سامنے رکھے ایک بڑے سے وائرلیس ٹرانسمیٹر سے سگنل کی آواز آنے لگی۔ انہوں نے ہیڈ فون سر پر لگا کر ایک کوڈ دہرایا، وہ پشتو میں بات کر رہے تھے۔ حجرے میں موجود تقریباً تمام افراد پشتو سمجھ سکتے تھے، کیوں کہ تمام لوگ افغانستان میں جہاد کر چکے تھے اور کچھ اساتذہ کی مادری زبان بھی پشتو تھی۔

ٹرانسمیٹر کے ذریعے بات کرنے کے بعد قاری صاحب نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

'' آدھے گھنٹے کے بعد ہیلی کاپٹر مدرسے میں اُترنے والا ہے۔آپ طلباء کے رہائشی حصے میں اعلان کرادیں کہ کوئی طالب علم باہر نہ آئے۔آپ حضرات کتب خانے میں موجود رہیں میں آپ کو سب مناسب وقت پر بُلا لوں گا۔اب آپ سب جائیں تا کہ میں مہمانوں کے لئے کچھ انتظام کرسکوں''۔

یہ بات سُن کر سب لوگ باری باری مصافحہ کر کے حجرے سے باہر نکل گئے۔قاری صاحب نے خادم کو پھل اور خشک میوے دوبارہ سے رکھنے کو کہا۔

ایک دوسرے خادم کو انہوں نے اشارے سے پاس بلا کر کہا:

'' تم فوراً بازار جاؤ اور کرمو حلوائی کی دکان پر جتنی بھی برفی ہے سب لے آؤ۔ ہمارے آنے والے مہمان کو کرمو حلوائی کی برفی بہت پسند ہے''۔

خادم یہ سنتے ہی حکم کی بجا آوری کے لئے نکل گیا۔ہیلی کاپٹر کی لینڈنگ میں زیادہ وقت نہیں تھا۔انہوں نے اپنے دو مسلح محافظوں کو ساتھ لیا اور مدرسے کے عقب میں واقع کھلے میدان کی طرف چل دیے۔میدان کی ابتدا میں تعمیر شدہ ایک ستون پر آویزاں ایک بکس کو کھول کر انہوں نے ایک بٹن کو دبایا۔بٹن دباتے ہی ستون پر ایستادہ بلند و بالا اینٹینے پر ایک سرخ روشنی جلنے بجھنے لگی۔وہ وقت گزاری کے لئے جہاد افغانستان کے واقعات محافظوں کو سُنا کر اُن کا دل گرمانے لگے۔

ابھی قاری صاحب اپنی جہادی داستان کے درمیان میں ہی تھے کہ محافظ کے کندھے پر ٹنگے وائرلیس سے سگنل کی آوازیں آنے لگیں۔محافظ نے وائرلیس سے منسلک ہیڈفون قاری صاحب کو دیا۔قاری صاحب نے مخصوص کوڈ دہرا کر بتایا کہ ہیلی پیڈ لینڈنگ کے لیے تیار ہے۔کچھ دیر بعد فضا میں ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ گونجنے لگی۔اِس اڑنے والی فولادی مشین کے نیچے لگی ہوئی سرچ لائٹ سے مدرسے کا میدان روشن ہو گیا تھا۔ہیلی کاپٹر نے مدرسے کے اوپر ایک چکر لگایا اور مقررہ جگہ پر اُتر گیا۔

ہیلی کاپٹر کا دروازہ کھلا، پہلے دو مسلح فوجی باہر آئے جو پوزیشن لے کر کھڑے ہو گئے۔قاری صاحب نے ہیلی کاپٹر کے نزدیک آنے کی کوشش کی تو اُن کی دستار پنکھوں کی تیز ہوا سے پرے جا گری۔اُن کا محافظ سرعت کے ساتھ دستارِ مبارک کو اُٹھا کر لے آیا۔قاری صاحب نے جلدی جلدی دستار دوبارہ باندھی۔ہیلی کاپٹر کا پنکھا آہستہ آہستہ تھم گیا۔مہمانوں میں سب سے پہلے باہر آنے والی ہستی ملا عمیر کی تھی جو اپنی ایک آنکھ

کی وجہ سے دور سے ہی نمایاں تھے۔ اُن کے پیچھے وفاقی وزیر داخلہ نذیر اللہ خان جابر تھے، جبکہ آخر میں کچھ اور افسران باہر آئے۔

ملا عمیر نے بہت گرمجوشی سے قاری صاحب کو گلے لگایا۔ وہ اپنے اُستاد سے مل کر بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

قاری صاحب نے مُلا عمیر کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا:

''آپ کو شہر راجن پور اور یہ مدرسہ خوش آمدید کہتا ہے''۔

ملا عمیر نے جواباً کہا:

''بہت مہربانی، آپ کا یہ حقیر طالب علم اپنے اُستادِ مکرّم سے مل کے بہت خوش ہوا ہے''۔

وزیر داخلہ دونوں ہاتھ وا کیے قاری صاحب کی طرف بڑھے، قاری صاحب کا چھریرا بدن جنرل صاحب کے لحیم شحیم وجود میں چھپ گیا۔ قاری صاحب نے ان سے گلے ملنے کے بعد دیگر مہمانوں کو گلے لگایا۔ یہ سب افراد قاری صاحب کی سربراہی میں حجرُے کی طرف بڑھ گئے۔

جنرل صاحب نے دو نئے افسران کا قاری صاحب سے یوں تعارف کروایا:

''ہمارے قاری سفیان جہادِ افغانستان بلکہ جہادِ پاکستان کے روحِ رواں ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں قاری صاحب سے بڑا محبِّ وطن نہیں دیکھا۔ دیکھو! ہمارے پاکستان کے چار صوبے ہیں اور قاری صاحب کی بھی چار بیویاں ہیں، ہر صوبے سے ایک بیوی اور ہمارے قاری صاحب چاروں صوبوں کی زبانیں روانی سے بولتے ہیں''۔ جنرل صاحب نے یہ جملہ ہنستے ہوئے خاص فوجی لہجے میں کہا۔

مُلا عمُیر نے کچھ اس طرح جنرل صاحب کے مزاح کا جواب دیا:

''خوب! اچھا ہے کہ پاکستان میں اور صوبے نہیں بننے والے، ورنہ قاری صاحب کو اور شادیاں کرنا پڑ جائیں گی۔۔۔ جبکہ اسلام ایک وقت میں چار سے زائد کی اجازت نہیں دیتا''۔

سب افراد مُلا عمُیر کی حاضر جوابی پر ہنسنے لگے۔ یہ تمام مہمان قاری صاحب کی رہنمائی میں اُن کے حجرے کی طرف بڑھنے لگے۔ ایک بڑے رقبے اور دو منزلوں پر مشتمل اس عمارت کو قاری صاحب حجرہ ہی کہتے تھے۔ قاری صاحب مہمانوں کے کمرے کے دروازے پر آ کر رُک گئے۔ انہوں نے مُلا عمُیر کو

تعظیماً پہلے اندر داخل ہونے کو کہا۔ مُلا عمیر مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے، ان کی تقلید میں دیگر افراد ایک ایک کر کے اندر آ گئے۔ سب سے آخری میں قاری صاحب اندر آئے اور اپنی مسند پر مُلا عُمیر کو بیٹھنے کی گزارش کی۔

مُلا عمیر نے اُن کی درخواست کو رد کرتے ہوئے کہا:

''مجھے معاف کیجئے! میں آج بھی آپ کا شاگرد ہوں، اپنے اُستاد کی مسند پر بیٹھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا ہوں''۔

قاری صاحب نے مُلا عمیر کی طرف بہت شفیق نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا:

''آپ کو ہم سب نے اپنا امیر مان لیا ہے۔ ابھی کچھ ہی دیر میں مجھ سمیت تمام اساتذہ اکرام آپ کی بیعت کرنے والے ہیں۔ اِسلام میں امیر المومنین کا رُتبہ اللہ اور رسول کے بعد سب سے بڑا ہے۔ برائے مہربانی آپ اس مسند پر تشریف رکھیں''۔

مُلا عمیر اپنے اُستاد کے استدلال کے آگے ہتھیار ڈال کر اُن کی مسند پر جلوہ افروز ہو گئے۔ اُن کے تشریف رکھنے کے بعد تمام افراد اپنی اپنی جگہ پر حسب مراتب بیٹھ گئے۔ قاری صاحب نے مُلا عمیر کے دائیں جانب اور جنرل صاحب نے بائیں جانب نشت سنبھال لی۔ قاری صاحب نے مُلا عمیر سے درخواست کرتے ہوئے کہا:

''جناب امیر! آپ اپنی دعا سے آج کی اِس اہم نشت کا آغاز کیجئے''

یہ سنتے ہی مُلا عمیر نے ہاتھ اٹھا کر دُعا مانگی:

''اے میرے اللہ! ہم نے تیری راہ میں سر سے کفن باندھ لیا ہے۔ کفار، یہود و نصاریٰ کی سازشوں سے افغان جہاد کا ثمر ایرانی اور ہندوستانی ایجنٹوں کی جھولی میں جا گرا ہے۔ کافر و زندیق روس نے کابُل میں اب امریکیوں کے ساتھ مِل کر گٹھ جوڑ کرنا شروع کر لیا ہے۔

اے میرے اللہ! ہمیں کابُل کو کفار و منافقین کے کاسہ لیسوں سے آزاد کرانے کی توفیق عطا فرما''۔

دعا مانگنے کے بعد مُلاّ عمیر اپنے دونوں ہاتھوں کو منہ پر پھیر کر داڑھی کو کھجانے لگے۔ قاری صاحب کے اشارے پر ایک خادم نے سب کی پیالیوں میں گرم گرم قہوہ انڈیلنا شروع کر دیا۔ جب وہ سب کو قہوہ پیش

کر چکا تو قاری صاحب نے اُسے کمرے سے باہر جانے کو کہا۔

خادم کے باہر جانے کے بعد جنرل صاحب نے ایک چھوٹے بالوں والے آدمی کا تعارف کراتے ہوئے کہا:

''یہ کرنل ولید ہیں۔ انہوں نے کرنل آفریدی کی جگہ کل ہی مغربی کمان کی ذمہ داری سنبھالی ہے''۔

کرنل ولید نے قاری صاحب کی بات کے جواب میں صرف مسکرانے پر ہی اکتفاء کیا۔

قاری صاحب نے کرنل ولید کی طرف دیکھ کر کہا:

''آپ کے ہاتھوں تربیت یافتہ مجاہدین نے خوست کے خونی محاذ پر فتح حاصل کی تھی۔ انسان تو انسان جس طرح سے آپ نے چند ماہ میں امریکی خچروں کو افغانستان کے پُر پیچ پہاڑی رستوں پر چلنے کی تربیت دی تھی وہ فوجی تاریخ میں بھلائی نہ جاسکے گی، اب جہاد افغانستان ایک نئی کروٹ لینے کو ہے''۔

قاری صاحب نے جنرل صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے مزید کہا:

''آپ حکم کیجئے، ہم جہاد کی راہ میں کس کام آسکتے ہیں؟''۔

جنرل صاحب نے کہا:

''مجاہدین کا ایک بڑا حصہ جہاد کے مقصد سے منحرف ہو چکا ہے۔ اب نیا خون ہی جہاد کو اس کی منزل کی طرف گامزن کر سکتا ہے۔ آپ کراچی سے کوئٹہ تک طالب علموں کو ایک نئی جہادی تحریک کے لئے متحرک کریں۔ ان طلباء کو بنیادی کورس کرایا جائے گا جس سے وہ ایک کمان کی سربراہی میں لڑنے کے قابل ہوسکیں گے''۔ جنرل صاحب نے مذکورہ بالا بات کہنے کے بعد کرنل صاحب کو اشارہ کیا۔ جنرل صاحب کا اشارہ پاتے ہی کرنل ولید نے اپنے ماتحت افسر کو نقشہ زمین پر بچھانے کو کہا۔ کرنل صاحب نے نقشے پر اپنی چھڑی سے اشارہ کرتے ہوئے قاری صاحب کو جنگ کی حکمت عملی کی یوں وضاحت کی:

''ملاراکٹی اور چند اور جنگجو سرداروں نے ازبکستان سے خام کپاس لے کر آنے والے پاکستانی ٹرکوں کو قبضے میں لے کر عملے کو یرغمال بنالیا ہے وہ لوگ عملے کو بھاری تاوان لئے بغیر چھوڑنے پر آمادہ نہیں۔ حکومت پاکستان کے پاس اب قانونی اور اخلاقی جواز ہے کہ ہم اپنے ہم وطنوں کو افغانستان میں گھس کر آزاد کرائیں۔ پھر بھی مناسب نہیں کہ ہم اپنی باوردی افواج کو وہاں بھیجیں۔ مدرسوں کے تربیت یافتہ طلباء ہماری آرمی کے

کمانڈوز کے ساتھ عملے کو چھڑانے کی کاروائی کریں گے۔ ہمارے کمانڈوز بھی مجاہدین کے حلیے میں طلباء کی اس آپریشن میں رہنمائی کریں گے''۔

قاری صاحب نے کرنل ولید کی وضاحت سن کر کہا:

''ماشااللہ!! منصوبہ بہت اچھا ہے۔ ہم آپ کو جذبہ جہاد اور سرفروشی کے جذبہ سے سرشار طلباء فراہم کرنے کے علاوہ اور کیا خدمت کر سکتے ہیں''۔ کرنل ولید نے قاری صاحب کے سوال کے جواب میں کہا:

''آپ کشمیر سے اپنے مجاہدین کو واپس بلانا شروع کر دیں۔ ہم کو نئے تربیت یافتہ طلباء کے ساتھ تجربہ کار مجاہدین کی ضرورت ہے۔ اِس آپریشن کے بعد ہم آپ کو ایک مجاہد کے بدلے چار مجاہد جہادِ کشمیر کے لئے فراہم کریں گے''۔

قاری صاحب نے بہت پر جوش لہجے میں یوں جواب دیا:

''کرنل صاحب! سب مجاہدین آپ کے لئے حاضر ہیں۔ ہمارے لئے اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے سرحدوں کی کوئی حد نہیں۔ ہمارے مجاہد اللہ کی رضا کے لئے دُنیا کے کسی بھی گوشے میں لڑنے اور اپنے خون کا نذرانہ پرورگار کے حضور میں پیش کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار ہیں''۔ ''ماشاء اللہ!!! ماشاء اللہ!!! جنرل صاحب نے بات میں دخل دیتے ہوئے کہا اور مُلا عمیر کی طرف دیکھتے ہوئے یوں گویا ہوئے:

''اب میں جناب مُلا عمیر کی اجازت سے کچھ کہنا چاہوں گا''

مُلا عمیر نے رضامندی میں سر ہلا کر اجازت دیدی۔

جنرل صاحب نے کہا:

''قندھار کے گرد و نواح میں جنگجو سرداروں سے پاکستانی ٹرکوں اور عملے کو چھڑانا تو بائیں ہاتھ کا کھیل ہو گا۔ اصل جنگ قندھار شہر پر قبضے کی ہوگی۔ ہم اللہ کے حکم اور مجاہدین کی قربانیوں سے وہاں جناب مُلا عمیر کی قیادت میں ایک ایسی اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لائیں گے کہ جس کی مثال اس روئے زمین پر نہ مل سکے گی۔''

یہ سُن کر مُلا عمیر کا چہرہ فرطِ جذبات سے سُرخ ہوگیا۔

جنرل صاحب نے اپنی حکمت عملی کو مزید عیاں کرتے ہوئے کہا:

''قندھار میں قدم جمانے کے بعد انشاء اللہ ہمارا اگلا قدم کابل ہوگا۔ ہم وہاں سے ہندوستان اور ایرانی کو تپلی حکومت کو اُکھاڑ پھینکیں گے''۔ جنرل صاحب کے اس پر جوش بیان پر سب نے با آواز بلند انشاء اللہ کہا۔

قاری صاحب نے پر جوش انداز میں کہا:

''اللہ کو منظور ہوا تو کابل اور کشمیر کی فتح ہمارے بچوں کے ہاتھوں ہی ہوگی۔''

یہ کہنے کے بعد قاری صاحب نے مُلا عمیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''آپ کی اجازت ہو تو دیگر اساتذہ اکرام اور مدرسے میں موجود مجاہدین کے کمانڈرز کو بیعت کے لئے بلا لیا جائے۔''

جواباً مُلا عمیر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر کو تھوڑا سا جُھکا دیا۔ قاری صاحب نے انٹر کام پر خادم کو کتب خانے میں موجود تمام افراد کو بُلانے کا حکم دیا، اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے الماری کے اوپر رکھی ہوئی ایک تھالی کو خود اٹھایا اور اس تھالی کو انہوں نے مُلا عمیر کے سامنے رکھتے ہوئے کہا:

''جناب امیر! یہ آپ کے پسندیدہ کرُ موحلوائی کی بنائی ہوئی برفی ہے۔''

مُلا عمیر نے تازہ برفی کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھ کر تھالی کو جنرل صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

''جنرل صاحب! نوش فرمایئے ایسی لذیذ مٹھائی روئے زمین پر شاید ہی کہیں ملے''۔

جنرل صاحب نے مُلا عمیر کی پیشکش پر کہا:

''آپ کا حکم ماننا واجب ہے، ورنہ میرے بیوی بچوں نے میرا میٹھا کب کا بند کر رکھا ہے لیکن میرا وزن ہے کہ بڑھتے ہی جا رہا ہے۔''

سب افراد جنرل صاحب کی بات سُن کر بے اختیار ہنس پڑے۔ اسی دوران دیگر اساتذہ اکرام اور مجاہد کمانڈرز مہمانوں کے کمرے میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔ تمام مہمان بشمول مُلا عمیر اساتذہ کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ اساتذہ اور کمانڈرز نے باری باری تمام مہمانوں کو روایتی انداز میں گلے لگایا۔ اس عمل کے بعد تمام افراد بیٹھ گئے۔ سب کے بیٹھ جانے کے بعد قاری صاحب اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور اشارے سے مُلا عمیر سے اپنے خطاب کرنے کی اجازت چاہی۔ مُلا عمیر نے سر ہلا کر اجازت دی۔

بعد ازاں قاری صاحب نے کچھ اس طرح خطاب شروع کیا:

''آج ۱۷ اگست ہے، آج کے دن جہادِ افغانستان کے بانی مجاہدِ اعظم، جنرل ضیاء الحق کو یہود و نصاری کے ایجنٹوں نے شہید کر دیا تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ آج ہی کے دن ایک مجاہد باپ کا مجاہد بیٹا مُلا محمد عمیر ہمارے درمیان موجود ہے۔ روسی قابض فوجوں سے لڑتے ہوئے انہوں نے ایک آنکھ گنوا دی لیکن جہاد کی جو روشنی اللہ نے اِن کے قلبِ لطیف میں روشن کی ہے وہ ایک الاؤ کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ پاکستان اور افغانستان کے اکثر علماء اور مجاہدین نے جناب مُلا عمیر کے ہاتھ پر بیعت کر کے انہیں اپنا امیر مان لیا ہے۔

عزیز اساتذہ اکرام اور مجاہد ساتھیو!

ایک امیر کے لئے ایک ریاست کی بھی ضرورت ہوتی ہے جہاں وہ اپنے احکامات کو نافذ کر سکے، جہاں وہ اللہ کا نائب بن کر اس کے احکامات کا اجراء کر سکے۔ ہم سب نے دسیوں سال کے جہاد کے بعد افغانستان کو روسی زندیقوں سے آزاد کرا کے اسے ایک اسلامی مملکت بنایا، لیکن اپنوں کی بے وفائی اور دشمنوں کی سازش کی وجہ سے جہاد کا پھل کافروں کی جھولی میں جا گرا۔ کتنی بدنصیبی ہے کہ خون مجاہدوں کا بہا بچے اُن کے یتیم ہوئے اور کابل کا تخت ہندوستان اور ایران کے ایجنٹوں کے ہاتھ آ گیا۔ میرے مجاہد ساتھیوں، اب ہمارا ایک ہی مشن ہے وہ یہ کہ ہم کابل کو ایک بار پھر کفّار کے چنگل سے نکالیں''۔ یہ کہہ کر قاری صاحب مُلا عمیر کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئے اور اپنے دونوں ہاتھوں میں مُلا عمیر کا ہاتھ تھام کر کہا:

''میں قاری سفیان جناب مُلا عمیر کی بیعت کرتا ہوں، اُن کو اپنا امیر مانتا ہوں، اور آج سے اُن کا ہر حکم بجالانا میرا شرعی فریضہ ہے''۔ یہ کہہ کر قاری سفیان نے مُلا عمیر کے ہاتھ کو بوسہ دینے کے بعد اپنی آنکھوں سے لگایا۔ قاری صاحب کے بعد سب نے باری باری اسی طرح سے مُلا عمیر کے ہاتھ پر بیعت کی. بیعت کا عمل مکمل ہونے کے بعد مہمانوں کا کمرہ اسلام زندہ باد اور جہاد زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔

بیعت کا عمل مکمل ہونے کے بعد قاری صاحب نے مُلا عمیر سے گزارش کی کہ وہ حاضرین سے خطاب کریں۔ مُلا عمیر نے قاری صاحب کی دعوت خطاب کو قبول کیا اور اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر یوں خطاب کیا:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ نے سورۃ النساء کی آیت نمبر ۹۵ میں وضاحت سے فرما دیا ہے کہ

''وہ جو جہاد نہ کریں وہ مجاہدوں کی برابری نہیں کر سکتے''۔

میرے مجاہد ساتھیو! آپ اللہ کے منتخب افراد میں سے ہیں جن کو اللہ نے اپنے دین کو اس روئے زمین پر پھیلانے کے لئے منتخب کیا ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہمارا جہاد افغانستان میں اسلام کے نفاذ کے بعد ختم ہو جائے گا۔ افغانستان میں اسلام کے نفاذ کے بعد تو ہمارا اصل جہاد شروع ہو گا۔ جب ہمارا جہاد شروع ہو گا تو دنیا کے تمام مظلوم افغانستان میں عدل و انصاف کے مناظر دیکھیں گے...

وہ سب آپ کو پکاریں گے آپ کو صدا دیں گے کہ آؤ! اور ہمارے ملکوں کے ظالم حکمرانوں سے ہمیں آزاد کراؤ!... ہمارے بچوں کو اس فحش مغربی نظام تعلیم سے آزاد کراؤ! کہ جس نظام نے ہمارے بچوں کے اذہان کو غلام بنا دیا ہے۔

ہم اللہ کے حکم سے افغانستان میں سب سے پہلے مغربی تعلیم کو بند کر کے، تمام اسکولوں اور یونیورسٹیوں کو اسلام کے مطابق ڈھال

دیں گے۔ افغانستان میں ایک ایسا نظامِ انصاف نافذ کریں گے کہ جس کی مثال اس زمین پر نہ ہو گی۔ جن مقدمات کا فیصلہ مغربی نظامِ انصاف سالوں میں کرتا تھا، ہمارے قانون ان مقدمات کا فیصلہ چند گھنٹوں میں کریں گے۔ میں آپ سب کے سامنے عہد کرتا ہوں کہ میں کسی محل میں نہیں رہوں گا بلکہ مٹی کے بنے گھر میں زمین پر اسی طرح بیٹھوں گا کہ جیسے آج آپ سب کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں۔ آپ سب مل کر مجاہدین کی فتح کے لئے دُعا کریں۔ اللہ ہم سب کو کامیابی سے نوازے۔ آمین''۔

مہمان خانے کے در و دیوار دوبارہ فتح کے نعروں سے گونجنے لگے۔

(۶)

اب (ساون) خالد کے مہمانداری کے دن ختم ہو چکے تھے۔ آج اُس کی تعلیم کا پہلا دن تھا۔ اساتذہ نے طے کیا تھا کہ پہلے سال اُسے اردو پڑھنا لکھنا اور بولنا سکھائی جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی اُسے بنیادی عربی کی تعلیم دی جائے گی تا کہ وہ عبادات با آسانی بجالائے۔ مُلّا فضل اللہ سواتی کی ذمہ داری تھی کہ وہ خالد کوعربی زبان کی تعلیم دیں۔ مُلّا سواتی طلباء کے درمیان جلاد کے نام سے مشہور تھے۔ وہ ذراسی ناراضگی پر طالب علم کی کھال اُدھیڑ ڈالتے تھے۔ انُ کی سفید پیشانی پر سیاہ رنگ کا سجدے کا نشان اُن کوتمام اساتذہ میں ممتاز کرتا تھا۔ مُلا سواتی طلباء کو درس دینے کے ساتھ اکثر اپنے ذاتی کام مثلاً کپڑے پریس کروانا، حجرے کی صفائی وغیرہ کے لیئے استعمال کرنا معیوب نہیں سمجھتے تھے، انُ کی سخت طبیعت اپنی جگہ لیکن وہ اساتذہ کے درمیان بہت قابل مانے جاتے تھے۔

خالد نے اپنے پہلے دنِ کا سبق دن بھر میں یاد کر کے اپنی ذہانت کا ثبوت دے دیا تھا۔ پہلے ہی دن اُسے وضو کرنے کا طریقہ بھی آ گیا تھا۔ شام کواُس کی درس سے چھٹی ہوئی تو اُسے بھوک ستانے لگی۔ ابھی کھانے میں کافی وقت تھا۔ وہ سوچ کر کمرے کی طرف چل پڑا کہ اس کے کشمیری ساتھیوں کی الماری میں کچھ نہ کچھ کھانے کوضرور ہوتا ہے۔ وہ کمرے میں آیا تو اُس نے دیکھا کہ اسُ کے ساتھی ایک موٹے سے نان پر مکھن چپڑ رہے تھے، یہ منظر دیکھ کر اسُ کی بھوک اور تیز ہوگئی۔ اس کو کمرے میں آتا دیکھ کر ایک ساتھ نے کہا:

''آؤ ساون... اوہ، اوہ، معاف کرنا! خالد... آؤ! آؤ! اچھے موقع پر آئے ہو، دیکھو! یہ کشمیر کی خاص، گڑ سے بنی روٹی ہے۔ ہمارے گاؤں سے آنے والا ایک طالب علم لے کر آیا ہے۔ چائے بھی تیار ہے آؤ یہاں بیٹھ جاؤ۔ ساتھی طالب علمِ نے یہ بات اپنے پہلو میں خالد کیلئے جگہ بناتے ہوئے کہی۔ میٹھی روٹی کا سُن کر اُسے اپنی ماں یاد آ گئی جو گڑ کے موسم میں خاص طور سے میٹھی روٹی اور میٹھے چاول اس کے لئے بناتی تھی۔

جب بھی ان کی کٹیا میں یہ روٹی یا گڑ کے چاول بنتے تو اسے لگتا تھا کہ جیسے کسی تہوار کا دن ہو۔

خالد کو سوچ میں گُم دیکھ کر ایک ساتھی نے پوچھا:

''خالد کس خیال میں گُم ہو؟''۔

ساون نے کہا:

''وہ...وہ...ذرا گاؤں یاد آ گیا تھا''۔

ساتھی نے جواب میں کہا:

''خالد! اب تم گاؤں کو بھول جاؤ۔ اب یہ جگہ ہی تمہارا نیا گاؤں ہے۔ شروع شروع میں مجھے بھی گاؤں بہت یاد آتا تھا پر اب گاؤں کی تصویر دماغ میں دھندلا سی گئی ہے''۔

ایک دوسرے طالب علم نے گفتگو میں دخل اندازی کرتے ہوئے کہا:

''باتیں چھوڑو، چائے ٹھنڈی ہو جائے گی''۔

خالد تو ویسے ہی بھوکا تھا۔ مکھن چپڑی میٹھی روٹی کے ایک لقمہ اور چائے کی ایک چسکی سے اس کی آنکھوں میں روشنی آ گئی۔

کھانے کے دوران خالد نے اپنے کشمیری ساتھی سے پوچھا:

''کیا تمہارے کشمیر میں بھی اتنی ہی گرمی ہوتی ہے''۔

ساتھی نے جواب دیا:

''سارا کشمیر تو میں نے نہیں دیکھا پر ہمارے پہاڑی گاؤں میں کبھی گرمی نہیں ہوئی''۔

ساون نے پھر سوال کیا:

''تم یہاں کی گرمی کیسے براشت کرتے ہو!. تم کو تو سردی کے موسم کی عادت ہوگی''۔

ساتھی نے کہا:

''میں نے قاری صاحب سے کہا تھا کہ مجھے کشمیر کے مدرسے میں ہی پڑھنے دیں پر ان کا کہنا تھا کہ ایک مجاہد کے جسم کو ہر موسم کو برداشت کرنے کی تربیت سے گزرنا چاہیئے۔ ویسے اب مجھے گرمی کی بھی عادت ہوگئی ہے''۔ ''تم اور کچھ بتاؤ کشمیر کے بارے میں ـ ـ ـ ہمارے پڑوس کی کٹیا میں ٹی وی اور وی سی آر تھا۔ ـ ''

لوگ اُسے بیٹری سے چلاتے تھے میں نے ایک فلم دیکھی تھی۔ کسی نے بتایا تھا کہ وہ فلم کشمیر میں بنی تھی۔ کیا تمہارا ملک سچ میں اتنا خوبصورت ہے؟''۔ یہ سوال خالد نے بہت تجسس بھرے انداز میں کیا۔۔

ساتھی نے جواب میں کہا:

''خوبصورت تو ہے لیکن چپے چپے پر ہندوستانی فوجی اپنی بندوقیں تانے کھڑے رہتے ہیں۔ نوجوان لڑکوں کو چن چن کر مارا

جارہا ہے۔ وہاں کے قبرستان شہیدوں کی قبروں سے بھر چکے ہیں۔ خود میری بہن کو مجاہدوں کی مدد کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اُس وقت میں چھوٹا تھا۔ میری بہن کبھی گھر واپس نہ آئی۔ سمجھ داری کی عمر آنے سے پہلے ہی میں نے بندوق اٹھانے کا فیصلہ کرلیا تھا''۔ یہ سب بتاتے ہوئے اس کا لہجہ سپاٹ اور جذبات سے عاری تھا۔ ایک دوسرے ساتھی نے یہ کہتے ہوئے موضوع بدلا:

''خیر! ان باتوں کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ ملا سواتی نے تم کو درس کے دوران مارا تو نہیں؟

خالد نے کہا:

''بالکل نہیں، بہت محبت سے درس دیا اور خوشی سے بار بار میری پیٹھ سہلائی البتہ کچھ لڑکوں کی بڑی ٹھکائی ہوئی اور بہت سوں کو مرغا بنایا گیا''۔ ایک طالب علم نے کہا:

''ہاں مُلا سواتی کا پتہ نہیں چلتا کب کسی پر مہربان ہوجائے اور کب کسی پر غضبناک''۔

''میرا خیال ہے اب ہم لوگ تیار ہوجائیں، مغرب کی اذان کا وقت ہونے والا ہے۔ خالد تم بھی تیار ہوجاؤ! بس جیسے جیسے سب نماز پڑھیں تم بھی ویسے ہی کرنا، تم کو بھی برابر ثواب ملے گا۔ مغرب کی نماز کے بعد کھانا کا وقفہ ہوگا۔ اس کے بعد قاری صاحب کا درس، اُس کے فوراً بعد عشاء کی نماز ہوگی''۔

یہ تمام باتیں ایک ہی سانس میں ایک دوسرے ساتھی نے چائے کے برتن اٹھاتے اٹھاتے کہیں۔ کچھ دیر میں یہ ایک کمرے کے باسی ملکر مسجد کی طرف چل دیئے۔

اب ساون جو کہ خالد بن چکا تھا ایک نئے طور کی زندگی گزار رہا تھا۔ صبح سویرے بیدار ہوکر غسل کرکے باجماعت نماز ادا کرنا، دوڑ میں حصہ لینا اور ناشتہ کرکے درس میں جا کر بیٹھنا اس کا معمول بن گیا تھا۔ ملا سواتی اسے بہت توجہ سے پڑھاتے تھے۔ اب اس نے اردو پڑھنا لکھنا سیکھ لی تھی، لیکن مدرسے میں موجود کتابیں

تھیں وہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ اس کے ساتھی بتاتے تھے کہ انہوں نے بچپن میں ٹارزن کی کہانیاں پڑھی تھیں، اُنہیں پڑھنا آسان ہوتا تھا۔ ٹارزن بہت بہادر تھا اور درختوں کی ڈالیوں پر چھلانگیں مارتا ہوا جنگل میں بہت تیزی سے سفر کرتا تھا۔

اُسے نمازِ عشاء کے دوران خیال آیا کہ کیوں نہ مُلا سواتی سے پوچھے، شاید ان کے پاس ٹارزن کی داستان کی کتابیں ہوں!

عشاء کی نماز ختم ہونے کے بعد، مسجد سے مُلا سواتی کے ساتھ باہر نکلتے ہوئے خالد نے اُن سے کہا:

''حافظ صاحب، آپ سے ایک بات پوچھنا ہے''۔

مُلا سواتی نے خالد کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا:

''پوچھو بچہ! کیا بات ہے؟''۔

خالد نے جھجکتے ہوئے پوچھا:

''کیا آپ کے پاس ٹارزن کی داستانوں کی کتاب ہے؟

مُلا سواتی نے حیرت سے خالد کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا:

''یہ ٹارزن کون صاحب ہیں! اسلامی تاریخ میں ان کا نام کبھی نظر سے نہیں گزرا''۔

اس دوران یہ دونوں چلتے چلتے مُلا سواتی کے حجرے کے قریب آ چکے تھے۔

خالد نے اُن کو وہ سب کچھ ٹارزن کے بارے میں بتایا جو اُس نے اپنے ساتھ طالب علم سے سُنا تھا۔

ٹارزن کی صفات سن کر مُلا سواتی نے کہا:

''بچہ! یہ کوئی گھڑی ہوئی داستان لگتی ہے اور یہ ٹارزن کوئی اسلامی نام بھی نہیں۔ اسلام میں جھوٹی اور گھڑی ہوئی داستانوں کی سخت ممانعت ہے۔

چلو! میں تم کو ایک بہت اچھی کتاب دیتا ہوں، اُس کا نام ہے ''داستان ایمان فروشوں کی''۔ یہ کتاب مجاہدوں کی فتوحات کے واقعات پر مبنی ہے۔ اُس کو پڑھنے سے تمہاری نوجوان رگوں میں دوڑتا ہوا خون اور تیز ہو جائے گا''

مُلا سواتی اپنے حجرے تک پہنچ گئے تھے۔ یہ حجرے میں اکیلے ہی رہتے تھے۔ سب نے سُن رکھا تھا کہ

اِن کا خاندان سوات کے کسی گاؤں میں رہتا ہے۔ انہوں نے کرُتے کی جیب سے چابی نکال کر تالے میں گھمائی۔ دروازہ کھولنے کے بعد اسے اندر سے بند کرلیا۔ خالد یہاں پہلے بھی کئی بار انُ کے حجرے کی صفائی کرنے آچُکا تھا۔ انہوں نے کتابوں کی الماری سے ایک کتاب منتخب کرکے اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا:

''بچہ! میں بہت تھک گیا ہوں پہلے ذرا اپنے استاد کا بدن دبا دو''۔

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، مُلا سواتی اکثر طلباء سے اپنے سر کی مالش کرواتے اور انُ سے بدن دبواتے تھے۔

مُلا سواتی نے ایک شیشے کے پیالے کی طرف اشارہ کرکے کہا:

''بچہ! وہ رہا تیل کا پیالہ''، یہ کہنے کے بعد وہ اپنا کرُتا اُتار کر دوسرے کمرے میں گئے اور دھوتی باندھ کر چارپائی پر آکر بیٹھ گئے۔

خالد نے شیشے کے پیالے سے تیل لے کر انُ کے سر میں ڈالنا شروع کردیا۔ جب بال اچھی طرح تیل سے تر ہوگئے تو اس نے ہلکے ہلکے ملا سواتی کے سر پر ٹکور کرنا شروع کردی، بالکل اسی طرح جیسے اس کی ماں کبھی کبھی اس کو پکڑ کر زبردستی اُس کے سر کی مالش کرتی تھی۔

مُلا جی کو مالش سے کافی سرور آرہا تھا۔

انہوں نے خالد سے کہا:

''بچہ! تُو تو بہت اچھی مالش کرتا ہے۔۔ کِس سے سیکھی؟''

خالد نے جواب دیا:

''ماں سے حافظ صاحب!''

مُلا جی نے اب نئی فرمائش کرتے ہوئے کہا:

''چل اب ذرا میرے بدن پر مالش کر بڑا درد ہے آج کل''۔

یہ کہتے ہوئے وہ چارپائی پر کمر کے بل لیٹ گئے۔ خالد نے انُ کے بازوؤں پر تیل مل کر مالش شروع کی۔

اس کی نظروں کے سامنے ایک عجیب سا منظر تھا۔

چارپائی پر سفید گوشت کا پہاڑ پڑا ہوا تھا۔

مُلا جی کے وزن سے چارپائی بیضوی انداز میں دھنس گئی تھی۔

ان کے سفید چہرے پر موجود ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں نشاط انگیزی سے اور چھوٹی ہو گئی تھیں۔

سفید پیشانی پر سجدے کا سیاہ نشان کمرے کے نیم اندھیرے ماحول میں تیرگی کا حصہ بن چکا تھا۔

اسے مُلا جی کے فربہ عریاں بدن کو ہاتھ لگانے سے گھن سی آ رہی تھی لیکن اُس میں حکم عدولی کی ہمت نہ تھی۔

مُلا جی نے اُس کے ہاتھ کو پکڑ کر سینے کی طرف کر دیا تا کہ اُن کے سینے کا مساج کر سکے۔ خالد نے شیشے کے پیالے سے کچھ اور تیل لے کر اُن کے سینے پر ملا اور مالش شروع کر دی، کچھ ہی دیر میں مُلا جی نے اس کے ہاتھ کو پکڑ کر ناف کے نیچے کی طرف دھکیلا اور ساتھ ہی اپنی دھوتی کے بل کھول دیئے، اُن کا عضوِ تناسل قیام کی حالت میں آ چکا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ خالد اُن کے جسم کے دیگر اعضا کی طرح عضوِ تناسل کی بھی مالش کرے۔

اسی لمحے خالد کو شدید غصہ آیا اور اس نے اپنا ہاتھ مُلا جی کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ اس کا ہاتھ تیل سے تر ہونے کی وجہ سے با آسانی مُلا جی کی گرفت سے آزاد ہو گیا تھا۔ خالد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ قریب ہی رکھا شیشے کا پیالہ کھینچ کر مُلا جی کے سر پر دے مارا۔ اُن کی پیشانی سے خون کا ایک چشمہ پھوٹنا شروع ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر خالد کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ وقت ضائع کیے بغیر حجرے سے نکل گیا۔

باہر اندھیرا تھا اور یوں بھی مدرسے میں رات گئے کوئی شاذ و نادر ہی باہر نکلتا تھا۔ وہ تقریباً دوڑ لگائے ہوئے اپنے کمرے میں آ گیا۔

ایک ساتھی نے طالب علم نے اسے اندر آتے ہوئے دیکھا تو کہا:

''خالد تم کہاں رہ گئے تھے؟''

خالد نے ذرا سوچتے ہوئے جواب دیا:

''وہ... وہ میں ذرا فٹ بال کے میدان میں دوڑنے کی مشق کرنے چلے گیا تھا... پھر ذرا ستانے کے لئے وہیں بیٹھا رہا''۔

ساتھ طالب علم نے اس کے جواب پر یوں تبصرہ کیا:

''یار! تم کو دوڑنے کی مشق کی کیا ضرورت ہے! آج تک تُم سے آگے کوئی نہیں نکل پایا ہے''۔

خالد نے جواباً کہا:

''اسی لئے مشق ضروری ہے کہ مستقبل میں بھی کوئی آگے نہ نکل پائے''۔ یہ بات اس نے نئے طالب علم سے جبراً ہنستے ہوئے کہی۔

خالد کا ایک کشمیری ساتھی ہندوستانی سپاہیوں کے ہاتھوں ہندوستانی کشمیر میں جامِ شہادت نوش کر چکا تھا۔ دوسرا ساتھی افغانستان میں جہاد کرنے جا چکا تھا۔ اِن دونوں کی جگہ اب ایک پٹھان اور ایک سرائیکی طالب علم نے لے لی تھی۔ ابھی یہ لوگ باتیں ہی کر رہے تھے کہ دو آدمی اپنے کندھوں پر بوریاں لادے کمرے میں آئے اور پٹھان طالب علم کو مخاطب کر کے کہا:

''یہ سنبھالو! پوری چالیس کلاشنکوفیں ہیں۔ اِن کی صفائی کی ذمے داری آج تم لوگوں کی ہے اور سنو! خالد کو بھی رائفل کی صفائی کا کام سکھاؤ''۔ صبح سویرے صاف شدہ بندقیں لینے آؤں گا۔۔ یہ کہتے ہوئے دونوں آدمی فوراً ہی واپس چلے گئے۔

خالد نے یوں تو قاری صاحب کے محافظین کے ہاتھوں میں طرح طرح کے ہتھیار دیکھے تھے پر اس نے اپنے سامنے ہتھیاروں کا ڈھیر کبھی نہ دیکھا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ان ہتھیاروں کو دیکھ کر چمک آ گئی تھی۔ خالد کے نئے طالبِ علم ساتھی نے اس سے مفلر کو آنکھوں پر باندھنے کو کہا۔ خالد نے اُس کی آنکھوں پر مفلر مضبوطی سے باندھ دیا۔ ساتھی طالب علِم نے سامنے رکھی ہوئی کلاشنکوف کو اٹھا کر آنکھیں کھولے بغیر منٹوں میں کھول کر دوبارہ جوڑ دیا۔ خالد اس کی مہارت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ہتھیاروں کے اس کھیل نے اُس کے دماغ سے مُلا سواتی کا واقعہ محو کر دیا تھا۔

طالب علم ساتھی نے خالد کو حیران ہوتا دیکھ کر کہا:

''تم حیران نہ ہو۔ ایک روز تم بھی ماہر ہو جاؤ گے۔ چلو آج تمہارا پہلا سبق ہو جائے''۔

یہ کہہ کر اس ساتھی نے کلاشنکوف ہاتھ میں پکڑ کر اس کا میگزین نکال کر دکھایا۔ میگزین نکالنے کے بعد بولٹ کو دو دفع آگے پیچھے کر کے اس نے کلاشنکوف کو چھت کی طرف کر کے ٹریگر کو دبا دیا۔

ایک کلک کی آواز آئی۔

ساتھی نے خالد سے پوچھا:

''تم کو معلوم ہے یہ عمل میں نے کیوں کیا؟''۔

خالد نے کہا:

''نہیں معلوم''۔

ساتھی نے کہا:

''اپنی حفاظت پہلا سبق ہے اور یہی آخری سبق بھی۔ کیوں کہ اسلحے کے کھیل میں پہلی غلطی آخری غلطی ہوتی ہے''۔

ہمیں تسلی کرنا چاہئے کہ نالی میں کوئی گولی تو نہیں رہ گئی۔ خالد نے ایک دفعہ کے بتانے سے ہی رائفل کو کھولنا، اسے صاف کرنا اور پھر دوبارہ جوڑنا سیکھ لیا۔ اس نے بہت شوق سے ہتھیاروں کی صفائی میں حصہ لیا۔ صفائی کے عمل سے فارغ ہوتے ہوتے سونے کا وقت ہو گیا تھا۔ خالد نے اپنے ساتھی سے پوچھا:

کیا میں ایک کلاشنکوف کو اپنے پاس رکھ کر سو سکتا ہوں؟

''ہاں ہاں کیوں نہیں... اسلحہ مجاہدوں کا زیور ہے''۔

خالد نے ایک کلاشنکوف کو بستر میں رکھا اور خود برابر میں لیٹ گیا۔

وہ سوچنے لگا کہ:

''گاؤں کا وڈیرہ دو رائفلوں اور دو محافظوں کے ذریعے سارے گاؤں کو خوف میں رکھتا ہے..... اور آج اس کے کمرے میں ہتھیاروں کا انبار لگا ہوا ہے۔ اُس کے دماغ میں گاؤں کی زندگی، ماں پر ظلم وڈیرے کی دہشت کے مناظر یکے بعد دیگرے آتے رہے اور یوں وہ نیند کی آغوش میں جا پہنچا۔

علی الصبح مدرسے کے تمام طلباء و اساتذہ حسب معمول نماز فجر کے لئے مسجد میں جمع ہو چکے تھے۔ آج نماز فجر کی خاص بات یہ تھی کہ ایک طویل غیر حاضری کے بعد قاری صاحب امامت کے لئے موجود تھے۔ مدرسے کے ایک منتظم نے اعلان کیا کہ نمازِ فجر کے بعد سب نمازی مسجد میں موجود رہیں۔ قاری صاحب کوئی اہم بات بتانا چاہتے ہیں۔ یہ اعلان سُن کر خالد کے ہوش اڑ گئے تھے۔ اس کے دل کا چور کہہ رہا تھا کہ شاید

قاری صاحب سب کے سامنے اس کے جرم کی سزا کا اعلان نہ کریں۔ مُلا سواتی کوئی عام اُستاد نہیں تھے نجانے کتنے ہزاروں مجاہد انُ سے علمِ حاصل کر چکے تھے۔ خود مُلا عمیر بھی قاری سُفیان کے علاوہ مُلا سواتی سے عربی گرامر پڑھ چکے تھے۔

ساری نماز کے دوران خالد کے دلِ میں طرح طرح کے وسوسے آتے رہے۔ آج کی نماز خالد کے لئے بہت طویل ہوگئی تھی... اللہ اللہ کر کے نماز تمام ہوئی۔ نماز کے بعد قاری صاحب کے سامنے مدرسے کے ایک اہلکار نے مائیک لا کر رکھ دیا۔

قاری صاحب نے اپنا خطاب اس طرح شروع کیا:

''اللہ نے مجاہدین سے فتح کا وعدہ کیا ہے، میرے مجاہد نوجوانوں! میں آپ سب کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس نے اپنا وعدہ کتنی سُرعت سے پورا کیا ہے۔ کل رات ہمارے طالب مجاہدین مُلا عمیر کی قیادت میں قندھار کے مضافات میں پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے جب شمالی اتحاد کے ایرانی ایجنٹوں کو اپنے ٹینکوں کی بیرل سے ٹانگ کر پھانسی دینا شروع کی تو ایران کے یہ ایجنٹ قندھار شہر چھوڑ کر بھاگنا شروع ہو گئے۔ رات بھر کی معمولی لڑائی کے بعد اللہ نے مجاہدین کو اپنے وعدے کے مطابق نصرُت سے نواز دیا۔ بے شک وہ اپنے وعدے کو پورا کرتا ہے''۔

فتح کی خبر سُنتے ہی مسجد کے در و دیوار ہیجان انگیز نعروں سے گونجنے لگے:

کافروں کا ایک علاج...

الجہاد الجہاد۔

انقلاب انقلاب.... اسلامی انقلاب۔

کراچی تا خیبر..... مُلا عمیر رہبر۔

کابُل کی آزادی تک..... جنگ رہے گی، جنگ رہے گی۔

ایران کی بربادی تک..... جنگ رہے گی، جنگ رہے گی۔

کراچی تا کابل... طالبان طالبان۔

قاری صاحب نعروں کے رکنے کا تحمل سے انتظار کرنے لگے۔ نعرے رکے تو قاری صاحب نے کہا:

''کتنا عظیم ہے وہ رب جس نے قندھار کے ایک بوریا نشین کو امارت کی مسند پر بٹھا دیا۔ آپ سب کو یہ عظیم دن مبارک ہو''۔

پھر نعرے گونجے:

''ماشاللہ بھئی ماشاللہ..... ماشاللہ''

جب نعرے رکے تو قاری صاحب نے کہا:

''آپ سب ہمارے اُستادِ مکرم مُلا سواتی کی صحت کے لئے دعا کریں۔ وہ کل رات نقاہت کے سبب گرنے سے زخمی ہو گئے تھے۔ اِس وقت وہ اسپتال میں داخل ہیں۔ ان کی حالت خطرے سے باہر ہے، مزید یہ کہ آج شام فتح کی خوشی میں ہم سب ایک ساتھ کھانا کھائیں گے۔ میں نے مطبخ کے مسئول کو بکرے ذبح کرنے کو کہہ دیا ہے۔

قاری صاحب کے اس مختصر خطاب کو سن کر خالد کی جان میں جان آئی۔ قاری صاحب نے خوشی میں سب لوگوں سے گلے ملنا اور مبارکبادیں سمیٹنا شروع کریں۔

گلے ملنے کے دوران انہوں نے دیکھا کہ شیخ الحدیث شیخ سلیم اللہ خان ان سے کچھ کہنا چاہ رہے ہیں تو قاری صاحب نے شیخ صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''شیخ صاحب آپ شاید کچھ کہنا چاہتے ہیں؟۔ میں پیشگی معذرت خواہ ہوں کہ میں آپ سے ملے بغیر ہی کوئٹہ چلے گیا تھا''۔

شیخ صاحب نے متفکر انداز میں اس طرح جواب دیا:

''جی ایک اہم مسئلے پر بات کرنا ہے۔

آیئے ہم ذرا ایک پر سکون گوشے میں چل کر بیٹھتے ہیں''۔

یہ کہتے ہوئے قاری صاحب شیخ صاحب کا ہاتھ نہایت عقیدت سے تھامے ان کو مسجد کے ایک تنہا گوشے کی طرف لے چلے وہاں پہنچ کر قاری صاحب نے کہا:

''آیئے! شیخ صاحب! یہاں بیٹھیے!۔۔۔ بالکل تخلیہ ہے یہاں''۔

جب تک شیخ صاحب نہ بیٹھ گئے قاری صاحب تعظیماً کھڑے رہے۔

ان کے بیٹھنے کے بعد قاری صاحب ان کے برابر بیٹھ گئے اور کہا:

''اب فرمائیے! کیا مسئلہ درپیش ہے اور خادم آپ کے لئے کیا کرسکتا ہے؟''

شیخ صاحب نے جواباً کہا:

''اللہ نے مجاہدین کو ہر نعمت سے نوازا ہے''.....اور اب تو اقتدار اعلیٰ بھی ان کے دروازے پر دستک رہا ہے۔اس فقیر کو کوئی بھی ذاتی مسئلہ درپیش نہیں''۔

قاری صاحب کے چہرے پر تجسس کا رنگ نمایاں ہوتے جارہا تھا، انہوں نے بے تابی سے دریافت کیا:

''پھر کیا مسئلہ درپیش ہے حضرت؟!''

شیخ صاحب نے مُناسب الفاظ کے چناؤ کے لئے ایک ذرا توقف کیا اور پھر فرمایا:

''دارالعلوم کے آخری درجے کے کچھ طلباء بہت مدلّل انداز میں ابنِ رُشد کے افکار کا دفاع کررہے ہیں۔بعض اوقات تو ان کے دلائل کو رد کرنا میرے بس میں بھی نہیں رہتا۔نہ جانے یہ لوگ عقلیت اور فلسفہ کی راہ پر کیسے چل پڑے ہیں''۔

قاری صاحب نے یہ سن کر ہوں....کی آواز نکالی اور کہا:

''شیخ صاحب یہ بات تو بہت تشویش ناک ہے۔لگتا ہے کہ کوئی دین خالص میں ناقابل اعتبار عقلی دلائل کے ذریعے دراڑیں ڈالنے کی کوشش کررہا ہے''۔

شیخ صاحب نے لقمہ دیتے ہوئے کہا کہ:

''کوشش نہیں جناب! یہ سازش کامیابی کی طرف بڑھ رہی ہے۔کچھ طلباء نے نہایت ذہانت سے امام غزالی۔۔اللہ اُن پر اپنی رحمت کرے۔۔۔۔۔کے فلسفے پر ابن رُشد جیسے مُلحد کے خیالات کو ترجیح دی ہے۔

اللہ کی پناہ دارالعلوم میں افلاطون وارسطو جیسے لادینوں کا پرچار شروع ہوگیا ہے''۔

قاری صاحب کا چہرہ یہ سب کچھ سُن کر غصّے سے لال پیلا ہونا شروع ہوگیا تھا۔

قاری صاحب نے اپنے غصّے پر قابو پاتے ہوئے کہا:

''یہ بہت خطرناک بات ہے....ہمارے دشمن نے ہماری نظریاتی دیواروں میں نقب لگانا شروع کردی ہے۔آپ فکر نہ کریں شیخ صاحب!..میں جلد ہی انتہائی ضروری قدم اٹھاؤں گا''۔

قاری صاحب شیخ صاحب کو تسلی دینے کے بعد مزید یوں گویا ہوئے:

"شیخ صاحب! آپ فکر نہ کریں میں سراغ لگا ہی لوں گا کہ ہمارے دارالعلوم میں فلسفے اور عقل کے ناپاک جراثیم کون پھیلا رہا ہے.. آیئے! آپ ناشتہ میرے ساتھ حجرے میں ہی کیجئے اور اساتذہ کو بھی وہیں آنا ہے اور آپ میرے ساتھ ملا سواتی کی عیادت کے لئے بھی چلئے، قندھار کی فتح کی نوید آپ ہی ان کو سنایئے گا"۔

یہ دونوں حضرات گفتگو ختم کر کے اٹھ کھڑے ہوئے اور حجرے کی طرف چل پڑے۔

کئی روز تک مدرسے میں فتحِ قندھار کی خوشیاں منائی جاتی رہیں۔ ہر کوئی قندہار جانے کا آرزومند تھا تاکہ اسلامی امارت کی تشکیل میں حصہ لے کر اللہ کے حضور سرُخ رُو ہو سکے.

(۷)

خالد معمول کے مطابق عشاء کی نماز کے بعد سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ ابھی اس کی نیند کچی ہی تھی کہ کسی نے زور سے دستک دی۔ ایک ساتھی نے اٹھ کر دروازہ کھولا، شور سے خالد کی آنکھ بھی کھل گئی تھی۔ دروازے پر مُلّا سواتی مدرسے کے دو اہلکاروں کے ساتھ کمرے میں گھُس آئے۔ مُلّا جی کی پیشانی پر ایک موٹی سی پٹی بندھی ہوئی تھی جو خاصی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ مُلّا جی کو کمرے میں دیکھ کر خالد کے اوسان خطا ہو گئے۔ مدرسے کے اہلکاروں نے بغیر کسی اجازت کے کمرے کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ کمرے سے برآمد ہونے والی کتابوں کا مُلّا سواتی نے جائزہ لینا شروع کر دیا۔

ان تمام کتابوں میں سے مُلّا سواتی نے دو کتابوں کو ہوا میں لہرا کر خالد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''یہ دونوں کتابیں اسی زندیق کی ہوں گی''

ایک کتاب کا عنوان ''قصہ رستم و سہراب'' اور دوسری کتاب کا عنوان ''داستانِ امیر حمزہ با تصویر'' تھا۔

خالد کے ساتھی طالب علم نے کہا:

''حافظ صاحب یہ دونوں کتابیں میری ہیں''۔

مُلّا سواتی نے کہا:

''کیا تم کو معلوم نہیں کہ یہ فرضی پہلوانوں کی داستانیں کافر و ملحد شیعہ ایرانیوں کی ہیں''۔

تم نے ان کافروں کی پلید کتابوں کو مدرسے میں لا کر بڑا جرم کیا ہے.... یہ کتابیں تم تک کیسے آئیں؟''

ساتھی طالب علم نے ڈرتے ڈرتے کہا:

''یہ میرے دادا کی تھیں اور مجھے میرے والدِ محترم سے ورثے میں ملی ہیں''۔

مُلّا سواتی نے کہا:

"تمہارے دادا اور تمہارے باپ دونوں کو اندازہ نہ تھا کہ اُن کے گھر میں الحاد پھیلانے والی کتابیں ہیں۔
خیر! یہ کتابیں مدرسے کی طرف سے ضبط کی جاتی ہیں۔ یہ سب باتیں وہ ساتھی طالب علم سے کر رہے
تھے لیکن اُن کی نظریں بہت خونخواری سے خالد پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ خالد کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے
ہوئے ضبط کی ہوئی کتابیں بغل میں تھامے کمرے سے نکل گئے۔

مدرسے میں ہر کوئی مُلا سواتی کی چوٹ پر تبصرہ کر رہا تھا۔ کچھ طلباء کا کہنا تھا کہ اُن پر کچھ دنوں کے لئے
نماز موقوف ہو گئی ہے کیونکہ سجدہ نماز کا واجب رکن ہے اور مُلا جی کو عین سجدہ کرنے کے مقام پر چوٹ لگی ہے
۔ کچھ طلباء کا خیال تھا کہ اشارے سے سجدہ کیا جا سکتا ہے۔ اکثر طلباء کا خیال تھا کہ مُلا سواتی رمضان کے علاوہ
نفلی روزے بھی پابندی سے رکھتے ہیں اس لیے وہ کمزوری کا شکار ہو کر غش کھا کر گر پڑے تھے۔

الغرض یہ کہ جتنے منہ اور اتنی باتیں۔ خالد کو دوسرے طلباء سے معلوم ہوا کہ دارلعلوم میں موجود تمام طلباء
کے کمروں میں گھس کر اُن کی
کتابوں کی تلاشی لی گئی تھی۔ اس کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ بھلا کتابیں کسی کا کیا بگاڑ سکتی ہیں۔ اس کی ماں کہتی
تھی کہ کتاب کو ہمیشہ سر سے لگانا چاہیے کیوں کہ کتاب کا واسطہ سرسوتی دیوی سے ہے۔

قاری صاحب نے مُلا سواتی کو اپنے محافظ کے ذریعے آج شام کا کھانا ساتھ کھانے کا پیغام بھیجا۔ ان
دنوں مدرسے میں بڑی بڑی گاڑیوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ اِن دنوں قاری صاحب اہم شخصیات سے ملنے میں
بے حد مصروف رہتے تھے۔ مُلا سواتی عشاء پڑھنے کے بعد حجرے کی طرف روانہ ہو گئے۔ صحت یاب ہونے
کے بعد آج انہوں نے پہلی بار باجماعت نماز پڑھی تھی۔ اُن کا زخم بالکل مندمل ہو گیا تھا۔

لیکن ان کی پیشانی پر سجدے کے نشان کے بیچوں بیچ گلابی رنگ کی صلیب کا نشان ابھر آیا تھا۔ مُلا جی
حجرے میں آئے تو دسترخوان پر کھانا لگ چکا تھا۔ کمرے میں اِن کے علاوہ شیخ الحدیث بھی موجود تھے۔

قاری صاحب نے کھانے کے ساتھ گفتگو کا آغاز یوں کیا:

"آپ حضرات کو مبارک ہو! ہم نے سازش کا سراغ لگا لیا ہے۔
امام غزالی کے افکار اور آزاد عقلی خیالات کی ترویج کی کتابیں ایک سندھی بلوچ طالب علم نے طلباء میں
تقسیم کی تھیں"۔

شیخ الحدیث نے غصے سے بھرے لہجے میں دریافت کیا:

''کیا نام تھا اس خبیث کا؟''

قاری صاحب نے جواب دیا:

''فاضل مگسی''

مُلا سواتی نے بیچ میں دخل دیتے ہوئے کہا:

''وہ بد بخت شکل سے تو بالکل ہی بدھو لگتا ہے''۔

مُلا سواتی نے مزید بغیر وقفے کے کہا:

''اس بد بخت کو اس جرم کی سزا ملنا چاہیئے''۔

قاری صاحب نے اپنی پلیٹ میں مرغی کی ایک اور ٹانگ ڈالتے ہوئے کہا:

''آپ فکر نہ کریں، ویسے مجھے ایجنسی والوں نے ہمیشہ خبردار کیا ہے کہ یہ سندھی اور بلوچی پاکستان کے وفادار نہیں، ان کو ایک حد سے زیادہ نہ بڑھنے دینا... خیر! فاضل مگسی اس وقت بلوچستان کے ایک مدرسے میں ہے۔ وہ وہاں سے مجاہدین کے ایک گروپ کے ساتھ قندھار روانہ ہوگا. اللہ کو منظور ہوا تو اس کو وہیں قبر نصیب ہوگی''۔

مُلا سواتی نے اپنی پلیٹ میں مرغی سے نبرد آزما ہوتے ہوئے کہا:

''ہم ان ضبط کی جانے والی غیر اسلامی کتابوں کا کیا کریں؟''

قاری صاحب نے کہا:

''جیسے آپ حضرات کی مرضی! یہ مدرسہ آپ کا بھی ہے... میں کل دوبارہ کوئٹہ جا رہا ہوں. معلوم نہیں کب واپسی ہو!... ویسے خلیفہ اسلام کفار کی بے سروپا کتابوں کو نذرِ آتش کروا دیا کرتے تھے''۔

شیخ الحدیث نے بین السطور کہی جانے والی بات کو سمجھ کر سر ہلایا اور مسکرا دیئے۔ سب کھانا کھا چکے تھے، قاری صاحب نے انٹرکوم پر خادم کو سب کے ہاتھ دھلانے کے لئے کہا۔ وہ فوراً ہی شلفچی لے کر آ گیا۔ شیخ الحدیث اور مُلا سواتی کھانے کے فوراً بعد ہی جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کو قاری صاحب کی مصروفیات کا ادراک تھا۔

(۸)

برطانوی یونی ورسٹیز کے منتخب طلباء نے آج پاکستانی علاقوں کی ثقافتی اشیاء پر مشتمل عجائب گھر کا دورہ کیا تھا۔ اس دورے کا سب سے دلچسپ حصہ انڈس ویلی تہذیب کے ہزاروں سال قدیمی شہر کی تصوراتی سیر تھی۔ یہ شہر جدید چوبیس جہتی ٹکنالوجی کے ذریعے بسایا گیا تھا۔ تمام طلباء اِس تصوراتی شہر کی گلیوں میں چہل قدمی کرتے ہوئے ایسا محسوس کر رہے تھے کہ جیسے وہ واقعی اس دور میں پہنچ گئے ہوں۔ اس شہر کی سڑکیں سرخ اینٹوں سے تعمیر کی گئی تھیں۔ ہر گلی کے کونے پر کچرا جمع کرنے کا نظام موجود تھا۔ گلیوں کے دونوں کناروں پر گندے پانی کی نکاسی کے لئے نالیاں موجود تھیں جو کہ مٹی کے ٹائیلز سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ شہریوں کے نہانے کو ایک بڑا سویمنگ پُول موجود تھا۔

شہر میں اجناس کو ذخیرہ کرنے کا نظام بہت جدید تھا۔ اِن ذخیرہ گاہوں کو دریائی گھاٹوں کے نزدیک بنایا گیا تھا تا کہ اجناس کی رسد میں آسانی رہے۔ شہر کی تعمیر سے معلوم ہوتا تھا کہ وہاں کے شہری بہت مہذب اور خوشحال زندگی بسر کرتے تھے۔ اُس شہر کی سیر کے دوران، مویشی، اجناس ڈھونے کی گاڑیاں گھاٹ پر لنگر انداز کشتیاں، انجانی زبان میں کندہ مہریں دیکھنے کو ملیں مگر اس جدید شہر میں جنگی ہتھیاروں کا نام ونشان نہ تھا۔ یہ شہر ہندوستانی تہذیب کے قدیم ترین شہروں کے آثارِ قدیمہ میں سے ایک تھا۔ اس شہر کے مسحور کُن دورے کے بعد تمام طلباء حسبِ معمول ہاسٹل کے ہال میں جمع ہو چکے تھے۔ آج شام کی داستان گوئی کی مجلس میں پروفیسر صاحب کو بھی شرکت کرنا تھی۔ البرٹ نے اپنا ریڈر سنبھال لیا تھا تا کہ وہ داستان کا حصہ پڑھ سکے۔ طلباء کو پروفیسر صاحب کی آمد کا انتظار نہ کرنا پڑا، وہ معمول کے مطابق اپنے مقررہ وقت پر ہال میں آ گئے۔ اُن کے آتے ہی سوالات پوچھنے کے لئے کئی ہاتھ ایک ساتھ بلند ہو چکے تھے. پروفیسر صاحب نے ہال پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا:

"فلپ کا ہاتھ پہلے بلند ہوا تھا... ہاں فلپ کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

فلپ نے کہا:

''اتنی ترقی یافتہ تہذیب، اتنی پستی میں کیسے گرگئی؟''

پروفیسر صاحب نے ذرا ناراضی ہوکر فلپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''تم سے اتنے غیر واضح سوال کی امید نہ تھی''۔

خیر! مختصر جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں تا کہ داستان گوئی کی محفل میں رخنہ نہ پڑے۔ انڈس ویلی تہذیب کے اکثر آثار قدیمہ برطانوی ماہرین نے ڈھونڈے تھے۔ دراصل ہندوستانی معاشرہ تاریخ پر کم اور اساطیر پر زیادہ توجہ دیتا تھا۔ اُس معاشرے میں دیوتا اور دیویوں کی لوک مالائی داستانیں زیادہ اہم تھیں۔ دوسُری بات یہ کہ ہندوستان میں تاریخ کو معروضی انداز میں دیکھنے اور لکھنے کی روایت بھی نہ تھی۔ جہاں تک یہ بات ہے کہ بعد میں یعنی انگریزوں کے دور میں ہندوستانیوں کے سوچنے کا انداز کیوں نہیں بدل پایا...تو اس ضمن میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اس بات کے ذمے دار ہم ہیں، برٹش سرکار نے ہندوستان میں ایک مختلف قسم کی نوکر شاہی کی بنیاد ڈالی تھی۔ برٹش کالونیوں کی نوکر شاہی کا مقصد ایسے افسران پیدا کرنا تھا جو خود سے نہ سوچیں بلکہ صرف اور صرف اوپر سے آنے والے احکامات کو بجالائیں۔ مختصراً اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ نو آبادیاتی پس منظر میں تشکیل دیا جانے والا نظام آزادی کے بعد بھی تقریباً جوں کا توں رکھا گیا تھا''۔

پروفیسر صاحب نے سوزن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''اب تمہارا نمبر ہے، کیا سوال ہے تمہارا؟ برائے مہربانی مختصر اور جامع سوال پوچھنا۔

سوزن نے اپنی جگہ سے ذرا آگے آکر کہا:

''اتنے مہذب اور بظاہر بین الاقوامی تجارت میں سرگرم شہر کے آثار قدیمہ سے کوئی جنگی ہتھیار کیوں نہ ملے؟ کیا یہ لوگ عدم تشدد پر یقین رکھتے تھے؟ ان انڈس ویلی کے لوگوں کے مقابلے میں ہماری ایسٹ انڈیا کمپنی تو باقاعدہ مسلح تھی؟''

پروفیسر صاحب نے کچھ دیر سوچ کر یوں جواب دیا:

''یہ بات درست ہے، انڈس ویلی کے لوگ ہندوستان سے عراق یعنی اس دور کے بابی لون تک تجارت کرتے تھے۔ میرے خیال میں اجناس کی پیداوار، اُن کے ذخیرہ کرنے کی صلاحیت اور ان کی ضرورت مند اقوام تک بروقت ترسیل ہی انڈس ویلی کے لوگوں کا ہتھیار تھا۔ ہم انڈس ویلی کے تاجروں کا

تقابل ایسٹ انڈیا کمپنی سے نہیں کر سکتے! ایسٹ انڈیا کمپنی والے بازار میں طلب کے ہتھیار کے ساتھ سیاسی اور فوجی طاقت کو بھی تجارت میں کھلم کھلا استعمال کرتے تھے۔ اس کی ایک مثال نیل اور افیم کی جبری کاشت کروانا تھا۔ پرانا بمبئی تو بڑی حد تک افیم کی تجارت کی آمدنی سے ہی تعمیر ہوا تھا''۔

جمیلہ سب سے آخر میں بیٹھی ہوئی تھی، وہ اٹھ اٹھ کر اپنا ہاتھ بلند کرتی تھی کہ شاید پروفیسر صاحب نہ دیکھ سکے ہوں۔ جمیلہ سندھی اور سرائیکی زبان کی طالبہ تھی۔ اس کے دادا کا تعلق پاکستان کے صوبہ سندھ سے تھا جو اس خطے کی مکمل تباہی سے پہلے کسی طرح اپنے خاندان سمیت برطانیہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

پروفیسر صاحب نے جمیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''اب آخری سوال جمیلہ کا ہے... اس کے بعد ہم ناول کا باقی حصہ سنیں گے''۔

جمیلہ نے مختصر سوال یوں کیا:

''ناول کے ایک اہم کردار ساون نے جب مذہب تبدیل کیا تو اس کا نام کیوں تبدیل کیا گیا؟... لفظ ساون کا بظاہر اسلامی تعلیمات سے کوئی ٹکراؤ نظر نہیں آتا؟''۔

پروفیسر صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں زیرِ لب مسکراتے ہوئے جواب دیا:

''صدرِ اسلام میں جب کہ عرب جوق در جوق اسلام میں داخل ہو رہے تھے، کوئی مثال نہیں ملتی کسی نے نام تبدیل کیا ہو۔ یہاں تک کہ جب غیر عرب ایرانی لوگ مسلمان ہونا شروع ہوئے تو بھی نام بدلنے کا رواج نہ تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ ہندوستان کی تقسیم سے پہلے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان نفرتوں کو مختلف جہتوں میں بڑھاوا دیا گیا تھا اور غالباً دو مذاہب کے درمیان یہ نفرت انگیزی ہندوستان کی تقسیم کے لئے ناگزیر تھی۔ حد تو یہ ہے کہ اردو جیسی شاعرانہ اور سیکولر زبان کو بھی مختون کر دیا گیا تھا۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ زبان کو مذہب کا لبادہ اڑھا دیا گیا تھا۔ اسی طرح عام ہندوستانی زبان میں سنسکرت کے مشکل الفاظ ٹھونس کر اسے ہندی زبان کا لیبل لگا کر ہندوانہ بنا دیا گیا تھا۔ اب ظاہر ہے مولوی صاحبان ایک ہندی نام کیسے برداشت کر سکتے تھے چاہے اس نام کا مطلب کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو''۔

''برائے مہربانی آج کے لئے اتنے سوالات کافی ہیں۔ اب البرٹ کو اپنے فن کا جادو جگانے دیں''۔

یہ کہہ کر پروفیسر صاحب نے البرٹ سے داستان آگے سنانے کو کہا۔

البرٹ نے موسیقی کی ہم آہنگی کے ساتھ کہانی آگے سنانا شروع کر دی۔

(۹)

مُلا سواتی اور خالد کے درمیان جو کچھ ہوا اُس کو اِن دونوں کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا. مُلا سواتی کی خوں خوار نظروں سے خالد کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر دوڑ جاتی تھی۔ قسمت خالد پر مہربان تھی، اسے قاری صاحب نے اچانک آزاد کشمیر کے ایک مدرسے میں بھیج دیا۔ وہاں اسے تعلیم کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کو استعمال کرنا بھی سکھایا گیا۔ ابھی وہاں اس کو پورے دو سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ کابُل کی فتح کی خبر آ گئی۔ آخری سال میں پڑھنے والے پٹھان طلباء کی اکثریت افغانستان جانا شروع ہو گئی تھی۔ وہاں قاضیوں کی سخت ضرورت تھی جو کہ پشتون طلباء نے بااسلوبی پوری کر دی تھی۔ گزشتہ سالوں نے خالد کا حُلیہ بھی کافی حد تک بدل دیا تھا۔ اس کے چہرے پر باریک بالوں کی ایک بے ترتیب داڑھی اُگ آئی تھی، قد کچھ اور دراز ہو گیا تھا۔ جوان جسم طاقت اور نوجوانی کی امنگوں کے ہاتھوں بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کو تیار تھا۔ مدرسے میں پڑھتے، جسمانی تربیت کرتے مزید تین سال تیزی سے گزر گئے۔ اس کے اکثر ساتھی طالب علم ہندوستان اور افغانستان میں جہاد کر کے آ چکے تھے۔ وہ جب بھی اپنے اساتذہ سے شوق جہاد کا ذکر کرتا تو اس کی کم عمری آڑے آ جاتی تھی۔ خیر! اس کے نام کا قرعہ بھی نکل ہی آیا اور اسے تجربہ کار مجاہدین کے ایک گروپ کے ہمراہ کنٹرول لائن پار کرا دی گئی۔ اس نے گرمیوں کے چھ مہینے ہندوستانی کشمیر میں فوجیوں کا شکار کرتے ہوئے گزارے۔ سردیوں کی آمد سے پہلے اسے آزاد کشمیر واپس بھیج دیا گیا۔ واپس آنے کے بعد اس کا دل مدرسے کی پڑھائی سے بالکل اچاٹ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے اساتذہ سے کہا تھا کہ اسے واپس کشمیر بھیج دیں یا اسے دوسرے طلباء کے ساتھ افغانستان جانے دیں۔ اساتذہ اس کو جواب میں انتظار کرنے کا کہہ کر چپ کرا دیتے تھے۔ ایک شام وہ اپنے کمرے میں اداس بیٹھا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

اس نے دستک کے جواب میں کہا:

''کون ہے؟ اندر آ جاؤ دروازہ کھلا ہے''۔

اس کی آنکھوں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ مخصوص رنگ کی پشتون ٹوپی پہنے، قاری صاحب اس کے سامنے کھڑے تھے۔

وہ انہیں دیکھ کر سرعت سے اُٹھا اور ان کے گلے لگ گیا۔

اس نے بڑے جذباتی انداز میں قاری صاحب سے شکوہ کرتے ہوئے کہا:

''آپ نے اپنے مدرسے سے یہاں بھیج کر پھر کبھی خبر ہی نہیں لی''۔

قاری صاحب نے خالد کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا:

''بیٹا! مجھے تمہارے پل پل کی خبر تھی، مجھے یہاں تک معلوم ہے کہ تم نے کتنے کافروں کو واصلِ جہنم کیا۔ مجھے یہ تک خبر ہے کہ کشمیر میں تم کو تمہاری تیز دوڑ کی وجہ سے چیتے کا خطاب دیا گیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارا نشانہ خطا نہیں جاتا''۔

خالد نے مخصوص مجاہدانہ انداز میں یوں جواب دیا:

''یہ سب اللہ کا کرم ہے جو کچھ بھی میں کرتا ہوں وہ اللہ کی مرضی سے ہی ہوتا ہے. اس اللہ کی مرضی سے میں بائیں ہاتھ سے بھی اتنا ہی اچھا نشانہ لگاتا ہوں جیسے کہ دائیں ہاتھ سے''۔

''شاباش میرے بیٹے!''

یہ کہہ کر قاری صاحب نے اس کی پیشانی کو چوما اور پھر مزید کہا:

''بیٹا فتح کابل کے بعد میری ذمہ داریاں اور بڑھ گئی ہیں. افغانستان میں تمام عرب مجاہدین دنیا بھر سے جمع ہو رہے ہیں۔ ان کے اور میرے طالب علموں کے درمیان رابطہ کاری بھی میری ہی ذمہ داری ہے لیکن میں اپنے مجاہدوں سے کبھی غافل نہیں رہتا ہوں''۔

خالد نے التماس کرتے ہوئے کہا:

''اچھا آپ تشریف رکھیں! میں آپ کے لئے چائے لاتا ہوں''۔

قاری صاحب نے کہا:

''نہیں بیٹا! میرے پاس وقت کی بہت قلت ہے۔ شام کا کھانا تم میرے ساتھ کھانا، خاص بات یہ ہے

کہ تم اپنا ضروری سامان باندھ لو۔کل صبح تم میرے ساتھ کراچی تک کا سفر ہوائی جہاز سے کرو گے۔غالباً یہ تمہارا پہلا ہوائی سفر ہوگا''۔

خالد نے حیران ہوتے ہوئے پُوچھا:

کراچی!

وہ تو بہت بڑا شہر ہے میں وہاں کیا کروں گا؟

قاری صاحب نے کہا:

بیٹا! ابھی میں جلدی میں ہوں....کھانے کے بعد تم کو بتاؤں گا۔سمجھ لو اب تمہارا جہاد شروع ہونے والا ہے۔اب تمہارا وقت آ گیا ہے کہ تم شیعہ کافروں سے اپنے اور اپنی ماں پر ہونے والے مظالم کا بدلہ لو''، اب میں چلتا ہوں بیٹا، شام کو کھانے پر ملیں گے۔

قاری صاحب کمرے سے نکل گئے۔

خالد قتل کرنے کے خیالات کی لذت میں گم ہو گیا۔

شام کا کھانا خالد نے مدرسے کے اساتذہ اور مقامی کمانڈر حضرات کے ساتھ کھایا۔دراصل اِس عالی شان دعوت کو کھانے کا نام دینا زیادتی ہوگی۔قاری صاحب کو کشمیری مجاہدین کی طرف سے یہ خاص دعوت کی گئی تھی جس میں کشمیر کے تمام خاص کھانے موجود تھے۔کھانا کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا اور ساتھ ہی جہادی امور پر گفتگو بھی ہوتی رہی۔سونے کا وقت قریب آ چکا تھا۔قاری صاحب نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا:

اب مجھے اجازت دیں! کل مظفر آباد سے پرواز بھی علی الصبح ہے، ایسا نہ ہو کہ اٹھنے میں دقت ہو.....بیٹا خالد! تم میرے ساتھ میرے کمرے تک چلو تا کہ میں تمہیں کل کے سفر کے بارے میں سمجھا دوں''۔

یہ کہہ کر قاری صاحب کھڑے ہو گئے اور سب سے الوداعی مصافحہ کر کے گلے ملکر کھانے کے کمرے سے باہر نکل آئے۔خالد بھی اُن کے ساتھ باہر نکل آیا۔

قاری صاحب نے چلتے ہوئے اسُ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

''بیٹا! اب تم کراچی میں رہو گے۔تم آج تک کسی بڑے شہر میں نہیں رہے! تم پریشان نہ ہونا...کچھ عرصے میں تمہیں عادت ہو جائے گی۔دیکھو کراچی شہر گردن تک گناہوں میں ڈوبا ہوا ہے۔عورتیں نوکریاں

کرتی ہیں اور کھلے عام سڑکوں پر کاریں دوڑاتی پھرتی ہیں۔لڑکیاں بن ٹھن کر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جاتی ہیں۔لڑکے مغربی لباس پہنتے اور داڑھیاں مونڈواتے ہیں۔ بیٹا! اسلام کو کابل سے کراچی تک پہنچنے میں ابھی کچھ وقت درکار ہے۔ کچھ رُکاوٹیں ہیں جنہیں دور کئے بغیر دین خالص کراچی تک نہیں پہنچ پائے گا۔انشاء اللہ تم کراچی میں اللہ کے دین کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرو گے۔تمہارا اصل جہاد کراچی اور کوئٹہ میں ہوگا ۔تم کراچی میں مدرسے میں نہیں رہو گے بلکہ کچھ مجاہدین کے ساتھ ایک فلیٹ میں ایک عام شہری کی طرح رہو گے۔بس ہفتے میں ایک دفعہ دارلعلوم درس کے لئے جانا ہوگا۔حافظ فضل الرحمٰن تمہارے معلم ہوں گے،وہ بھی مجاہد رہ چکے ہیں۔اُن کا ایک ہاتھ چیچنیا میں جہاد کے دوران ضائع ہوگیا تھا لیکن پھر بھی زندگی کے تمام امور بغیر کسی کی مدد کے سرانجام دیتے ہیں۔ بیٹا! میں پھر تنبیہ کرتا ہوں کہ سڑک پر پھرنے والی لعنتی شیطان عورتوں پر توجہ نہ دینا... ابھی ان پر حد جاری کرنے کا وقت نہیں آیا ہے۔تم دیکھنا، جیسے ہی اسلامی امارات کا جھنڈا کراچی پر لہرائے گا تو اِن بدبخت عورتوں کو میں خود اپنے ہاتھوں سے کوڑے ماروں گا''۔

خالد نے تجسّس سے سوال پوچھا:

''مجھے کرنا کیا ہوگا جناب؟''

''بیٹا! کراچی ائرپورٹ پر میں تمہیں نئے مجاہد ساتھیوں کے حوالے کردوں گا۔تم انہیں کے ساتھ رہنا، وہی تمہیں بتائیں گے کہ اب تمہارے اسلحے کا رخ کس طرف ہوگا؟، مجھے کراچی ائرپورٹ سے ہی آگے کوئٹہ کی طرف پرواز کرنا ہوگا۔اب تم سوجاؤ... فجر کی نماز کے بعد اپنا سامان میری لینڈ کروزر میں رکھ دینا.اور ہاں، بیٹا جہاز میں دوران سفر جہادی امور پر کوئی گفتگو نہ کرنا...شاباش میرے شیر! اب تم سونے کے لئے جاؤ!''

یہ کہہ کر قاری صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے۔

صبح سویرے قاری صاحب کی لینڈ کروزر ائرپورٹ جانے کے لئے تیار تھی۔خالد وقت سے پہلے ہی وہاں پہنچ کر ڈرائیور سے گفتگو میں مشغول ہوگیا تھا۔وہ کئی سال بعد اس سے ملِا تھا۔ کچھ ہی لمحوں میں قاری صاحب بھی آگئے۔اُن کے آتے ہی محافظوں سے لدی ایک ڈبل کیبن ٹویوٹا بھی لینڈ کروزر کی حفاظت کے لئے آگئی۔قاری صاحب ایک بار پھر تمام میزبانوں سے ملے اور خالد کو لینڈ کروزر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا۔ یہ مختصر سا قافلہ فوراً ہی مظفر آباد ائرپورٹ کے لئے روانہ ہوگیا۔ لینڈ کروزر اپنے محافظوں کے جلو میں.

خوبصورت و پر پیچ راستوں پر رواں دواں تھی۔ چاروں طرف خوبصورت نظارے ایسے بکھرے ہوئے تھے کہ جیسے دُنیا کے بہترین مصوروں نے اپنے فن پارے پہاڑوں کے دامن میں سجا دیے ہوں۔ خالد ان تمام خوبصورت نظاروں سے بے نیاز اللہ کے نام پر خون بہانے کے امکانات پر غور کر رہا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے کے سفر کے بعد یہ لوگ پہاڑ کے دامن میں موجود ایک چھوٹے سے ائر پورٹ پر پہنچ گئے۔ وہاں پاکستان ائر فورس کا ایک سی۔۱۳۰ طیارہ رن وے پر موجود تھا۔ قاری صاحب کے پاس اُن کا مختصر سا سفری بیگ تھا جو کہ از راہ عقیدت خالد نے اٹھا رکھا تھا۔ خود خالد کا اپنا بیگ بھی بہت بھی مختصر تھا جس میں سوائے چند جوڑے کپڑوں کے اور کچھ نہ تھا۔ یہ دونوں ائر پورٹ کی مختصر بلڈنگ سے گزرتے ہوئے رن وے پر پہنچے۔ وہاں پر کھڑی ایک کار نے ان دونوں کو رن وے پر کھڑے طیارے کی سیڑھیوں کے پاس پہنچا دیا۔ خالد آج پہلی بار کسی طیارے میں سوار ہو رہا تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے قاری صاحب کی تقلید میں طیارے کی سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ طیارے میں قدرے اندھیرا تھا۔ انجن کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی۔ جب آنکھیں اندر کے ماحول سے ہم آہنگ ہوئیں تو خالد نے دیکھا کہ تقریباً آدھا جہاز مجاہدین سے بھرا ہوا تھا۔ سب نے پہلے ہی سیٹ بیلٹ باندھ لئے تھے۔ جیسے ہی یہ لوگ اپنی سیٹ پر بیٹھے، جہاز کے انجن اور تیزی سے آواز دینے لگے۔ خالد کو حیرانی تھی کہ یہ اتنی بڑی دیو ہیکل عمارت کیسے پرواز کرے گی؟ اسے یاد آیا کہ اس نے ایک اُستاد سے پوچھا تھا کہ اتنے بڑے جہاز کیسے پرندوں کی طرح اڑان بھر لیتے ہیں، انگریز کتنے تیز دماغ کے ہوتے ہیں۔ جواب میں استاد نے اسے بتایا تھا کہ پرواز کرنے کا فن انگریزوں نے قرآن پڑھ کر ہی سیکھا ہے۔ حضرت سلیمان کے حکم سے دیو ساری دنیا میں اڑان بھرا کرتے تھے۔ بلکہ دیوتاؤں کے کہنے پر ملکہ سبا کا تخت بھی ہوا میں اڑا لایا تھا۔

وہ اپنے خیالوں میں محو تھا کہ جہاز بہت تیزی سے دوڑنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں بلند ہو گیا۔

قاری صاحب، کیا یہ سب مجاہدین کراچی جا رہے ہیں؟

ساون نے تجسس سے پوچھا:

"نہیں بیٹا! یہ طیارہ کراچی میں کچھ دیر کے لئے رکے گا۔ وہاں سے اور طالب سوار ہوں گے اور پھر یہ طیارہ کابل پرواز کر جائے گا۔ برخوردار! تم بھول گئے کہ میں نے تم سے دوران سفر خاموش رہنے کو کہا تھا؟"۔

خالد قاری صاحب کی تنبیہ سن کر خاموش ہو گیا۔ کوئی ڈھائی گھنٹے کی پرواز کے بعد طیارہ کراچی کی حدود

میں داخل ہوگیا۔ خالد دیدے پھاڑے چاروں طرف پھیلے شہر کا فضائی جائزہ لینے لگا۔ جہاز نے شہر کے گرد چکر لگانے کے بعد نیچے کی طرف آنا شروع کر دیا، اور کچھ دیر رن وے پر دوڑنے کے بعد رک گیا۔

تھوڑی دیر میں دوروازے کی سیڑھی کھلی۔

ایک لمبا اور چھوٹے بالوں والا شخص دو افراد کے ساتھ جہاز میں آیا۔

اسُ نے آتے ہی قاری صاحب کو سلام کیا اور گلے سے لگایا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ انُ کا پرُانا شناسا تھا۔ اسُ نے ان سے باہر آنے کی درخواست کی۔

قاری صاحب نے خالد سے کہا:

''بیٹا! تم اپنا بیگ لے کر میرے ساتھ آؤ، تمہارے ساتھی لاؤنج میں انتظار کر رہے ہوں گے''۔

طیارے کی سیڑھیوں کے قریب ہی ایک کار اِن دونوں کے لئے تیار کھڑی تھی۔ کار کے ڈرائیور نے قاری صاحب کو آتا ہوا دیکھ کر پچھلا دروازہ کھول دیا۔ قاری صاحب خالد کو آگے کی سیٹ پر بیٹھنے کا کہہ کر خود پچھلی سیٹ پر چھوٹے بالوں والے آدمی کے ساتھ بیٹھ گئے۔ کار اِن سب کو لے کر لاؤنج کی طرف چل پڑی۔ لاؤنج کے داخلی دروازے پر ایک ائر پورٹ سیکورٹی فورس کا جوان چاق و چوبند کھڑا ہوا تھا۔ چھوٹے بالوں والے نے اسے اپنا بیج دکھا کر کچھ کہا۔ سیکورٹی والے نے ادب سے قاری صاحب اور خالد کے لئے دروازہ کھول دیا۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی ان کا استقبال ایک اور آدمی نے کیا۔

قاری صاحب نے اس آدمی سے گلے ملنے کے بعد خالد کا یوں تعارف کرایا:

''یہ لو!... یہ میرا منہ بولا بیٹا ہے.... اب یہ تمہارے حوالے ہے... اچھا خالد بیٹا! میں تم سے ملنے کے لئے خاص طور سے کراچی آؤں گا۔ اب تم اِن کے ساتھ جاؤ! اللہ تمہیں کامیابیاں نصیب کرے''۔

یہ کہہ کر قاری صاحب نے چھوٹے بالوں والے کی طرف متوجہ ہو کر کہا:

''آپ کو فتح کابل مبارک ہو!۔۔۔کابل فتح ہونے کے بعد میری آپ سے یہ پہلی مُلاقات ہے''۔

چھوٹے بالوں والے نے کہا:

''آپ کو بھی خیر مبارک ہو! جو خواب ضیاالحق صاحب اپنی آنکھوں میں سجائے شہید ہو گئے، وہ خواب آپ لوگوں نے حقیقت میں بدل ڈالا۔ آپ کی جتنی بھی تکریم کی جائے کم ہے.... آیئے! میرے آفس میں

چائے تیار ہے وہیں بات کریں گے۔ جب تک اور مجاہدین بھی سوار ہو جائیں گے''۔

یہ کہہ اس نے ایک بغلی دروازے کی طرف اشارہ کیا.اس دروازے کے اندر ایک الگ دُنیا آباد تھی. بہت سے افراد کمپیوٹر کے سامنے کام میں مشغول تھے. بہت سے افراد کانوں پر ہیڈ فون لگائے کچھ سن رہے تھے۔ قاری صاحب اِن آدمی کے پیچھے چلتے ہوئے اس کے آفس میں داخل ہو گئے.اس نے انٹر کام پر چائے اور پیٹس لا۔نے کو کہا گیا۔

''اس کے بعد وہ آدمی یوں گویا ہوا:

قاری صاحب! میں آپ کو بلوچستان میں ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں''۔

''جی بہ سروچشم بتایئے! کیا نئی تبدیلیاں ہیں؟''

قاری صاحب نے کرُسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

افسر نے کہا:

''آپ کے علمِ میں ہے کہ بلوچستان میں گی کی تحریک زور پکڑتی جارہی ہے۔ ہمارا ہندو دشمن علیحدگی پسندوں کی دِل کھول کر امداد کر رہا ہے۔ آپ کو ہم بلوچستان میں کھلی چھوٹ دیتے ہیں۔ آپ نے جس طرح اسلامی جہاد کا ولولہ افغانستان کے چپہ چپہ پر پھیلایا ہے بالکل ایسے ہی آپ کو بلوچستان میں کرنا ہوگا۔ جب لوگ اسلام کی جانب راغب ہوں گے تو علیحدگی پسند سیاسی تنہائی کا شکار ہو کر اپنی موت آپ مر جائیں گے، ویسے بھی آپ کو توجہ دینا چاہئے کہ کچھ بلوچ قبائل میں لوگ شیعہ ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ خاص طور پر ذکری بلوچوں میں شیعت تیزی سے پھیل رہی ہے''۔

قاری صاحب نے جواب میں کہا:

''آپ فکر نہ کریں! ہم سارے بلوچستان میں شیعہ مخالف جذبات بھڑکا دیں گے۔ آپ ہمیں شیعہ اعلیٰ دماغوں کی فہرست فراہم کریں انہیں داغنا ہمارا کام ہے۔ ہمارے کچھ ساتھی تو بضد ہیں کہ اِن کو چن چن کر مارا جائے مگر میرا کہنا ہے کہ ہم عام شیعہ کو مارنے کے بجائے شیعہ پروفیسرز، ڈاکٹرز اور اعلیٰ عہدوں پر فائز افراد کو ماریں تو یہ لوگ خود بخود کمزور ہو جائیں گے.آپ بلوچستان کی فکر نہ کریں، اگر اللہ کو منظور ہوا تو وہاں کے لوگ شیعہ نام تک رکھنا تک بھول جائیں گے۔

آفیسر نے مزید کہا:

”لیکن آپ کراچی میں ہاتھ ذرا ہلکا رکھیں، ہم ویسے ہی ایک بڑی سیکولر پارٹی کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر یہ بدبخت بلوں میں جا گھسے ہیں۔ کراچی کسی بھی طور پر مذہبی رہبران کے پیچھے چلنے کو تیار نہیں ہے“۔

قاری صاحب نے آفیسر سے کہا:

”آپ بھی اس فلائٹ سے کوئٹہ چلیں تو رستے میں بات ہو جائے گی۔ ایک روز وہاں میرے مہمان رہیں“.

”آج ممکن نہیں قاری صاحب! لیکن میں آپ کو جلد فون کر کے آنے کی اطلاع دوں گا، آیئے! رن وے کی طرف واپس چلتے ہیں۔ جہاز میں تمام مسافر سوار ہو چکے ہوں گے“۔

قاری صاحب آفیسر کے ساتھ رن وے کی طرف چل دیئے۔

(۱۰)

خالد کے نئے میزبان ساتھیوں نے کراچی میں اس کی خوب آؤ بھگت کی. وہ پہلے ہی دن اس کو سمندر دکھانے لے گئے ۔ اس نے سمندر صرف فلموں یا تصویروں میں ہی دیکھا تھا۔ اس نے جی کھول کر پانی میں چہل قدمی کی۔

ساحل پر پہنچ کر، سامنے نظر آنے والے ریسٹورنٹ کو دیکھ کر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

''چلو سامنے نظر آنے والے ریسٹورنٹ تک دوڑ لگاتے ہیں جو جیتے گا ہم سب مل کر اس ریسٹورنٹ میں اس کی دعوت کریں گے ۔ تینوں ساتھیوں نے خالد کا چیلنج قبول کر لیا۔ بھلا خالد سے ریس میں جیتنا کہاں ممکن تھا۔ یوں اس نے پہلے ہی دن اپنے مجاہد ساتھیوں پر اپنی دھاک بٹھا دی۔ خالد کو موٹر سائیکل اور کار چلانے کا خاصا تجربہ تھا۔ لیکن اس نے شہر میں کبھی موٹر سائیکل یا کار نہیں چلائی تھی۔ اس کے ساتھیوں کو خاص ہدایت تھی کہ خالد کو شہر کے راستوں پر ڈرائیونگ کرنے کی مشق کروائی جائے ۔ چنانچہ اسے ایک ہیوی ڈیوٹی موٹر سائیکل مستقل طور پر دیدی گئی تھی۔ اُس نے چھ مہینے میں شہر کے رستے اچھی طرح یاد کر لئے تھے، پھر اسُے نقشہ پڑھنے کا فن بھی آتا تھا۔ وہ مشکل سے مشکل پتہ نقشے کے ذریعے با آسانی ڈھونڈ لیتا تھا۔

آج شام اس کے ساتھی مجاہد اکبر خان نے ایک پرُ تکلف دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا۔ وہ بازار سے افغانی پلاؤ چکن تکہ اور نان پہلے ہی لے آیا تھا۔ خالد نے کھانے کو ہلکی آنچ پر اوون میں رکھ دیا تھا تا کہ اسے دوبارہ گرم نہ کرنا پڑے۔

خالد نے اکبر کو غسل خانے کی طرف جاتے دیکھ کر پوچھا:

''لگتا ہے آج کسی خاص مہمان کی آمد ہے؟''

اکبر خان نے جواب دیا:

''تم نے بالکل صحیح سمجھا، آج حافظ صاحب ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے، دراصل وہ تم سے ہی ملنے آ رہے ہیں''۔

یہ کہہ کر وہ غسل خانے میں گھس گیا۔ اِس دوران خالد نے دسترخوان بچھا کر اس پر پلیٹیں لگانا شروع کر دیں۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ نیچے سے چوکیدار نے انٹر کام کے ذریعے حافظ صاحب کی آمد سے آگاہ کیا۔ خالد نے چوکیدار کو انہیں اوپر آنے کی اجازت دی اور خود دروازے پر اُن کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں لفٹ اُن کے دروازے پر آ کر رک گئی۔ خالد نے دروازے پر اُن سے استقبالی مصافحہ کرتے ہوئے کہا:

''میں خالد ہوں..... خالد سُفیانی اور آپ یقیناً حافظ صاحب؟''

حافظ صاحب نے مسکراتے ہوئے جواباً کہا:

''بالکل صحیح پہچانا''۔

وہ اندر آئے تو اکبر خان بھی تولئے سے اپنے بال خُشک کرتا ہوا غسل خانے سے نکل آیا۔

''آئیں! دسترخوان پر ہی بیٹھتے ہیں، کھانے کا وقت بھی ہو گیا ہے''۔ اکبر خان نے دسترخوان کی طرف خود پیش قدمی کرتے ہوئے کہا۔

حافظ صاحب واش بیسن کی طرف ہاتھ دھونے چلے گئے۔ اُن کی بے تکلفی بتاتی تھی کہ وہ فلیٹ سے اچھی طرح واقف تھے۔ خالد دسترخوان پر کھانا لگا چکا تھا۔ سب نے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد اکبر خان نے حافظ صاحب سے دعا کی درخواست کی۔ حافظ صاحب نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو ان کے دائیں ہاتھ کی آخری دو کٹی ہوئی انگلیاں نمایاں ہو گئی تھیں۔

حافظ صاحب نے مختصر دعا یوں کروائی:

''اے میرے اللہ! ہم مسلمانوں کو سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔

مجاہدین کی اسلامی حکومت کو دوام اور وسعت عطا فرما۔

اے میرے اللہ! جیسے مسلمانوں کا نقاب اوڑھے ہوئے قادیانیوں کو تُو نے بے نقاب کیا ہے ویسے ہی مسلمانوں کا بھیس بدلے ہوئے شیعہ کافروں کو بھی بے نقاب فرما۔

اِن کو جس طرح آخرت میں نیست و نابود ہونا ہے۔ ایسے ہی دُنیا میں بھی نیست و نابود کردے۔
اے میرے اللہ! میرے بھائی اور مجاہد اسلام اکبر خان اور خالد سفیانی کے جہاد کو کامیابی اور قبولیت عطا فرما... آمین"۔

دعُا کے بعد حافظ صاحب نے گفتگو کا سلسلہ یوں شروع کیا:

خالد تمہاری بہت تعریف سُنی ہے۔ خاص طور سے تمہاری برق رفتاری اور تمہارے بے خطا نشانوں کی"۔

خالد نے کہا:

"جی بس یہ اللہ کا کرم ہے مجھ پر"۔

حافظ صاحب نے جواب میں کہا:

"اب تمہاری صلاحتیں یہاں بھی استعمال کرنے کا وقت آ گیا ہے"۔

خالد نے کہا:

"میں دل و جان سے حاضر ہوں"۔

حافظ صاحب نے مزید کہا:

"نشانہ تم کو ہم دیں گے... تمہارا کام صرف تاک کر مارنا ہوگا... جتنے کافر مارو گے اتنے ہی محل جنت میں تعمیر کرو گے جو سب کے سب خوبصورت ترین حوروں سے بھرے ہوں گے جو کہ صرف تمہاری ہوں گی"

خالد نے کہا انشاء اللہ!

"کل تمہیں ایک مجاہد لینے آئے گا۔ تم اس کے ساتھ جانا۔ وہ تمہیں ایک ادھیڑ عمر آدمی کو دکھائے گا۔ وہ آدمی ہفتے میں دو دن اپنے نواسے کو اسکول سے لے کر اپنی بیٹی کے گھر چھوڑنے جاتا ہے۔ جیسے ہی وہ اپنی بیٹی کے گھر کے باہر کار پارک کر کے اُس سے باہر آئے تو فوراً اسے اس کے نواسے سمیت داغ دینا۔ وہ شخص کائنات کے بدترین کالے کافروں یعنی شیعوں کا ایک اہم آدمی ہے۔ حافظ صاحب نے ایک نقشہ نکال کر اسے زمین پر بچھایا اور آپریشن کی مزید تفصیلات خالد کو سمجھائیں۔ خالد ایک ماہر سپاہی کی مانند فوراً ہی تمام امور کو سمجھ گیا۔ آخر میں حافظ صاحب نے خالص فوجی انداز میں پوچھا:

''کوئی شک''؟

خالد نے بھی فوجی انداز میں جواب دیا:

''نہیں جناب''! لیکن ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔

حافظ صاحب نے کہا ضرور پوچھو۔

''اس آدمی کے ہمراہ بچے کو مارنا کیوں ضروری ہے''؟

حافظ صاحب نے اس کے سوال کا اس طرح جواب دیا:

''سپنولیا بڑا ہو کر سانپ ہی نکلتا ہے.... یہ بھی بڑا ہو کر اپنے نانا کی طرح کسی اعلیٰ عہدے پر پہنچ جائے گا... ہم اس دھرتی پر کسی بھی

شیعہ اعلیٰ دماغ کو جینے نہیں دیں گے''۔

خالد حافظ صاحب کے جواب سے مطمئن ہو گیا۔

''کچھ اور پوچھنا ہے کراچی شہر کے بارے میں ضرور پوچھو، تمہاری معلومات میں اضافہ کر کے مجھے بے حد خوشی ہو گی''۔

خالد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:

''مجھے کراچی آ کر ایک طرح سے ایسے لگا کہ میں سری نگر میں دوبارہ آ گیا ہوں''۔

''وہ کیسے خالد''؟۔ یہ پوچھتے ہوئے حافظ صاحب کے چہرے پر حیرانی کی وضاحت نمایاں تھی۔

خالد نے وضاحت کرتے ہوئے کہا:

''سری نگر میں بھی چوک پر مسلح سپاہیوں کے دستے جگہ جگہ ناکے لگائے کھڑے رہتے تھے، کراچی میں بھی کچھ ایسے ہی ہے''۔

ایسے ماحول میں آپریشن کرنے میں سکیورٹی فورسز سے ٹکراؤ ہو سکتا ہے''۔

حافظ صاحب نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''اللہ ہمارے وزیر داخلہ جناب نذیر اللہ جابر پر اپنی رحمت کرے۔ یہ آپریشن وہ اپنی نگرانی میں یہاں کی ایک مقامی سیاسی پارٹی کے خلاف کر رہے ہیں۔ اس بدبخت پارٹی میں شیعہ بہت سرگرم ہیں اور یہ پارٹی

لادینیت کی زبردست حامی اور طالبان کی بے انتہاء مخالف ہے۔ جب تک یہ پارٹی ختم نہیں ہوگی طالبان کا جھنڈا اس شہر پر نہ لہرا سکے گا۔خیر تم فکر نہ کرو ہمارا وزیر داخلہ اس پارٹی کو فنا کر کے ہی چھوڑے گا، اور باقی ماندہ شیعوں سے ہم خودنمٹ لیں گے''۔اس بیچ میں اکبر چائے بنا کر لے آیا۔

چائے پینے کے بعد خالد نے حافظ صاحب سے پوچھا:

''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کے ہاتھ کی دوانگلیاں کس حادثے میں ضائع ہوئیں''؟

حافظ صاحب نے کہا:۔۔۔۔۔۔۔''اوہ،۔۔۔۔۔اوہ''اور پھر ماضی میں جھانکتے ہوئے کہا:

''کابل میں ڈاکٹر نجیب اللہ کو اقوام متحدہ کی پناہ سے نکال کر گرفتار کرنے کے آپریشن کا ذمہ دار میں تھا، ہمارا مشن کامیاب تھا...ہم نے نجیب اللہ کو اس کی پناہ گاہ سے نکال کر سولی پر چڑھا دیا تھا۔لیکن اس آپریشن میں میری دوانگلیاں ضائع ہوگئیں.. پرافسوس کہ مجھے شہادت نصیب نہ ہوسکی۔خیر! اب مجھے زیادہ دیر نہیں رکنا چاہیے۔تم آرام کرو اور کل کے آپریشن کے لئے ذہنی طور پر تیار رہو۔اللہ کریم ہے وہ مجاہدوں پر اپنا فضل وکرم کرتا ہے۔ جہاں تک بات ہے ہر چوک پرناکوں کی۔۔۔تو وہ ہمارے لئے نہیں ہیں۔۔۔تم بالکل فکر نہ کرو''۔یہ کہہ کر حافظ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور سب سے گلے مل کر دروازے سے باہر نکل گئے۔

رات خالد سے کاٹے نہیں کٹ رہی تھی۔اک عرصے سے اس کے ہاتھوں کسی کا خون نہیں بہا تھا۔کشمیر میں چلتے پھرتے جیتے جاگتے انسانوں کا شکار کر کے اسے بڑی آسودگی حاصل ہوتی تھی۔ابھی تک اسے کسی شیعہ کافر کو مارنے کا اعزاز بھی حاصل نہ ہوسکا تھا۔وہ چاہتا تھا کہ وڈیرے حیدر شاہ کے ہم مذہب سارے شیعوں کا وجود پاکستان سے مٹا ڈالے۔خیر! کسی نہ کسی طرح شب انتظار کٹی۔وقت مقررہ پر ایک مجاہد ساتھی اسے لینے کے لئے آپہنچا۔اس نے خالد کو ایک نو ملی میٹر کا چمکتا ہوا امریکن پسٹل اور ایک بھرا ہوا اضافی میگزین دیا۔وہ دونوں موٹر سائیکل پر آدھے گھنٹے کا سفر کرنے کے بعد کلفٹن کے متمول علاقے میں پہنچ گئے تھے۔خالد کے ساتھی نے ایک درخت کے نیچے جا کر موٹر سائیکل روک لی۔اس کے ساتھی نے خالد سے کہا:

''وہ کافر خنزیر کا بچہ آتا ہی ہوگا''۔تم نشانے کے لئے تیار ہو جاؤ''!

خالد نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا:

''تم فکر نہ کرو۔۔۔۔میں تیار ہوں''۔

ساتھی نے عجلت میں کہا:

''وہ دیکھو کالی ہنڈا اسوک کار اسی کی ہے''۔

اسی اثنا میں کار ایک بنگلے کے باہر آ کر رک گئی۔ اسے ایک کھچڑی بالوں والا کلین شیو آدمی چلا رہا تھا، جس نے ہلکی نیلی قمیض پر سرخ ٹائی لگائی ہوئی تھی۔ اس کے برابر والی سیٹ پر ایک پانچ یا چھ سالہ گول مٹول بچہ بیٹھا ہوا تھا۔ گاڑی چلانے والے آدمی نے گاڑی کا انجن بند کرنے کے بعد بچے کی حفاظتی بیلٹ کھولی، اس کے بعد اس نے دروازہ کھول کر بچے کو باہر آنے کو کہا۔ وہ بچے کی انگلی پکڑ کر اسے ڈگی تک لے گیا۔ اس نے ڈگی کھول کر اس میں سے بچے کا سکول بیگ نکال کر اسے دیا، جسے بچے نے فوراً ہی اپنی کمر پر لاد لیا۔ پھر اس آدمی نے ڈگی سے اپنا بریف کیس نکال کر بائیں ہاتھ میں تھام کر ریموٹ کنٹرول سے گاڑی کو لاک کر کے اس کی چابی اپنی پتلون کی جیب میں ڈال لی اور دائیں ہاتھ سے بچے کا ننھا ہاتھ تھام کر اپنی بیٹی کے بنگلے کی طرف بڑھنے لگا۔ عین اسی وقت خالد درخت کے پیچھے سے نکل کر سامنے سے آیا اور اس نے کھچڑی بالوں والے کی عین پیشانی پر فائر کر دیا۔ گولی پیشانی سے گزر کر سوراخ کرتی ہوئی سر کے پچھلے حصے سے نکل گئی۔ دوسرا فائر اس نے بچے کے سر پر کیا۔ بچہ فوراً ہی زمین پر گر پڑا۔ بچے کا نانا اس کے گرتے ہی اس کے اوپر گر پڑا۔ منظر کچھ ایسا تھا کہ جیسے نانا مر کر بھی نواسے کو اپنی پناہ میں رکھنا چاہتا ہو۔ خالد نے یہ کام بہت ہی اطمینان اور مہارت سے کیا۔

اس کے ساتھی مجاہد نے گھبرا کر کہا:

''اب وقت ضائع نہ کرو... فوراً موٹر سائیکل پر سوار ہو جاؤ۔

خالد موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا۔

اس کے بیٹھتے ہی اس کے مجاہد ساتھی نے موٹر سائیکل دوڑا دی۔

اس کا ساتھی کافی بدحواس ہو گیا تھا۔

وہ بہ مشکل تمام موٹر سائیکل کو ٹیڑھے میڑھے طریقے سے دوڑاتا بڑی سڑک تک لے آیا۔

وہ کلفٹن کی حدود سے نکل آئے تھے مگر ڈیفنس کے علاقے میں آتے ہی بدقسمتی نے آن لیا۔

ڈیفنس کے مرکزی بلے وارڈ پر شاید کسی گاڑی سے تیل گر گیا تھا۔ ان لوگوں کی موٹر سائیکل تیل پر

توازن برقرار نہ رکھ پائی۔

وہ دونوں موٹر سائیکل کے ساتھ فٹ پاتھ تک پھسلتے چلے گئے۔قریب ہی سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے پولیس کے دوسپاہی ان کی مدد کو دوڑے۔خالد کے مجاہد ساتھی نے پولیس کو آتا دیکھ کر ایک طرف کو دوڑ لگادی۔ساتھی کے یوں دوڑ جانے پر پولیس والوں کو خالد پر شک ہوگیا۔انہوں نے اس کی تلاشی لی تو شلوار کے اوپر بندھی ہوئی بیلٹ میں اُڑسا ہوا پسٹل اور میگزین برآمد ہوگیا۔

پولیس والے نے ہتھیار برآمد ہوتے ہی خالد کو لات مارتے ہوئے کہا:

''اوئے!کہاں پر ڈاکہ مار کے آیا ہے؟اور مال کدھر چھپایا ہے ڈاکے کا''؟

خالد نے سینہ تان کر جواب میں کہا:

''تم کو ایک مجاہد اسلام کو ڈاکو کہتے ہوئے شرم نہیں آرہی''؟

ایک دوسرے پولیس والے نے خالد کی گدی پر زوردار چانٹا لگا کر کہا:

''پہلے تھانے چل پھر دیکھیں گے کہ تو کون سا مجاہد ہے'' دونوں پولیس والے اسے اپنی پھٹیچر موٹر سائیکل پر بیچ میں بٹھا کر تھانے روانہ ہوگئے۔انہوں نے موٹر سائیکل کی رفتار بڑھانے کی کوشش کی جو کہ تین آدمیوں کا بوجھ اٹھا کر بمشکل رینگ پا رہی تھی۔تھانے پہنچ کر دونوں کانسٹیبل اسے بازوؤں سے پکڑتے ہوئے تھانہ انچارج کے کمرے میں لے آئے۔

تھانہ انچارج نے خالد کی طرف ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا:

''اوئے!یہ کس کو لے آئے ہو''؟

ایک پولیس والا دوبارہ سلوٹ کر کے بولا:

''سرجی!یہ بہت خطرناک ڈاکو ہے...کہیں سے ڈاکہ مار کے یہ اپنے ساتھی کے ساتھ جارہا تھا کہ ہم دونوں نے اس پر بڑی مشکل سے جان کو خطرے میں ڈال کر قابو پایا۔سرجی!یہ دیکھیں یہ پسٹل اور بھرا ہوا میگزین اس کے پاس سے برآمد ہوا ہے۔اس کا ساتھی فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ڈاکے کا مال ضرور اسی کے پاس ہوگا''۔

''چل!اب انچارج صاحب کو صاف صاف بتادے کہ کہاں پر ڈاکہ مار کے آرہا تھا''؟

تھانہ انچارج عمر فاروق ایک شریف النفس انسان تھا۔ باپ دادا کی طرف سے دولت مند تھا اور تعلیم بھی اعلیٰ حاصل کی تھی۔ پولیس کی نوکری اس کا شوق تھا، مجبوری نہیں...اس نے خالد کی طرف دیکھ کر کہا:

''بیٹا! صاف صاف بتادو...اس میں ہی تمہارا فائدہ ہے''۔

خالد نے کہا:

''جی! میں پہلے ہی ان دونوں کو بتا چکا ہوں کہ میں ڈاکو نہیں بلکہ ایک مجاہد ہوں....ڈاکہ ڈال کر نہیں بلکہ ایک خطرناک کافر اور اس کے بچے کو قتل کر کے آ رہا تھا کہ موٹر سائیکل پھسل گئی اور ان دونوں نے مجھے پکڑ لیا''۔

انچارج نے حیرت سے پوچھا:

''کیا کہا؟ قتل کر کے آ رہے ہو''؟

خالد نے کہا:

جی ہاں! قتل فی سبیل اللہ''۔

انچارج نے سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا:

اس کو ہتھکڑی لگاؤ اور سیل میں بند کر کے فوراً یہاں آؤ''۔

ایک اور سپاہی کو انچارج نے کہا:

''تم سب انسپکٹر کو میرے پاس بھیجو''!

فوراً ہی سب انسپکٹر کمرے میں آ گیا۔

انچارج نے اسے کہا:

''تم ڈسٹرکٹ آفس سے معلوم کرو کہ پورے ڈسٹرکٹ میں کسی آدمی کو ایک بچے کے ساتھ کہاں قتل کیا گیا ہے؟، اور سنو! ابھی جس کو سیل میں بھیجا ہے اس آدمی سے کوئی نہ ملے...اس کی مگرمچھ جیسی سرد آنکھیں بتا رہی ہیں کہ یہ کوئی سفاک قاتل ہے''۔

سب انسپکٹر نے لیس سر کہہ کر سلوٹ کیا اور پھرتی سے کمرے سے نکل گیا۔

کچھ ہی دیر میں وہ دوبارہ انچارج کے کمرے میں آیا اور کہا:

''سر پروفیسر نسیم نقوی کو ان کے نواسے سمیت کلفٹن تھانے کی حدود میں قتل کر دیا گیا ہے!

تھانہ انچارج نے حیرت سے کہا:

''کیا''؟

خدا غارت کرے ان کے قاتلوں کو جس نے ایک فرشتے کو قتل کر ڈالا ہے۔ کیا تم کو معلوم ہے کہ پاکستان جیسے غریب ملک میں ڈاکٹر نقوی نے ایک ایسا گردوں کے علاج کا مرکز قائم کیا ہے جس میں سارے پاکستان سے مریض آتے ہیں۔ خاص طور سے اندرون سندھ میں تو گردوں کا مرض بہت زیادہ ہے۔ وہاں کے غریب سندھیوں کا بس چلے تو پروفیسر نسیم نقوی کی پوجا شروع کر دیں۔ ان کا تو مذہب سے کوئی لینا دینا تھا ہی نہیں۔۔۔۔ یہ کہہ کر انچارج نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بید کو غصے کی شدت سے میز پر مارا اور اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

سب انسپکٹر نے کہا:

''مجھے بھی بہت افسوس ہے سر''!

میرے لئے کیا حکم ہے؟

''جسے سیل میں ڈالا ہے اس نے اس قتل کا دعویٰ کیا ہے... ذرا تفتیش کرو، حکومت نے ساری پولیس انٹیلی جنس بیورو کے حوالے کر کے کراچی آپریشن میں جھونک دی ہے۔ اب ہم کیا خاک شہریوں کا تحفظ کریں گے... اب تم جاؤ!.. سب انسپکٹر فوراً ہی سیلوٹ کر کے انچارج کے کمرے سے نکل گیا۔ کوئی آدھا گھنٹہ گزرا ہوگا کہ سب انسپکٹر دوبارہ انچارج کے کمرے میں آیا اور زوردار سیلوٹ کر کے انچارج کو کہا:

''سر! یہی بندہ قاتل ہے... جو بھاگ گیا ہے اس نے ٹارگٹ کی نشاندہی کی تھی اور موٹر سائیکل بھی مفروری چلا رہا تھا۔

سر! ان لوگوں کا تعلق جہادی گروپ سے ہے اور اس گروپ کی پشت پر ایجنسی کا ہاتھ ہے''۔

سب انسپکٹر نے ایک ہی سانس میں ساری تفصیلات بتا دیں۔

تھانہ انچارج نے کہا:

''ایجنسی پشت پر ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ یہ لوگ ہمارے معزز شہریوں کا شکار کرتے پھریں''۔

''سر! میرے لئے کیا حکم ہے''؟، سب انسپکٹر نے دریافت کیا۔

انچارج نے کہا:

''تم ہیڈ محرر سے کہو کہ ایف آئی آر درج کرنے کا رجسٹر لے کر یہاں آئے.. میں خود اپنے ہاتھ سے پرچہ کاٹوں گا۔ اور دیکھو اس گرفتاری کی خبر تھانے سے نہ نکل پائے''۔

''جیسے آپ کا حکم سر!''۔ فوراً ہی ایک موٹی سی توند والا ہیڈ محرر بغل میں رجسٹر دبائے اندر آیا۔ اس نے سلوٹ مارنے کے بعد کہا:

''کیا حکم ہے سر!''۔

انچارج نے کہا:

''تم سیل میں بند ملزم کا بیان قلم بند کرو میں پرچہ کاٹتا ہوں'' بس جلدی کرو۔ وقت کم ہے... ہیڈ محرر نے کہا:

''سر! آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن جرم اور وقوعہ کلفٹن تھانے کی حدود میں ہوا ہے''۔

انچارج نے غصے میں ہیڈ محرر کو جواب میں کہا:

''مجھے قانون پڑھانے کی کوشش نہ کرو۔۔۔ یہ ملزم ہمارے تھانے کی حدود سے پکڑا گیا ہے.. اسلحہ بھی یہیں پر برآمد ہوا ہے اور اس نے قتل کا اعتراف بھی کرلیا ہے''۔

ہیڈ محرر نے یس سر کہا... اور سلیوٹ کر کے باقی کاروائی کرنے کے لئے کمرے سے نکل گیا۔ تھانہ انچارج نے کچھ دیر سوچ کر پرچہ لکھنا شروع کر دیا۔ ابھی پرچہ مکمل طور پر لکھا بھی نہیں گیا تھا کہ ضلع کے ایس پی کا فون آگیا۔

انچارج نے فون اٹھا کر یس سر کہا...

دوسری طرف سے ایس پی نے کہا:

''رپورٹ ملی ہے کہ تم نے خالد نامی ایک لڑکے کو پروفیسر نسیم نقوی اور ان کے نواسے کے قتل کے شبہ میں پکڑا ہے''۔

تھانہ انچارج نے جواب میں کہا:

''یس سر!''

ایس پی نے حکم دیتے ہوئے کہا:

''اسے چھوڑ دو''۔

تھانہ انچارج نے جواب میں کہا:

''سر اسے شبہ میں نہیں پکڑا بلکہ آلہ قتل بھی برآمد ہوا ہے اور اس نے اس قتل کا اقرار بھی کر لیا ہے''۔

ایس پی نے جواب میں کہا:

''یو ڈیم...فاروق!...میں تم کو آسان اردو میں حکم دے رہا ہوں تم کو میری بات سمجھ کیوں نہیں آ رہی''؟

تھانہ انچارج نے جواب میں کہا:

''سر آپ کا حکم سر آنکھوں پر ہے...قانونی مسئلہ ہے، پرچہ کٹ چکا ہے....اب تو عدالت ہی اسے چھوڑے یا سزا دے گی البتہ اگر آپ مجھے تحریری حکم دیں تو میں چھوڑ دوں گا''۔

ایس پی نے جواب میں کہا:

''میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ پندرہ منٹ میں ایف آئی آر کا رجسٹر لے کر فوراً میرے دفتر میں حاضر ہو جاؤ''۔

انچارج یہ سن کر رجسٹر لے کر سیل میں چلا گیا۔

وہاں اُس نے ملزم خالد سے پوچھا:

نام:

''خالد سفیان''۔

باپ کا نام:

''معلوم نہیں''۔

ماں کا نام:

''بھاگ بھری''۔

پیشہ:

''جہاد''۔

ذات:

''اچھوت''۔

کیا! تو مسلمان ہے تو اچھوت کیسے ہو گیا؟

پہلے ہندو تھا.. تو اچھوت ذات کا تھا.. اب مسلمان ہو گیا ہوں تو کیا؟ میری ذات تو وہی رہے گی۔

انچارج نے جواب میں کہا:

''اچھا بکواس بند کر''۔

یہ کہہ کر تھانہ انچارج جلدی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے رجسٹر میز پر رکھ کر تیزی سے پرچے کے اندراجات مکمل کئے اور رجسٹر بغل میں دبائے ایس پی کے آفس میں جانے کے لئے پولیس موبائل کی طرف بڑھ گیا۔

دس منٹ کی ڈرائیو کے بعد تھانہ انچارج ایس پی کے دفتر میں پہنچ گیا. ایس پی کے سیکریٹری نے انچارج کو سلام کرنے کے بعد کہا:

''سر! ایس پی صاحب آپ کا ہی انتظار کر رہے ہیں''۔

ایس پی کے دروازے پر کھڑے سپاہی نے تھانہ انچارج کو سلیوٹ کر کے دروازہ کھول دیا۔ انچارج نے ایس پی کو سلیوٹ کیا۔ ایس پی نے تھانہ انچارج سے ہاتھ ملانے کے بعد کہا:

''بیٹھو عمر فاروق!''۔

تھانہ انچارج نے بیٹھتے ہوئے کہا:

''سر! دیکھ لیں رجسٹر، میں کچھ نہیں کر سکتا۔ ویسے میں آپ کی دل سے عزت کرتا ہوں اور آپ کا حکم کبھی نہیں ٹالا۔ اس شقی القلب انسان نے لاکھوں انسانوں کے مسیحا کو شہید کیا ہے... آپ بتائیں.. امریکہ کی حکومت پروفیسر صاحب کو ہر سہولت اور عزت دینے کو تیار تھی لیکن ڈاکٹر صاحب نے اِس ارض پاک پر کیڑے مکوڑوں کی طرح رہنے والے غریب لوگوں کی خدمت کرنے کو ترجیح دی۔

سر! آپ جیسا انسان ایسے عظیم شخص کے قاتل کو چھوڑنے کا تقاضہ کر رہا ہے... مجھے حیرت ہے سر!

سر! اس سفاک قاتل نے معصوم بچے تک کو نہیں چھوڑا''

انچارج کی بات سن کر ایس پی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

وہ انچارج کے پاس آیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

''دیکھو تم کراچی کے تھانہ انچارجز میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے اور با کردار ہو... میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ سندھ پولیس ایک بڑے وقت سے گزر رہی ہے۔ یہ جو تم نے تھانے میں آنکھوں پر پٹی بندھے ہوئے بے شمار لڑکے دیکھے ہیں، یہ سب ایجنسی والوں کی امانت ہیں۔ یہ مجرم نہیں بس اُن کا جرم یہ ہے کہ ان کی پارٹی کے خلاف آپریشن ہو رہا ہے۔ نہ جانے ان میں سے کتنوں کو آزادی ملے گی اور کتنوں کو پھڑکا دیا جائے گا۔ ہماری خفیہ سرکار نے افغانستان میں اسٹریٹجک گہرائی تو حاصل کر لی ہے پر اس گہرائی کو برقرار رکھنے میں نہ جانے کتنی نسلیں برباد ہو جائیں گی۔

میری بات غور سے سنو! اگر تم نے ملزم کو نہ چھوڑا تو میرے اور تمہارے بچوں کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی اور ان کے یتیم ہونے کا خطرہ ہر وقت ہمارے سروں پر منڈلاتا رہے گا۔ ابھی پچھلے ہفتے کی بات ہے کہ ڈپٹی کمشنر سینٹرل نے ایجنسیوں کی حکم عدولی کی تھی اور اب وہ بغیر کسی الزام کے سیف ہاؤس میں تشدد جھیل رہا ہے۔ یہ لوگ اپنے نوے ہزار قیدیوں کو چھڑا کر لانے والے کو سولی پر ٹانگنے میں دیر نہیں کرتے تو میں اور تم کیا ہیں۔ میں تمہارا تبادلہ تمہاری حفاظت کی خاطر لیگل برانچ میں کر رہا ہوں.. جب تک کراچی میں آپریشن جاری رہے تھانہ انچارج بننے کی پیشکش قبول نہ کرنا۔ میں خود بھی اپنا تبادلہ اکیڈمی میں کروانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جب نوکری میں قانون پر چلنا ناممکن بنا دیا جائے تو ایسی پوسٹنگ کو فوراً چھوڑ دینا چاہیے۔ تم یقین کرو کہ پروفیسر نسیم نقوی نے ہی میرے والد صاحب کو دوسری زندگی عطا کی تھی.. وہ میرے بھی محسن ہیں...لیکن ہم دونوں مل کر بھی قاتلوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے..ملزم تو صرف ٹریگر دبانے والا کارندہ ہے۔ اس کے پیچھے اور دماغ ہیں جو اصل قاتل ہیں۔'' لاؤ! رجسٹر مجھے دو!''

تھانہ انچارج نے اپنی ٹوپی سر سے اتار کر ٹیبل پر رکھی اور رجسٹر ایس پی صاحب کو دے دیا۔

انہوں نے ایف آئی آر کا صفحہ نکال کر اسے پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔

تھانہ انچارج نے ایس پی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''اور کوئی حکم سر!''

ایس پی نے کہا:

''تم مجھے چھٹی کی درخواست دے دو میں منظور کرلوں گا۔ کم از کم ایک مہینے کے لئے گاؤں چلے جاؤ..
شاباش! ذہنی دباؤ کم کر کے لیگل برانچ جوائن کر لینا''. یہ سن کر تھانہ انچارج نے ٹیبل پر سے ٹوپی اٹھا کر پہنی
اور سیلوٹ کر کے ایس پی کے کمرے سے نکل گیا۔

تھانہ انچارج نے موبائل میں بیٹھتے ہوئے اپنے ڈرائیور سے سیدھا پولیس اسٹیشن واپس چلنے کو کہا۔ اپنے
کمرے میں جاتے ہوئے وہ راستے میں سب انسپکٹر کے کمرے کے دروازے پر آیا اور اس کو دروازے پر
کھڑے کھڑے حکم جاری کیا:

''تم قتل کے ملزم کو سیل سے نکال کر اور ہتھکڑیوں کے بغیر میرے کمرے میں پیش کرو اور اس سے برآمد
ہونے والا اسلحہ بھی لے کر آؤ''۔

سب انسپکٹر نے کہا:

''یس سر! یہ کہہ کر سب انسپکٹر حکم کی تعمیل بجالانے کے لئے کمرے سے نکل گیا۔

تھانہ انچارج ابھی اپنی سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ ایک اسسٹنٹ کمرے میں آیا اور اس نے کہا:

''سر! میں آپ کے لئے چائے لے آؤں؟۔ آپ کافی پریشان نظر آرہے ہیں''۔

تھانہ انچارج نے کہا:

''نہیں، چائے کی کوئی ضرورت نہیں.... سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس وقت زہر پی کر خودکشی کر لینی
چاہئے... تم جاؤ! اور ہاں! آج کوئی ملاقاتی میرے پاس نہ بھیجنا''۔

اسسٹنٹ کے جانے کے بعد سب انسپکٹر ملزم خالد سفیانی کو لے کر اندر آگیا۔

تھانہ انچارج نے اس سے پوچھا:

''تم کو معلوم ہے کہ تم نے کس کو قتل کیا ہے''؟

''ایک شیعہ کو اور اس کے ساتھ ایک شیعہ بچے کو''۔

انچارج نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے کہا:

''تمہیں معلوم ہے...وہ ایک بہت بڑاڈاکٹر تھا جس نے ہزاروں لوگوں کی جانیں بچائی تھیں''؟

خالد نے جواب میں کہا:''پھر تو بہت ہی اچھا کیا اسے مار کر.... مسلمانوں کو کسی کافر کا احسان نہیں لینا چاہیے''۔

انچارج نے دانت بھینچتے ہوے کہا:

''تمہارے سر میں دماغ کی جگہ گوبر بھرا ہوا ہے''۔خدا غارت کرے اُن لوگوں کو جو لوگوں سے انسانیت چھین کر ان کو درندہ بنا رہے ہیں''۔

انچارج ذرا سوچ کر دوبارہ یوں گویا ہوا:''کیا تمہیں اپنے کئے پر کوئی پچھتاوا نہیں''؟

خالد نے کہا:

''پچھتاوا کیسا؟..اپنے امیر کے حکم کو بجالانے میں دنیا میں بھی خیر ہے اور آخرت میں بھی۔۔اور اگر امیر کا حکم غلط بھی ہو تو بھی اسے بجالانے میں ثواب ہی ہے''۔

انچارج نے خالد کی طرف دیکھے بغیر سب انسپکٹر کو حکم جاری کرتے ہوئے کہا:

''اس کا اسلحہ واپس کر کے اسے چھوڑ دو...البتہ اگر یہ کبھی اس تھانے کی حدود میں دوبارہ نظر آئے تو اس سؤر کو گولی مار دینا..یہ کوئی عام سور نہیں بلکہ اللہ کا خاص اور مقرب سؤر ہے''۔

سب انسپکٹر خالد کو لے کر بیرونی دروازے کی طرف چلا گیا۔

خالد جب تھانے سے باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ حافظ صاحب ایک چمکتی ہوئی پجیرو میں اس کے منتظر تھے۔

(11)

البرٹ کے پُراثر انداز بیان نے کہانی کو اور زیادہ دردناک بنا دیا تھا۔ وہ داستان سنانے کے درمیان مناسب موقعے پر سارنگی کے سروں کو اتنی خوبی سے استعمال کرتا تھا کہ جیسے کوئی نوحہ گر کسی عزیز کی موت پر گریہ کناں ہوں۔ وہ داستان کو یہاں تک سنانے کے بعد رُک گیا اور اپنا حلق تر کرنے کے لئے پانی پینے لگا۔ اس وقفے کو غنیمت جان کر بہت سے طلباء نے سوالات کرنے کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے تھے۔ پروفیسر صاحب بھی جواب دینے کے لئے آمادہ تھے۔

سب سے پہلے فلپ نے سوال کیا کہ:

''کیا غربت اور انتہا پسندی میں کوئی مضبوط رشتہ ہے''؟

پرفیسر صاحب نے جواب دیتے ہوئے کہا:

''نہیں، غربت اور انتہا پسندی میں رشتہ ضروری نہیں۔ مثال کے طور پر پچاس کی دہائی میں پاکستان زیادہ غریب تھا، لیکن معاشرہ انتہا پسندی کی جانب مائل نہ تھا۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں ملک میں ڈالرز کی ریل پیل تھی لیکن معاشرہ انتہا پسندی کی جانب مائل ہو گیا تھا۔ وہ غربت نہیں، جہالت ہے۔ اور اگر ایک نوجوان غریب بھی ہو اور ذہنی سطح بھی پست ہو تو اس کے دماغ کو انتہا پسندی کی جانب مائل کرنا قدرے آسان ہوتا ہے''۔

پروفیسر صاحب نے جواب دینے کے بعد جمیلہ کی طرف دیکھ کر کہا:

''جمیلہ! تم کچھ کہنا چاہتی ہو''؟

جمیلہ نے کہا:

''ایک بڑی تعداد میں یونیورسٹیز سے فارغ التحصیل طلباء بھی انتہا پسندی کا شکار ہوئے.... تو اس سے

آپ کی اس بات کی نفی نہیں ہوتی کہ جہالت انسان کو انتہا پسندی کی طرف لے جاتی ہے''؟

پروفیسر صاحب نے مسکراتے ہوئے یوں جواب دیا:

''مجھے تمہارے تنقیدی اندازِ فکر سے بہت خوشی ہوئی''۔ خود اس زمانے کی انتہا پسندی دہشت گرد تنظیم کے رہبر ایمن الظواہری طب کے پیشے سے منسلک تھے۔ پاکستان، مشرقِ وسطیٰ بلکہ دنیا کے بیشتر ترقی پذیر ممالک میں تعلیم کی بنیاد ایسی نہیں ہوتی تھی کہ جس سے طلباء میں منطق کی بنیاد پر سوال کرنے کی اہلیت پیدا ہو سکے۔ مثال کے طور پر لوگ اگر میڈیسن پڑھتے تھے تو انہیں تاریخ یا فلسفے کا کچھ پتہ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ عجیب بات ہے کہ پاکستان میں تو ہائی اسکول تک میں جغرافیہ نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ تاریخ کے نام پر جو کچھ پڑھایا جاتا تھا وہ تاریخ نہیں بلکہ کچھ اور ہی ہوتا تھا۔ ایسے معاشرے میں یونیورسٹیز سے نکلے ہوئے طلباء کی اکثریت فکر سے عاری ہوتی تھی۔ اسی لئے یونیورسٹیز نے بھی جہادی کلچر کو ترویج دی اور وہاں سے باقاعدہ انتہا پسند نوجوانوں کے غول کے غول تیار ہوئے تھے''۔

اگلی باری فلپ کی تھی.... اس کا سوال تھا کہ:

''کیا انتہا پسندی کا اسلام سے کوئی تعلق تھا''؟

پروفیسر صاحب نے جواب میں کہا:

''کم و بیش تمام اہم مذاہب تاریخ کے کسی نہ کسی موڑ پر انتہا پسندی کا شکار ہوئے ہیں، بعض مذاہب جو آج بے انتہا پر امن ہیں کبھی تشدد سے بھر پور تھے۔ مثلاً مسلمانوں کا فرقہ فاطمی جنہیں اسماعیلی یا آغا خانی بھی کہا جاتا ہے وہ کبھی تشدد کی راہ پر چل نکلے تھے۔ قتل کے لئے مشہور لفظ اساسن دراصل حشاشن سے نکلا ہے۔ ایک فاطمی لیڈر عبداللہ ابن سبا حشیش فراہم کر کے اپنے پیروکاروں کے دماغ پر قابو پا کر ان کے ذریعے اپنے سیاسی مخالفین کو قتل کرواتا تھا۔ یہ قاتل حشاشین کہلاتے تھے۔

پروفیسر صاحب نے اپنی بات ختم کر کے ونود کی طرف دیکھا اور کہا:

''ونود تمہارا سوال آخری ہے... اس سوال کے بعد البرٹ داستان کا اگلا حصہ سنائیں گے''۔

ونود نے اپنی جگہ سے اٹھ کر سوال پوچھا:

''کیا سمیٹک مذاہب کے علاوہ اور مذاہب بھی انتہا پسندی کا شکار ہوئے مثال کے طور پر ہندو''؟

پروفیسر صاحب نے کہا:

''جی ہاں! دیگر مذاہب کی طرح ہندو مذہب میں بھی چالاک لوگوں کی کمی نہ تھی جو مذہب کو سیاسی طاقت حاصل کرنے کا ذریعہ بناتے تھے.... میرا خیال ہے کہ داستان کا اگلا حصہ اس بات سے ہی تعلق رکھتا ہے.. کیوں نہ ہم البرٹ سے درخواست کریں کہ وہ داستان کا اگلا حصہ پڑھیں جو کہ ہندوستان میں مذہبی انتہا پسندی سے متعلق ہے''۔

البرٹ نے پروفیسر صاحب کی بات سن کر اپنے ریڈر پر ایک ہندوستانی کلاسیکل راگ چھیڑ دیا۔

(۱۲)

ارون کے پردادا ناگپور سے بنارس میں آ بسے تھے۔ وہ ہندو یونیورسٹی بنارس میں سنسکرت کے استاد تھے۔ اس اگروال خاندان کی بنارس میں بہت عزت و تکریم تھی۔ ارون کی پیدائش سے پہلے اس کا ایک بھائی اور بہن پیدا ہوتے ہی مر گئے تھے۔ ارون کے پیٹ میں آنے پر، اس کی ماں نے منت مانی تھی کہ اگر آنے والا بیٹا ہوا اور وہ بچ گیا تو اسے وہ ہندوؤں کے عظیم دیوتا شیو جی کا داس بنائیں گے۔ سو ارون کی پیدائش خیریت سے ہوئی اور وہ زندہ رہا۔ بچپن سے ہی اس کے کانوں میں یہ الفاظ پڑے تھے کہ وہ شیو جی کا داس ہے اور انہوں نے ہی اس کو زندگی بخشی تھی۔ کہنے کو تو ارون کے ماں باپ بہت پڑھے لکھے تھے لیکن وہ ہندو مذہب کے سوا کسی اور مذہب کو مذہب کا درجہ دینے کو تیار نہ تھے۔ ان کے گھرانے میں دنیا کے تمام مذاہب کا تمسخر اڑانا عام تھا، خاص طور سے اسلام اور مسلمانوں کے لئے وہاں بے حد نفرت پائی جاتی تھی۔ ارون کے باپ اکثر کہتے تھے کہ مسلمان بادشاہوں نے تمام اہم ہندو سمادھیوں اور مندروں کو توڑ کر ان پر اپنی مسجدیں اور محلات تعمیر کئے تھے۔ اپنے انہی نظریات کی وجہ سے انہوں نے بابری مسجد کے گرائے جانے کی خوشی میں بنارس کے گلی کوچوں میں منوں مٹھائی تقسیم کروائی تھی۔

ہوا کے رخ اور سیاست کی نبض کو پہچانتے ہوئے، ہندو یونیورسٹی کے ایک ریٹائرڈ پروفیسر مکر جی نے بنارس میں ہندو تاریخی عمارتوں کی احیاء کی تحریک کی بنیاد رکھ دی تھی۔ ان کا مقصد اس تحریک کے بل بوتے پر پارلیمنٹ تک پہنچنا تھا. بابری مسجد کے ٹوٹنے سے گویا اُن کی تحریک میں ایک نئی زندگی دوڑ گئی تھی۔ ارون اپنے کالج کے زمانے سے ہی مکر جی کی تحریک سے متاثر ہو کر اس تحریک کا کارکن بن گیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہ مکر جی کا دست راست بن چکا تھا۔ وہ یونیورسٹی سے آنے کے بعد اپنا بیشتر وقت تحریک کے دفتر میں ہی گزارتا تھا۔ اس طرح وہ شاید شیو جی کا داس ہونے کا حق ادا کر رہا تھا۔ اس کی اور اس کے گھر والوں کی نظر

میں، ارون کو زندگی شیو جی کے چمتکار کی وجہ سے ہی ملی تھی۔

ارون ان دنوں ایک سیمینار کا اہتمام کرنے میں بہت مصروف تھا۔ اس سیمینار میں پروفیسر مکرجی کو یہ ثابت کرنا تھا کہ تاج محل دراصل ایک ہندو مندر کو مسمار کر کے اس کی بنیادوں پر تعمیر کیا گیا تھا۔ سیمینار کے اہتمام کے لئے ایک ایسے ہوٹل کو منتخب کیا گیا تھا کہ جس میں کئی ہفتوں سے ہندستان کے مشہور مصوّر علی حسن کے فن پاروں کی نمائش جاری تھی۔ ارون کی انتھک محنت نے یہ رنگ دکھایا تھا کہ سیمینار کی تمام نشستیں بُک ہو چکی تھیں۔ بالآخر آج سیمینار کا دن آ پہنچا تھا۔۔ اس دن کی کامیابی ارون کے لئے قومی سطح پر سیاست کے دروازے کھولنے والی تھی۔

ارون بنارس کے اس مشہور ہوٹل کے دروازے پر ہاتھوں میں گیندے کے ہار لئے مکرُجی کا منتظر تھا۔ اسے زیادہ دیر انتظار کی زحمت نہ اٹھانا پڑی۔ تین کاریں آگے پیچھے ہوٹل کے داخلی دروازے پر آ کر رکیں۔ ان گاڑیوں کے ساتھ پولیس کی گاڑی بھی مکرجی کی حفاظت پر مامور تھی۔ مکرُجی زعفرانی کُرتے اور سفید کلف لگی دھوتی میں ملبوس بڑے کرّ وفر کے ساتھ گاڑی سے نکلے، ارون نے گیندے کے ہار اپنے برابر میں کھڑی دو چھوٹی بچیوں کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ اُس نے خود بڑھ کر مکرجی کے قدم چھوٗ کر ان کا استقبال کیا اور بچیوں کو ان کے گلے میں ہار ڈالنے کا اشارہ کیا۔ مکرجی نے مسکراتے ہوئے پیار سے بچیوں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنی گردن ان ننھی بچیوں کے آگے جھکا دی۔ آس پاس کھڑے ہوئے اخبارات کے فوٹوگرافرز کے کیمروں سے کلک کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ ارون انہیں اور ان کے ساتھ آنے والے دوسرے افراد کو سیمینار ہال کی جانب لے چلا۔ ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اسٹیج پر دو افراد پہلے ہی سے بیٹھے ہوے تھے۔ ان افراد کے درمیان موجود قدرے بڑی اور سنہرے رنگ کی کرسی مکرجی کی منتظر تھی۔ ان کے ہال میں داخل ہوتے ہی ارون نے بلند آواز میں نعرے لگانا شروع کر دیئے:

''ہندو کا ہے ہندوستان.... باقی جائیں پاکستان...تاج بنے گا...شیو مندر...تاج بنے گا...شیو مندر''

سارا ہال ان نعروں سے گونج اٹھا۔ دو مقررین کی افتتاحی تقاریر کے بعد ارون نے مکرجی سے لیکچر کی درخواست کی۔

مکرجی اپنی نشست سے اٹھ کر ڈائس پر آئے اور یوں خطاب شروع کیا:

''بھائیو! بہنو! اور خاص طور سے میرے نوجوان!، دوستو!

''ہندو کا ہے ہندوستان۔۔۔۔۔۔باقی جائیں پاکستان''۔

مکرجی کا اس نعرے کو کیا چھیڑنا تھا کہ سارا ہال ان نعروں سے گونجنے لگا۔

مکرجی نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''دھیرج، دھیرج میرے مترو!.... یہ سارے مُسلے پاکستان جائیں اور بڑے شوق سے جائیں پر اپنے تاج محل کو بھی لیتے جائیں۔ میرے ہندو بھائیو! اور بہنو! میں نے اپنے ایک مضمون کے ذریعے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس استھان کا نام تیجو محلہ تھا جو ہمارے شیو جی کا سب سے پہلا مندر تھا اور اس مندر کو ہمارے راجھستان کے مہاراجہ نے بنوایا تھا۔ ان لٹیرے مسلمانوں کی تو تاریخ ہی یہ رہی ہے کہ دوسرے دھرموں کی عبادت گاہوں کو ڈھا کر اس پر اپنی مسجدیں اور یادگاریں بنا ڈالو۔ میرے دوستو یہ تاج سے جڑی محبت کی کہانی تاریخ کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ شاہ جہاں کی پانچ ہزار سے زیادہ رکھیلیں تھیں... ہماری نہ جانیں کتنی بہنوں اور بیٹیوں کو اس نے رکھیل بنا کر رکھا ہوا تھا۔ ان میں سے اکثریت کو اغوا کر کے لایا گیا تھا۔ بھائیو! اور بہنو! آپ خود ہی فیصلہ کریں۔ پانچ ہزار سے زیادہ لونڈیوں میں گھرے رہنے والے بادشاہ کو کس عورت سے سچی محبت ہوگی؟ یہ تاج، یہ محبت کی نشانی سب جھوٹ ہے۔ لیکچر کے بعد آپ سب کو ایک کتابچہ ملے گا۔ آپ اس کو پڑھ کر حقیقت جان لیں گے کہ تاج دراصل شیو جی کے مندر کی بنیادوں پر بنا ہے۔ ہم غیرت مند ہندو تاج کو ڈھا کر اپنے شیو جی کے مندر کو بحال کر کے ہی دم لیں گے۔ میں سپریم کورٹ میں جا کر ثابت کردوں گا کہ تاج شیو جی کے مندر کو ڈھا کر بنایا گیا ہے۔ اور اگر سپریم کورٹ نے حقیقت سے آنکھیں پھیر لیں تو ہماری گجرات سے آگرہ تک کی یاترہ تاج محل کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گی۔

''میرے پیارے ہندوستانیو!... مجھے دلّی سے ٹورازم کے وزیر نے فون کیا.... آپ کو بتاتا ہوں اس نے کیا کہا؟ اس نے کہا، مکرجی آپ کی بات میں وزن ہے پر تاج کی وجہ سے سرکار اربوں روپے سالانہ کماتی ہے۔ بہت سے سیاح تاج دیکھنے کو ہندوستان آتے ہیں۔ میں نے منتری جی کو کہا۔ آپ نے ہندوستان کو ایک طوائف میں بدل ڈالا ہے۔ ایک خوبصورت طوائف میں جو شام ہوتے ہی سرخی پوڈر لیپ کر اپنے تماش بینوں کو خوش کرنے کے لئے بیٹھ جاتی ہے۔ میں نے منتری جی سے کہا کہ طوائف کی کمائی سے

ہندوستان کبھی غربت سے نہیں نکلے گا۔ اگر ہندوستان کو غربت سے نکالنا ہے تو بدیسی کلچر کے جال سے نکل کر ویدوں کے کلچر کی طرف واپس لوٹنا ہوگا۔ ہندوستان میں تاج کے سوا بھی دنیا کے لئے بہت کچھ ہے''۔

مکر جی نے زوردار نعروں کی وجہ سے اپنی تقریر کو کچھ دیر کے لئے روک دیا۔

کچھ دیر ٹھہر کر مکر جی نے اپنی تقریر دوبارہ شروع کی:

''بھائیو! اور بہنو! اسی ہوٹل میں علی حسن کی تصویروں کی نمائش ہو رہی ہے۔ اس مُسلے نے ہماری دیویوں کی عریاں خیالی تصویریں بنا کر ان کی بے حرمتی کی ہے ہمارے نام نہاد روشن فکر ہندو ان تصویروں کو منہ مانگے داموں خرید کر اس بدبخت علی حسن کو دھنی بنا رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے بڑا پاپ کیا ہوگا کہ ایک مُسلے کے ناپاک ہاتھ ہماری دیویوں کے جسم سے ان کے کپڑے اتاریں''۔

یہ سنتے ہی ہال میں نعرے لگنے لگے:

''علی حسن مردہ باد۔ پھانسی دو پھانسی دو، علی حسن کو پھانسی دو۔

تاج بنے گا شیو مندر۔ تاج بنے گا شیو مندر''۔

ان نعروں کی گونج میں مکر جی ہاتھ جوڑتے ہوئے اسٹیج سے اتر آئے۔ نوجوانوں نے سیمینار کے شرکاء کو مکر جی کا تاج محل کے بارے میں لکھا ہوا مضمون بانٹنا شروع کر دیا۔ ارون مکر جی کو بیرونی دروازے کی طرف لے کر بڑھ گیا۔ صحافی ان کا انٹرویو کرنے کے لئے بضد تھے۔ ارون ان کو صحافیوں سے بچاتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف لے جانے میں کامیاب ہوگیا جہاں پولیس کی ایک گاڑی ان کو بحفاظت واپس لے جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔

ارون جب مکر جی کو رخصت کر کے واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ ہال میں لوگ ابھی تک موجود تھے۔ وہ لوگ کافی مشتعل نظر آرہے تھے۔ ان لوگوں میں شامل ایک نوجوان نے کرسی پر کھڑے ہو کر کہا:

''میرے بھائیو! تاج محل جب ڈھایا جائے گا، تب دیکھیں گے۔۔۔ کیوں نہ ہم اس علی حسن کو ایسا سبق سکھائیں کہ وہ کبھی ہمارے دیوی دیوتاؤں کی بے حرمتی کا خیال بھی دل میں نہ لا سکے۔ چلو میرے بھائیو! آج کے بعد اس مُسلے کو کبھی اپنی تصویروں کی نمائش کرنے کی جرأت نہ ہوگی''۔

یہ کہہ کر وہ نوجوان ہوٹل کی لابی کی طرف بڑھ گیا جہاں ایک ہال میں علی حسن کی تصویروں کی نمائش

جاری تھی۔ نوجوانوں کی ایک خاصی تعداد نعرے لگاتی اس کے پیچھے ہولی۔ یہ سب لوگ ہال کے دروازے پر کھڑے دربان کو دھکیلتے ہوئے ہال میں داخل ہو گئے۔ ان لوگوں نے دیواروں پر سلیقے سے آویزاں فن پاروں کو اتار کر بے دردی سے زمین پر پٹخ کر تباہ کرنا شروع کر دیا۔ لوگوں پر جنون طاری تھا، وہ ان فن پاروں کو جوتوں سے روندر ہے تھے۔

ان لوگوں میں شامل ایک آدمی نے زور سے چیخ کر کہا:

''یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ؟ یہ تو ہمارے دیوی اور دیوتاؤں کی تصویریں ہیں۔

انہیں پیروں میں نہ روندو!

نعروں کے شور میں کوئی بھی اس کی آواز پر کان دھرنے کو تیار نہ تھا۔

کچھ دیر میں پولیس کا ایک لاٹھی بردار دستہ اندر گھس آیا۔ پولیس والوں نے ان لوگوں پر لاٹھیاں برسا کر ہال سے نکل بھاگنے پر مجبور کر دیا لیکن اس وقت تک علی حسن کے تمام فن پارے تباہ و برباد ہو چکے تھے۔

(۱۳)

جب سے ساون گاؤں سے بھاگا تھا، گوٹھ نور محمد کی نادیدہ دیواروں کی قیدی، بھاگ بھری کے بھاگوں میں اندھیرے چھاگئے تھے۔ ویسے بھی وہ کون سے بھاگوں والی تھی۔ ساون ہی اُس کے جینے کا واحد سہارا تھا، جو شام کی خاموشی میں اس سے جدا ہوگیا تھا۔ ساون کے گاؤں سے بھاگنے کے بعد اُس کی زندگی اور مشکل ہوگئی تھی۔ اب ساون کے بدلے کا کام بھی اُسی دکھیاری کو کرنا ہوتا تھا۔ مویشیوں کے باڑوں کی صفائی اور ان کو نہر پر لے جا کر نہلانا بھی اب اسی کی ذمے داری تھی۔

معمول کے مطابق باڑے میں سب جانوروں کا گوبر اکٹھا کرنے کے بعد وہ تھک ہار کر ساون کی پسندیدہ گائے ''لالی'' کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔

اس نے لالی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا:

''لالی تو بھی تو ماں ہے میری طرح؟۔

پر میری طرح کہاں! تیرا تو کوئی بچہ تجھ سے جدا نہیں ہوا۔

دیکھ! لالی میرا ساون تو تیری ایک ماں کے سمان ہی سیوا کرتا تھا۔

تُو بھگوان سے پراتھنا کیوں نہیں کرتی رے؟۔

دیکھ تُو اگر بھگوان سے کہہ دے تو ایک نہ ایک دن وہ واپس آجائے گا۔ یا پھر مجھے اپنے پاس بلالے گا''۔

گائے نے بھاگ بھری کی باتیں سن کر اپنا سر ہلایا، جیسے اس کی باتوں کو سمجھ رہی ہو۔

یہ سب باتیں کرتے کرتے بھاگ بھری کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ اس نے پلوؤ سے اپنے آنسو پونچھنے کے بعد گائے کی آنکھوں سے بھی نمی صاف کی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ لالی بھی اپنے ساون کی باتیں سن کر دُکھی ہوگئی تھی۔

جانوروں کے باڑے سے نکل کر وہ کھیتوں سے گاؤں کی طرف آنے والی پگڈنڈی پر جا کر بیٹھ گئی۔ اس نے چھوٹے وڈیرے جعفر شاہ کو کھیتوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اسی راستے سے واپس آئے گا۔ وہ ایک بار پھر وڈیرے کو اس کا وعدہ یاد دلانا چاہتی تھی جو اس نے ساون کو تلاش کرنے کے بارے میں کیا تھا۔ بھاگ بھری کو پگڈنڈی پر بیٹھے کافی دیر ہو چکی تھی۔

وقت تھا کہ گزر کر ہی نہیں دے رہا تھا۔

سورج ڈھل چکا تھا۔

ڈھلتی ہوئی روشنی میں اسے وڈیرہ جعفر شاہ اپنے دو ملازموں کے ساتھ آتا ہوا نظر آیا۔

وڈیرہ جیسے ہی اس کے قریب سے گزرا بھاگ بھری نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پیوند زدہ چادر وڈیرے کے قدموں میں رکھ دی۔

گویا اس نے اپنی عزت وڈیرے کے پیروں تلے رکھ دی تھی۔ وہ عزت جو کہ آج سے سترہ برس قبل وڈیرہ اپنے پیروں تلے پہلے ہی روند چکا تھا۔

وڈیرہ رک گیا اور اس نے اپنی مخصوص رعب دار آواز میں کہا:

''بھاگ بھری تجھے پھر وہی بات دہرانا ہے کہ میں ساون کو ڈھونڈ کر لاؤں... بابا وہ کراچی بھاگ گیا ہوگا۔ وہ شہر انسانوں کا سمندر ہے وہاں تو حکومت بھی کسی کو نہیں ڈھونڈ سکتی''۔

بھاگ بھری نے التجا کرتے ہوئے کہا:

''سائیں! آپ تو بڑے آدمی ہیں... کتنے بڑے بڑے افسر آپ کی حویلی پر آتے ہیں۔ آپ سب کچھ کر سکتے ہیں اور ساون تو ویسے بھی آپ کا ہی خون ہے''۔

بھاگ بھری نے یہ جملہ سر نیچے کر کے بہت آہستہ سے ایسے کہا تھا کہ وڈیرے سے کچھ دور کھڑے اس کے ملازمین تک اس کی آواز نہ پہنچے۔ بھاگ بھری کی یہ بات سنتے ہی وڈیرے کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ اُس نے بھاگ بھری کے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ وہ زمین پر جا گری، اس کے زمین پر گرتے ہی وڈیرے نے اسے اپنی ٹھوکروں سے مارنا شروع کر دیا اور اس وقت تک مارتا رہا جب تک وہ خود نہیں تھکا۔

کچھ ستانے کے بعد وڈیرے نے کہا:

''تو اچھوت، کم ذات اب ہم عزت داروں پہ الزام لگانے پر اتر آئی ہے۔اب یہ دوبارہ میرے سامنے آئی تو میں اسے گولی ماردوں گا'' یہ بات اس نے اپنے ملازموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہی، اسی دوران گاؤں کی مسجد سے اذان کی آواز آنے لگی۔

وڈیرے نے اپنے ملازموں سے کہا:

''چلواب نماز کا وقت ہوگیا ہے''۔

یہ لوگ بھاگ بھری کو زمین پر گرا ہوا چھوڑ کر مسجد کی طرف چل پڑے۔

(۱۴)

ساون کے نئے روپ یعنی خالد نے کراچی سے کوئٹہ تک دو برسوں میں تاک تاک کر شیعہ ڈاکٹرز کو نشانہ بنایا۔ اُس نے اس تاک کر مارنے کے فن میں کئی شاگرد بھی بنائے اور اپنا فن دوسرے ساتھیوں کو منتقل کیا۔ جہادی حلقے میں سب اس کو ڈاکٹر اسپشلسٹ کے نام سے پکارنے لگے تھے۔ کچھ عرصہ بعد اُسے اوپر والوں نے اچانک 'مشن' سے روک دیا تھا۔

اب خالد کو گھر پر خالی بیٹھے ہوئے کئی ہفتے گزر گئے تھے. کافی دنوں سے خون نہ بہانے کی وجہ سے اسے بے خوابی کے کرب سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ جب تک وہ چھری کی دھار سے اپنے جسم پر زخم لگا کر خون بہتا نہ دیکھے وہ سو نہیں پاتا تھا۔ اس نے قتل کا نشانہ فراہم کرنے والوں سے کئی مرتبہ شکار فراہم کرنے کا تقاضا کیا تھا۔ نگران کی طرف سے یہی جواب ملتا تھا کہ ابھی صبر کرو، حالات ذرا خراب ہیں۔ بہر حال اسے آج ایک اچھی خبر ملی تھی کہ قاری سفیان نے اسے فوری طور پر کشمیر پہنچنے کی ہدایت کی ہے۔ اس پیغام کو پہنچانے والے نے اسے کل کی تاریخ کا اسلام آباد کا ٹکٹ بھی دے دیا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُس کا وہاں فوراً پہنچنا کتنا اہم ہے۔ اسے آزادِ کشمیر پہنچتے ہی بارڈر پار کرنے کا حکم ملا، وہ ایک بار پھر جہاد کشمیر میں مصروف ہو گیا۔ اس نے ہندوستان کے زیرِ انتظام کشمیر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر بہادری کے جوہر دکھائے۔ ان لوگوں نے ہندوستانی فوجیوں پر بہت سے کامیاب حملے کیے مگر اس مرتبہ ان کا نشانہ وہ کشمیری سیاستدان بھی تھے جو جہادی راستے سے منحرف ہو کر سیاسی راستوں کو اپناتے ہوئے کشمیر کے مسئلے کو حکومتِ دہلی کے ساتھ سلجھانا چاہتے تھے۔ تاک کر مارنے میں تو خالد ویسے بھی کافی ماہر ہو چکا تھا، اس نے اس مہارت کو بروئے لاتے ہوئے بہت سے سیاست دانوں کو چن چن کر مارا۔ حکومتِ ہند ان حملوں سے سخت بوکھلا گئی تھی۔ آخر کار ایک حملے کے دوران خالد ہندوستانی فوجیوں کے ہاتھوں زخمی ہونے کے بعد گرفتار ہو گیا۔ مختلف ہندوستانی ایجنسیوں کے ہاتھوں تشدد اور تحقیقات سے گزر کر آخر کار اس کو بدنامِ زمانہ تہاڑ جیل میں قید کر دیا گیا۔ پولیس کے پاس خالد کے کیے ہوئے جرائم کے مکمل ثبوت تھے اور یوں بھی خالد نے ڈھٹائی کے ساتھ تمام جرائم کا اعتراف کر لیا تھا۔ پھانسی کا پھندہ اب اس کا منتظر تھا۔

(۱۵)

کشمیر میں بڑے پیمانے پر مجاہدین کی گرفتاریوں ، کراچی اور لاہور میں جہادی کارروائیوں میں رکاوٹوں پر غور کرنے کے لئے قاری صاحب نے اپنے حجرے میں خاص اجلاس طلب کرلیا تھا۔ جہاد پاکستان وافغانستان کے تمام اہم افراد دردور سے مدرسے میں پہنچ چکے تھے۔ یہ تمام لوگ عشاء کی نماز قاری صاحب کی اقتداء میں ادا کرنے کے بعد حجرے میں جمع ہو چکے تھے۔ ان تمام مہمانوں کے حجرے میں آتے ہی خادموں نے دستر خوان پر کھانا لگانا شروع کر دیا۔ پر تکلف کھانے کے بعد ایک جہادی رہنما نے مجاہدین کی فتح اور ملا عمیر کی درازئی عمر کے لئے دعا کرائی۔

تلاوت قرآن کے بعد باقاعدہ اجلاس شروع ہوا۔ ایک نوجوان آدمی نے رجسٹر کھول کر اجلاس کے موضوعات کا احاطہ کرنے کے بعد اجلاس کی کاروائی قلم بند کرنا شروع کر دی۔ اجلاس ختم ہونے کے بعد قاری سفیان نے حسب معمول دعا کروائی۔ دعا کروانے کے بعد قاری صاحب نے ایک رقعے پر کچھ تحریر کر کے اپنے برابر میں بیٹھے ہوئے شریک مجلس کو تھما دیا۔ اس نے رقعہ کو پڑھ کر اپنے برابر والے کے سپرد کر دیا۔ اس طرح یہ رقعہ گردش کرتا ہوا دوبارہ قاری صاحب کے ہاتھوں میں آ گیا۔ رقعے میں درج تھا کہ '' کچھ اہم امور پر گفتگو کرنا ہے۔ امکان ہے کہ اس کمرے میں ہونے والی گفتگو ایجنسی سن رہی ہے۔ لہٰذا آپ حضرات میرے پیچھے مدرسے کے میدان تک چلیں، وہاں پر مزید گفتگو ہوگی''۔

اجلاس ختم ہونے کے بعد قاری صاحب حجرے سے باہر نکل آئے۔ حجرے میں موجود دیگر افراد بھی قاری صاحب کی تقلید میں ان کے پیچھے ہولئے۔ یہ تمام افراد چہل قدمی کرتے ہوئے ایک دائرے میں بیٹھ گئے۔ یہ لوگ تجسس بھری نظروں سے قاری صاحب کی طرف دیکھنے لگے۔

انہوں نے یہ کہتے ہوئے تجسس کو توڑا:

''اللہ کے مقرب مجاہدو! کچھ اہم باتیں آپ سے کرنا ہے۔ان باتوں کو غور سے سنیں اور گرہ میں باندھ لیں۔حکومت پاکستان نے آنکھیں پھیرنا شروع کردی ہیں۔یہ لوگ نفاذِ اسلام کے وعدے سے پھر گئے ہیں۔ہمیں کہا گیا تھا کہ،آپ لوگ کابل فتح کر کے دیں تو پاکستان میں تمام قوانین اسلام کے مطابق بنائے جائیں گے۔اوپر سے ستم یہ بھی ہے کہ مجھے اور ہمارے چوبرجی مسجد کے حافظ صاحب کو کشمیر سے مجاہدین کو فی الحال واپس بلانے کے لئے کہا گیا ہے۔ہم کو سختی سے یہ حکم دیا ہے کہ اب کوئی مجاہد بارڈر پار کر کے چین میں داخل نہ ہو۔میرے شیر دل مجاہدو! میں جب چینی مسلمانوں پر چینی حکام کے مظالم دیکھتا ہوں تو میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ادھر افغانستان میں جناب امیر المومنین ملا عمیر اور حضرت اسامہ بن لادن کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ملا عمیر چاہتے ہیں کہ وسط ایشیاء سے تیل اور گیس کی پائپ لائن افغانستان کے راستے پاکستان تک پہنچے۔لیکن حضرت اسامہ بن لادن کے خیال میں اس سے مسلمانوں کے اہم مرکز سعودی عرب پر تیل کا دارومدار کم ہو جائے گا۔سعودی عرب کے کمزور ہونے سے کافر ایران کو طاقت ملے گی۔ملا عمیر اور حضرت اسامہ کے درمیان اختلافات کوئی اچھی خبر نہیں۔ہمیں یہ بھی حکم ہے کہ فی الحال شیعوں پر حملے کم کئے جائیں کیونکہ اوپر سے کافی دباؤ ہے۔ظاہر ہے کیوں نہ ہوا! ہماری بدبخت وزیر اعظم اور اس کا شوہر شیعہ جو ہیں۔اللہ نے چاہا تو شیعوں کے قتل پر پابندی لگوانے والی بھی ایک روز کسی مجاہد کے ہاتھوں ہی قتل ہوگی''۔

یہ سنتے ہی سب نے با آواز بلند کہا:

''آمین ثم آمین''۔

قاری صاحب نے یہ تمام معلومات پہنچانے کے بعد دعا کرائی اور کہا:

''اب آپ لوگ آرام کے لئے تشریف لے جاسکتے ہیں۔اللہ بڑا کریم ہے...وقت ایک سا نہیں رہتا۔

سب لوگ رہائشی حصے کی طرف چل دیئے۔۔۔۔۔سب کے چہروں سے فکرمندی عیاں تھی۔

(۱۶)

قاری صاحب کا زیادہ تر وقت کوئٹہ یا قندھار میں گزرتا تھا۔وہ مہینوں اپنے مدرسے سے غائب رہتے تھے۔ان کی غیر موجودگی میں شیخ الحدیث اور ملاّ سواتی مدرسے کے معاملات کو احسن طریقے سے چلاتے تھے۔آج کچھ ماہ کی غیر حاضری کے بعد قاری صاحب اچانک مدرسے میں آ گئے تھے۔ان کے آنے سے مدرسے میں رونق بڑھ جاتی تھی۔ بڑی بڑی گاڑیوں کے آنے جانے سے ایک میلہ سا لگ جاتا تھا۔طرح طرح کے پر تکلف کھانے مہمانوں کے لئے تیار کئے جاتے تھے۔مہمان داری کے طفیل دیگر اساتذہ کو بھی یہ خاص کھانے میسر آ جاتے تھے۔ایک ایسی ہی طفیلی دعوت کے بعد اساتذہ مدرسے کے معالات پر تبادلہ خیال کر رہے تھے کہ قاری صاحب کے سامنے رکھے ہوئے سرخ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

دوسری طرف کرنل صاحب تھے۔

سلام ودعا کے بعد انہوں نے قاری صاحب سے پہلی فلائیٹ سے اسلام آباد پہنچنے کی درخواست کی۔

قاری صاحب نے اچانک طلبی کی وجہ جاننا چاہی تو کرنل صاحب نے کہا:

''بہت اہم بات ہے،فون پر بتانا مناسب نہیں''۔

قاری صاحب نے جواباً کہا:

''بہت مناسب ، میں پہنچ رہا ہوں، کہاں ملاقات ہوگی!''

کرنل صاحب نے جواباً کہا:

''میں مرکزی مسجد میں آپ کے بھائی کے حجرے میں آپ کا منتظر ہوں گا''۔

قاری صاحب نے بہت بہتر کہہ کر فون رکھ دیا اور اساتذہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''اللہ کی رضا ہے کہ میں پھر آپ سے دور چلا جاؤں لیکن انشاء اللہ دوبارہ جلد ملاقات ہوگی ، مجھے

ذرا سفر کے لئے تیار ہونا ہے۔ آپ حضرات معاف فرمایئے گا''۔

یہ کہہ کر قاری صاحب نے سب کو مصافحہ کر کے رخصت کیا اور ساتھ ہی ڈرائیور کو گاڑی تیار رکھنے کو کہا۔ کچھ ہی لمحے میں وہ اپنا مختصر سا بیگ ہاتھ میں لئے چلنے کو تیار تھے۔ محافظین ان کو ائرپورٹ تک چھوڑنے کے لئے چاق و چوبند ڈبل کیبن گاڑیوں میں سوار ہو چکے تھے۔ کچھ گھنٹے بعد وہ ائرپورٹ پر پہنچے تو ایک آدمی وہاں ان کا استقبال کرنے کو موجود تھا جو انہیں وی آئی پی لاؤنج میں لے گیا۔ فلائیٹ کے لئے انہیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ ایک گھنٹے کے بعد جہاز نے اسلام آباد ائرپورٹ کو چھو لیا۔ ائرپورٹ کے بیرونی دروازے پر محافظوں سمیت دو گاڑیاں انہیں لینے کے لئے موجود تھیں۔ یہ لوگ قاری صاحب کو لے کر برق رفتاری سے شہر کی جانب روانہ ہو گئے۔ آدھے گھنٹے کی مسافت طے کر کے وہ اپنی منزل، مرکزی جامع مسجد پہنچ گئے تھے۔ قاری صاحب کے چھوٹے بھائی اس مسجد کے پیش امام تھے۔ گاڑیوں کے رکنے کی آواز سنتے ہی قاری صاحب کے بھائی اور کرنل صاحب ان کا استقبال کرنے حجرے کے دروازے پر آ گئے۔

کرنل صاحب نے آگے بڑھ کر بڑی عقیدت کے ساتھ قاری صاحب کو گلے لگایا۔ اس کے بعد قاری صاحب اپنے بھائی سے گلے ملتے ہوئے حجرے میں داخل ہو گئے۔ کرنل صاحب نے بڑی عقیدت سے ان کے جوتے ہاتھوں میں اٹھا کر جوتے رکھنے والی الماری میں رکھے۔ وہ اس وقت سے قاری صاحب کے عقیدت مند تھے جب وہ ایک نوجوان میجر کے طور پر مجاہدین کی اور امریکی خچروں کی تربیت پر مامور تھے۔ ان امریکی خچروں نے افغانستان کے مشکل ترین پہاڑی راستوں پر ہتھیاروں کی رسد میں اہم کردار کیا تھا۔ کرنل صاحب کچھ عرصے کے لئے کورس پر اسٹاف کالج کوئٹہ چلے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے اپنے کورس میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ کوئٹہ میں بھی کرنل صاحب اور قاری صاحب کے درمیان تعاون کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ انہوں نے کوئٹہ اور قندھار کے درمیان طالبان کی سپلائی لائن کو منظم کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔

یہ سب افراد زمین پر بچھے خوبصورت افغانی قالین پر بیٹھ گئے۔ ایک تھرماس میں چائے تیار تھی، پلیٹ میں طرح طرح کے خشک میوے رکھے ہوئے تھے۔ قاری صاحب کے چھوٹے بھائی نے سب کے لئے تھرماس سے گرم گرم چائے پیالیوں میں انڈیلی۔

قاری صاحب نے کرنل صاحب کی طرف شفیق انداز میں دیکھتے ہوئے کہا:

''آپ کو اسٹاف کالج کے کورس میں امتیازی کامیابی مبارک ہو...اب آپ کو بریگیڈیئر کے عہدے تک آنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ یہ آپ کا حق بنتا ہے کہ آپ کو اللہ تعالی دینی اور دنیاوی ترقی سے سرفراز کرے''۔

کرنل صاحب نے قاری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''آپ کی دعا اللہ نے سن لی ہے، مجھے آپ کی آمد سے کچھ دیر قبل پروموشن کی خبر موصول ہوئی ہے''۔

قاری صاحب نے کھڑے ہو کر ان کا ماتھا چوم کر کہا:

''بیٹا! یہ ایک سچے مجاہد کا حق تھا اللہ تم کو اور ترقیوں سے نوازے''۔

گرم جوشی سے مبارکبادی دینے کے بعد قاری صاحب اپنی جگہ بیٹھ کر گویا ہوئے:

''آپ نے اتنی جلدی میں بلاوا بھیجا! خیر تو ہے؟''۔

کرنل صاحب نے مناسب الفاظ ڈھونڈنے کے لئے کچھ توقف کیا اور پھر بولے:

''ایک اچھی خبر ہے مگر ساتھ میں کچھ الجھن بھی ہے''۔

''خیر! تو ہے کیا خبر ہے؟'' قاری صاحب نے بے تابی سے کہا۔

کرنل صاحب نے جواباً کہا:

''مجاہدین نے نیپال سے انڈین ائرلائن کا طیارہ کامیابی سے اغوا کر لیا ہے۔ عرب امارات کی حکومت نے اس جہاز میں ایندھن بھی بھر دیا ہے اور اس کو پرواز کی اجازت بھی دیدی ہے لیکن''!...لیکن کیا؟۔ قاری صاحب نے بے تابی سے کہا۔ کرنل صاحب نے اپنی بات کو مزید یوں آگے بڑھایا:

''اس جہاز کو قندھار میں اتارنا ہے لیکن وہاں کا گورنر اجازت دینے سے پس وپیش سے کام لے رہا ہے۔ وہ آپ کا شاگرد رہ چکا ہے۔ اگر آپ اس سے کہیں گے تو آپ کی بات کو وہ ایک حکم کی طرح بجا لائے گا''۔

قاری صاحب نے بلا سوچے کہا:

''اچھا میں کوشش کرتا ہوں''۔

کرنل صاحب نے کمرے کے ایک کونے میں رکھے سیٹلائیٹ فون کو اٹھا کر قاری صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ قاری صاحب نے اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب سے چھوٹی سی ڈائری نکالی اور ایک نمبر کو ملا دیا۔ کچھ دیر کی جدوجہد کے بعد نمبر مل گیا۔ دوسری طرف گورنر قندھار موجود تھے۔

قاری صاحب نے اپنا تعارف کروایا اور کافی دیر تک پشتو میں حال احوال دریافت ہوتا رہا۔ حال احوال دریافت کرنے کے بعد قاری صاحب نے کام کی بات کی اور گورنر کا ردعمل سننے کے بعد شکریہ اور الوداعی کلمات کہتے ہوئے فون رکھ دیا۔

کرنل صاحب نے سوالیہ نظروں سے قاری صاحب کی طرف دیکھا۔

قاری صاحب نے کہا:

''مبارک ہو! گورنر راضی ہے لیکن اس کا کہنا ہے کہ جہاز کے اترنے سے پہلے مجھے قندھار میں ذاتی طور پر موجود ہونا چاہیئے تاکہ بعد میں پیش آنے والی صورت حال سے نمٹنے میں ان کی مدد کرسکوں''۔

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہے''۔

یہ کہنے کے بعد کرنل صاحب نے اپنے وائرلیس سے جہاز کو پرواز کے لئے تیار رکھنے کو کہا۔

اس عمل کے بعد انہوں نے قاری صاحب سے کہا:

''آیئے وقت کم ہے اور مشن بہت حساس ہے، مجھے آپ کو اتنی زحمت دینے پر شرمندگی ہے''۔

قاری صاحب نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا:

''یہ جہاد کا حصہ ہے اور ایک مجاہد کی زندگی ایسی ہی ہونی چاہیئے''۔

حجرے کے باہر کرنل صاحب کی گاڑی تیار تھی۔ انہوں نے قاری صاحب کے لئے خود دروازہ کھولا اور بیٹھنے کے بعد ڈرائیور کو تیزی سے چکلالہ ائرپورٹ چلنے کا حکم دیا۔ گاڑی گرد اڑاتی ہوئی تیزی سے مرکزی جامع مسجد سے نکل گئی۔

(۱۷)

ہفتہ وار چھٹی کی وجہ سے یونیورسٹی کا اقامتی بلاک بے رونق تھا. جمیلہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے برف باری کے منظر سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ بلڈنگ کی بیسویں منزل پر سے برف باری کا نظارہ کیا جائے!۔ یہ سوچ کر وہ اپنے کمرے سے نکل کر کومن روم کی طرف چل دی۔ وہ جب کومن روم میں آئی تو اس نے دیکھا کہ وہاں پر البرٹ میز پر سر جھکائے پہلے ہی سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے لمبے اور سنہرے بال اس کے چہرے پر کچھ اس طرح بکھرے ہوئے تھے جیسے کوئی غمزدہ ولو درخت سر جھکائے ہو۔ اس نے البرٹ کو کبھی سنجیدہ اور غمگین نہ دیکھا تھا۔ اُس نے البرٹ کی میز کے نزدیک آ کر کہا:

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں''۔

''ہاں کیوں نہیں''۔ یہ بات البرٹ نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہی۔

جمیلہ نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا:

''کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان سے لگ رہے ہو''۔

البرٹ نے کوئی جواب نہ دیا۔

اب وہ باہر گرتی ہوئی برف کے نظارے سے لطف اندوز نہیں ہو پا رہی تھی۔

جمیلہ نے کچھ دیر کے سکوت کے بعد کہا:

''اچھا ٹھیک ہے، اگر تم اپنی پریشانی بانٹنا مناسب نہیں سمجھتے تو کوئی بات نہیں''۔

البرٹ نے جواب دیا:

''نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ کیتھرین اور میرے درمیان علیٰحدگی ہوگئی ہے''۔

جمیلہ نے حیرانی سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا:

''کیا!! ناقابلِ یقین بات ہے۔تم لوگ گزشتہ تین سالوں سے ایک ہی اپارٹمنٹ میں رہ رہے ہو۔ اور ہم سب تو تم دونوں کو رومیو، جیولیٹ کہتے تھے''۔

البرٹ نے افسردگی سے کہا:

''شاید اسی لئے ہماری کہانی کا انجام بھی الم ناک ہوا ہے''۔

البرٹ کے اس چھوٹے سے جملے نے کہانی کو کم وبیش واضح کر دیا تھا، لیکن پھر بھی کچھ ابہام باقی تھا۔

اس ابہام کو دور کرنے کے لئے جمیلہ نے پوچھا:

''غالباً یہ فیصلہ تمہارا تو نہ ہوگا''۔

البرٹ نے سنجیدگی سے جواب دیا:

''ہاں! یہ فیصلہ کیتھرین کا تھا۔

تم کو تو معلوم ہے کہ وہ بابل لون میں نئے دریافت ہونے والے آثار قدیمہ سے ملنے والی تحریروں پر تحقیق کر رہی ہے۔اب اُسے وہاں چار سال کے لئے جانے کا موقع مل گیا ہے''۔

البرٹ ابھی بات پوری نہیں کر پایا تھا کہ جمیلہ نے بیچ میں لقمہ دیا:

''تو اس میں علیٰحدہ ہونے کا تو کوئی جواز نہیں، لندن سے بابل لون ایک گھنٹے کی پرواز ہے۔تم وہاں جاسکتے ہو۔اور وہ گاہے بگاہے وہ لندن آسکتی ہے''۔

البرٹ نے سر ہلاتے ہوئے کہا:

''تم بالکل ٹھیک کہتی ہو، لیکن وہ بالکل آزاد ہو کر وہاں جانا چاہتی ہے تاکہ مقامی کلچر میں گھل مل کر وہاں کی زبان پر مکمل دسترس حاصل کرے۔وہ وہاں کسی مقامی آدمی سے رشتہ استوار کر کے ایک بابل لون جین رکھنے والے بچے کو پیدا کرنا چاہتی ہے''۔

جمیلہ یہ سن کر کچھ دیر کے لئے گُم سُم ہوگئی اور ایک وقفے کے بعد بولی:

''اور وہ محبت جو تم لوگوں کے درمیان تھی! کیا محبت اتنی ناپائیدار ہوتی ہے؟''

البرٹ نے اپنے رُخسار پر بہتے آنسو کو پونچھتے ہوئے کہا:

''اس سوال کا جواب تم کو کیتھرین ہی دے سکتی ہے''۔

البرٹ کو اتنا غمگین دیکھ کر جمیلہ کا دل بھر آیا۔

اس نے البرٹ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

''مردوں کی آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے''۔

البرٹ نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا:

''یہ بھی عجیب کہاوت ہے۔ کیا مردوں کا دل حساس نہیں ہو سکتا؟''

جمیلہ نے کہا:

''میں تم سے متفق ہوں لیکن یقین کرو کہ محبت کے بارے میں ہر عورت کے خیالات کیتھرین کی سوچ کی مانند نہیں ہوتے''۔

البرٹ نے خود کلامی کے انداز میں کہا:

''کیتھرین میری پہلی محبت تھی۔

میں دنیا بھر سے گم شدہ کہانیاں اکٹھا کرتا ہوں۔ اور اب میری کہانی بھی گم شدہ کہانیوں کا ایک حصہ بن جائے گی''۔

جمیلہ نے کہا:

اچھا چھوڑ دو یہ بات... میں تمہارے لئے کافی لاتی ہوں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟''۔

البرٹ نے جواباً اثبات میں سر ہلا دیا۔

جمیلہ کچھ ہی دیر میں کافی لے آئی اور کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی:

''زندگی کو جاری رہنا چاہیے اور بھرپور طریقے سے جاری رہنا چاہیے۔

تم جیسا آدمی غمزدہ زندگی گزارنے کے لئے پیدا نہیں ہوا ہے''۔

البرٹ نے تشکر بھری نگاہوں سے جمیلہ کی طرف دیکھا۔ دونوں کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے باہر گرتی ہوئی برف کا انتظار کرنے لگے۔

کچھ ہی دیر میں طے شدہ وقت کے مطابق سب لوگ داستان سننے کے لئے آنا شروع ہو گیے۔ البرٹ نے اپنا ریڈر آن کر کے، داستان کا اگلا حصہ پڑھنے کی تیاری شروع کر دی۔

(۱۸)

ساون... مگراب ہم اس کو خالد ہی کہیں گے، قسمت کا دھنی نکلا۔ اسے تہاڑ جیل میں زیادہ وقت نہیں گزارنا پڑا۔ انڈین ائرلائنز کا جہاز اغوا کرنے والوں نے ایک طویل مذاکرات کے بعد مسافروں کی آزادی کے بدلے ہندوستان کی مختلف جیلوں میں قید اپنے ساتھیوں کو آزاد کروالیا۔ اس طرح وہ راتوں رات ہندوستان سے افغانستان پہنچ گیا۔ وہاں پر اس کے مدرسے کے پرانے ساتھیوں نے اس کا والہانہ استقبال کیا۔ افغانستان میں اسے دنیا بھر سے آئے ہوئے مجاہدین سے واسطہ پڑا۔ خاص طور سے عرب اور چیچن مجاہدوں سے اس نے گوریلہ جنگ کے نئے انداز سیکھے۔ وہ عربی مجاہدین جو عراق میں امریکی فوجیوں کے خلاف برسرپیکار رہ چکے تھے، انہوں نے خالد کو سڑک پر آسانی سے نظر نہ آنے والے بم تیار کرنا سکھائے۔ کچھ ہی ماہ میں عرب مجاہدین کے درمیان خالد کو اُستاد کا درجہ دیا جانے لگا۔

طالبان یوں تو کابل فتح کر چکے تھے لیکن افغانستان کے بہت سے علاقے ابھی سرنگوں ہونا باقی تھے۔ شمالی افغانستان اور بامیان کا صوبہ ابھی تک طالبان سے فتح نہیں ہوسکا تھا۔ جب خالد کو معلوم ہوا کہ بامیان صوبے کے رہنے والوں کی اکثریت شیعہ ہے تو وہ بامیان پر لشکرکشی کرنے والے مجاہدین میں شامل ہوگیا۔ بامیان کے باسی طالبان کی نظروں میں مسلمان نہیں تھے اس لئے اِس صوبے کو فتح کرنے کے بعد وہاں رہنے والے منگول نسل ہزارہ شیعوں کا قتل عام کیا گیا۔ ان کے پھل دار درختوں کو کاٹ دیا گیا۔ ان کے مویشیوں اور عورتوں کو مال غنیمت کے طور پر مجاہدوں نے آپس میں تقسیم کرلیا۔ خالد کے حصے میں بھی ایک ہزارہ نسل دوشیزہ آئی جسے وہ کابل لے آیا۔ اُس لڑکی پر دن رات تشدد کر کے اسے بہت سکون ملتا تھا۔ آخر کار اُس لڑکی نے کنویں میں چھلانگ لگا کر اس تشدد سے ہمیشہ کے لئے جان چھڑالی۔

تاریخ کے کینوس پر منظر کتنی تیزی کے ساتھ بدلتے ہیں۔ کبھی یہ منگول ہزارہ ایران سے افغانستان تک کے سارے خطے کے حاکم تھے اور اب ان کی عورتیں باندی بنا کر رکھی جارہی تھیں۔

شمالی افغانستان اور ہزارہ جات کو فتح کرنے کے بعد تمام افغانستان طالبان کی دسترس میں آچکا تھا. ان تمام کامیابیوں کے باوجود اسامہ بن لادن اور ملا عمیر کے درمیان تیل اور گیس کی پائپ لائن پر اختلافات بدستور حل طلب تھے۔ اسامہ بن لادن یوں تو اسلامی امارات افغانستان کی ہر طرح سے مدد کرتے تھے لیکن ساتھ ساتھ اپنے عرب مجاہدین کے ساتھ دنیا بھر میں جہادی سرگرمیوں میں بھی مصروف رہتے تھے۔ چھوٹی موٹی جہادی کاروائیاں کرتے کرتے انہوں نے اچانک امریکا کے کئی شہروں پر ہوائی جہازوں کو عمارتوں سے ٹکروا دیا۔ یہ ایک سپر پاور کے خلاف انتہائی واضح اعلان جنگ تھا۔ امریکی ریاست کو اس حملے نے ہیج پا کردیا تھا۔ آخرکار امریکا نے افغانستان پر حملے کی تیاری شروع کردی۔ پاکستان نے ملا عمیر سے اسامہ کو افغانستان بدر کرنے کی گزارش کی تا کہ کابل کو امریکی حملے سے بچایا جاسکے۔ لیکن کسی مہمان کو دشمن کے حوالے کرنا افغان قبائلی ثقافت کے خلاف تھا۔ امریکا نے پاکستان سے افغانستان پر حملے کے لیے تعاون کو کہا پاکستان نے حسبِ دستور امریکا کا ساتھ دینے کا اعلان کرنے کے بعد اپنے تمام آپریٹرز اور ایجنٹوں کو جہازوں کے ذریعے نکالنا شروع کردیا۔ اس طرح خالد بھی ایک جہاز میں سوار ہوکر اسلام آباد آ گیا۔

اسلام آباد آتے ہوئے اس کے کوہستانی ہم سفروں نے اس سے گلگت کے شیعہ کافروں کو سبق سکھانے کی فرمائش کی۔ خالد شیعوں کا خون بہانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ وہ فوراً ہی اپنے کوہستانی مجاہدوں کے ساتھ گلگت جانے کے لئے تیار ہوگیا۔ یہ سب لوگ راولپنڈی سے بس میں سوار ہوکر پہلے کوہستان آئے۔ وہاں پر اس کے مجاہد ساتھیوں نے اس کی خوب آؤ بھگت کی۔ کچھ روز کے سیر سپاٹے اور آرام کے بعد یہ گلگت آ گئے۔ وہاں کے قدرتی نظارے خالد کے دل کو بھا گئے تھے۔ وہ حیرانی سے گلیشیر سے پگھل کر آنے والے شیشے کی طرح شفاف پانی کو خوبانی اور سیبوں کے باغات کو سیراب کرتا دیکھتا تھا۔

اس نے ایک ساتھی سے کہا:

''کیا واقعی اتنی حسین وادی میں اکثریت شیعہ کافروں کی ہے؟''۔

اس کے ساتھی نے جواب دیا:

''ہاں یہ بات صحیح ہے''۔

خالد نے کچھ سوچتے ہوئے شکوہ نما سوال کیا:

''میرے بھائیو!... میری سمجھ سے باہر ہے کہ اللہ یہودیوں اور شیعوں کو دولت سے کیوں نوازتا ہے!

سعودی عرب میں بھی تیل کے بیشتر کنویں شیعہ علاقوں میں ہیں۔ شکر ہے کہ وہاں پر مسلمانوں نے انہیں چوزوں کی طرح دبوچ کر رکھا ہوا ہے''۔

خالد کے کوہستانی مجاہدوں میں سے ایک نے خالد کے شکوے پر اس طرح اپنا نقطہ نظر بیان کیا:

'' آپ کو اسی لئے یہاں دعوت دی ہے کہ ہمارے لئے ایسا لائحہ عمل مرتب کریں کہ یہ کالے کافر یا تو مسلمان ہو جائیں یا پھر یہ جنت نظیر وادی چھوڑ کر ایران کوچ کر جائیں''۔

خالد نے فوراً جواب دیا۔

'' آپ لوگ فکر نہ کریں میں ان کے خون سے رافضیت نکال ڈالوں گا۔ آخر کار گلگت کو اسلامی امارات کا ہی حصہ بننا ہے۔ گلگت پر ہمارا قبضہ بہت ہی ضروری ہے۔ اس خطے پر قبضے کے بغیر ہمارا جہاد چین تک نہیں پہنچ پائے گا۔ ہمیں سنکیانگ کے ارغن مسلمانوں کو ہر حال میں چین سے آزاد کرانا ہے''۔

خالد کے ایک اور کوہستانی مجاہد نے گفتگو میں مزید لقمہ دیتے ہوئے کہا:

'' یہ گلگتی شیعہ کافر عجیب وغریب شرک، کے کام کرتے ہیں۔ اوپر کی وادی میں یہ لوگ ایک گلیشئر کا دوسرے گلیشیر سے نکاح کرواتے ہیں۔ آج کل گلیشیر کی شادیوں کا موسم ہے''۔

خالد نے چونکتے ہوئے سوال کیا:

'' کیا ان شادی کی تقاریب میں کافی شیعہ اکٹھے ہوتے ہیں؟''

ایک مقامی مجاہد نے کہا:

'' ہاں کافی لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اس تقریب کے بعد یہ لوگ کھاتے پیتے ہیں اور ڈھول بجاتے ہیں''۔

خالد نے سوچتے ہوئے کہا:

'' مجاہدو! سنو! اب تیاری کرو، ہم ان کو ایسا سبق دیں گے کہ یہ لوگ یہ مشرکانہ شادیوں کا ڈھونگ رچانا بھول جائیں گے۔ آپ لوگ معلومات کریں کہ کہاں پر اور کس وقت گلیشیر کی شادی ہونے والی ہے؟''

وادی گلگت وبلتستان کے رہنے والے اپنے ماحول اور قدرتی وسائل سے بہت محبت کرتے ہیں۔ گلیشیرز خاص طور سے اُن کی عقیدت ومحبت کا محور ہیں اور کیوں نہ ہوں! یہ گلیشیرز ہی ان کو اس بلند وبالا وادی میں انتہائی شفاف اور صحت بخش پانی کی فراہمی کا ذریعہ ہیں۔ گلیشیرز کی افزائش نسل کا رواج کچھ دور افتادہ گاؤں میں ایک 'اساطیری روایت' ہے۔ اس روایت کے مطابق گلیشیرز کے رنگ سے اس کی جنس کا تعین

کیا جاتا ہے۔ مٹیالے رنگ کے گلیشیر کو مذکر اور سفید رنگ کے گلیشیر کو مؤنث جان کر ان دونوں کو باہم ملا کر مٹی میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ پرانی لوک مالائی داستانوں کے مطابق اس جگہ پر کچھ برسوں میں ایک نیا گلیشیر۔ ایک نیا پانی کا وسیلہ جنم لے لیتا ہے۔

راکاپوشی پہاڑ کے دامن میں بسے دو قدیم گاؤں کے بزرگوں نے اوپر سکڑتے ہوئے گلیشیر کو ایک نئی زندگی دینے کے لئے، دو گلیشیرز کے درمیان شادی کی تاریخ طے کر دی تھی۔ اس شادی میں شرکت کے لئے آس پاس کے گاؤں کے باسیوں کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ طے شدہ وقت پر تمام لوگ گلیشیر کے پاس جمع ہو چکے تھے۔ نوجوانوں نے وہاں پر پہلے ہی سے ایک گڑھا کھود دیا تھا، جس کے چاروں طرف وادی میں اگنے والے پھول رکھے ہوئے تھے۔ مقامی موسیقار ڈھولک اور رباب پر مقامی لوک دُھنیں بجا رہے تھے۔ موسیقی کی اِن خوبصورت دُھنوں کے درمیان ایک بزرگ خاتون نے اپنے ہاتھ سے دلہن گلیشیر کا ایک ٹکڑا لے کر اس پر ایک چھوٹا سا سونے کا زیور رکھ دیا۔ گویا یہ خاتون دلہن کو سجا رہی تھیں۔ اس عمل کے بعد اس پر ایک کوئلے کا ٹکڑا رکھ دیا گیا۔ یہ سیاہ کوئلہ اس بات کی علامت تھا کہ دلہن نظر بد سے محفوظ رہے گی۔ اس رسم کے بعد ایک بزرگ مرد نے مٹیالے گلیشیر یعنی دولہا گلیشیر کا ٹکڑا دلہن گلیشیر پر رکھ دیا تو سب لوگوں نے مٹی اور پھول ڈال کر گڑھے کو بھر دیا۔ اس رسم کے مکمل ہونے کے بعد لوگوں نے بلند ہوتی موسیقی کی دھنوں پر رقص کرنا شروع کر دیا۔ سب پرامید تھے کہ یہاں پر اب رفتہ رفتہ ایک نیا گلیشیر وجود میں آئے گا جس سے گاؤں میں پانی کی قلت دور ہو جائے گی اور ان کے خوبانی اور سیبوں کے باغات سوکھنے سے بچ جائیں گے۔

جشن اپنے زوروں پر تھا۔ خالد اور اس کے دیگر مجاہد ساتھی ایک چٹان کے پیچھے سے یہ غیر اسلامی مناظر دیکھ رہے تھے. جشن میں شامل لوگ دائرے میں رقص کناں تھے کہ، خالد کے اشارے پر چٹان کے پیچھے چھپے مجاہدین کلاشنکوف تانے ہوئے باہر نکلے اور ایک ایک کو تاک تاک کر نشانہ بنانا شروع کر دیا. فائرنگ اتنے منظم طریقے سے کی گئی کہ کسی کو جان بچانے کا موقع نہ مل سکا. گلیشیر کے دامن میں گلیشیر دولہا اور دلہن کی سیج خون سے رنگین ہو چکی تھی۔ جو لوگ بھاگتے ہوئے قریبی تازہ پانی کے نالے میں گرے تھے اُن کا خون رِس کر شفاف پانی کو گلابی رنگ میں رنگ رہا تھا۔ خالد نے گرے ہوئے لوگوں کے قریب جا کر اطمینان کیا کہ کسی میں زندگی کی رمق باقی تو نہیں. یہ اطمینان کرنے کے بعد وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گیا۔ ان ساتھیوں کو اسلحہ ایک قریبی علاقے میں چھپا کر خالد کو گلگت ائرپورٹ تک پہنچانا تھا تاکہ وہ پہلی فلائیٹ سے اسلام آباد پہنچ سکے۔

(۱۹)

دنیا کی چھت پر بسے ایک دور افتادہ گاؤں میں شیعوں کا قتل عام کرنے کے بعد خالد پہلی پرواز سے راولپنڈی پہنچ چکا تھا۔ وہاں پر ضلع گجرات سے کچھ مجاہدین اس کا استقبال کرنے کے لیے صبح سے ہی ائرپورٹ پر موجود تھے۔ گلگت سے آنے والی پروازیں موسم کی مرہون منت ہوتی ہیں، خالد کی پرواز بھی اپنے وقت سے بارہ گھنٹے تاخیر سے آئی تھی۔ بہر حال وہ علی الصبح راولپنڈی پہنچ گیا تھا۔ اس کے ساتھی اس عظیم اور بہادر کمانڈر کو اپنے درمیان پاکر پھولے نہ سمارہے تھے۔ انہوں نے اس کو پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا تھا۔ ان سب کی منزل گجرات کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ خالد کو وہاں پر مجاہدوں کو جدید طریقے سے بم بنانے اور بارود کا پیشہ وارانہ استعمال کرنے کی تربیت دینا تھی۔ اس مشن کے بعد اس کو واپس اپنی مادر علمی یعنی مدرسے کا رخ کرنا تھا، جہاں اگلے ہفتہ تمام جہادی کمانڈروں کا ایک اہم اجلاس منعقد ہونا تھا۔

جہادی ساتھی اس کی آسانی کے لئے ایک آرام دہ بڑی گاڑی ائرپورٹ لے کر آئے تھے۔ یہ تمام افراد اس گاڑی میں سوار ہو کر اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ انہوں نے موٹروے کے بجائے جی ٹی روڈ کے پرانے راستے کا انتخاب کیا۔ خالد سفر کی تھکان کی وجہ سے گاڑی میں بیٹھتے ہی سو گیا تھا۔

بہت سی گاڑیوں کے ایک ساتھ ہارن بجانے کی بے ہنگم آوازوں سے خالد کی آنکھ کھل گئی۔ کسی مقامی سیاستدان کے انتخابی جلوس نے سڑک بند کر رکھی تھی۔ ملک کے نئے فوجی حکمراں نے ملک بھر میں بلدیاتی انتخابات کا انعقاد ممکن کروادیا تھا۔ سارے ملک میں ان مقامی انتخابات کی گہما گہمی تھی۔ خالد نے گاڑی کے اندر سے باہر کے ماحول کا جائزہ لینا شروع کر دیا اتنے گزرے برسوں میں اسے پاکستان کافی بدلا بدلا لگ رہا تھا۔ سڑکوں پر نئی کاروں اور موٹر سائیکلوں کی بہتات تھی۔ تقریبا ہر آدمی موبائل فون کانوں سے لگائے محو گفتگو تھا۔ گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے اسے ایک گنے کا رس بیچنے والی ریڑھی نظر آئی۔ تازہ تازہ رس نکلتا

دیکھ کراس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ گاڑی سے اتر کر ریڑھی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اس کی تقلید میں باقی مجاہد ساتھی بھی گاڑی سے باہر آ گئے۔ خالد نے سب کے لئے تازے رس کا آرڈر کیا۔ سب کو رس سے بھرا گلاس تھمانے کے بعد اس نے اپنے گلاس کو ایک ہی گھونٹ میں خالی کر کے اپنے لئے ایک اور گلاس کا آرڈر کر دیا۔ گنے کا رس نکالنے والے نے تازہ گنے مشین میں ڈالنا شروع کر دیئے تاکہ مزید رس نکال سکے۔ اسی اثناء میں خالد کی نظر اچانک ایک عورت پر پڑی۔ اس کی پشت خالد کی طرف تھی اس لئے وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے کپڑے بالکل ویسے ہی تھے جیسے اس کی ماں پہنتی تھی، جا بجا پیوند لگے کپڑے لیکن گہرے رنگوں والے۔ خالد کے رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ اس عورت کا تعاقب کرتا ہوا اس کے سامنے آیا۔

اس عورت نے خالد کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر کہا:

''مولا حسین کے نام پر کچھ دیدو بچہ!''۔

خالد نے دل میں اللہ کا بہت شکر ادا کیا وہ اس کی ماں نہیں تھیں۔

اس نے اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''تم اللہ کے نام پر کیوں نہیں مانگتیں؟''۔

بھکارن نے اسے جواب دیتے ہوئے کہا:

''بیٹا! ہم فقیروں کا کیا ہے... جس کے نام پر زیادہ خیرات ملتی ہے اُسی کے نام پر مانگتے ہیں''۔

خالد کی آنکھوں میں اس کے منہ سے لفظ بیٹا سن کر آنسو تیرنے لگے۔

جب سے وہ گھر سے بھاگا تھا کسی عورت نے پہلی بار اسے بیٹا کہا تھا۔ اور تو اور اس عورت کا لہجہ۔ اس کی سرائیکی زبان، سب کچھ اُس کی ماں جیسی تھی۔۔ خالد نے اپنے کرتے کی جیب سے پانچ سو روپے کی نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس بھکارن کے کاسے میں ڈال کر کہا:

''مائی دعا کرنا کہ میری ماں مجھے مل جائے''۔

یہ کہہ کر اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتا ہوا واپس گنے کے رس کی ریڑھی کی طرف آ گیا۔

اس کے ایک ساتھی اسے واپس آتا دیکھ کر دریافت کیا:

''کمانڈر صاحب! آپ اس بھکارن سے کیا باتیں کر رہے تھے؟''۔

خالد نے ناگواری سے مجاہد ساتھی کو کہا:

''خبردار! بھکارن کہہ کر ایک عورت کی تذلیل نہ کرو، وہ بھی کسی کی ماں یا بہن ہوگی''۔

اس کا دل اب کسی سے بات کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ کسی سے اپنے دل کی بات نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کی ماں ہندو ہے اور اگر وہ ابھی زندہ ہوئی تو وڈیرے کے مظالم برداشت کر رہی ہوگی۔ وہ عالم اسلام کا ایک مشہور جہادی کمانڈر تھا۔ وہ کس منہ سے بتا سکتا تھا کہ وہ ایک ہندو ماں کا بیٹا ہے۔ یہ بات قاری صاحب اور مدرسے والوں کے سوا کسی کو بھی نہیں معلوم تھی۔

شام ڈھلے خالد اپنے ساتھیوں کے ساتھ گجرات کے اس چھوٹے سے گاؤں میں پہنچ گیا۔ اس گاؤں کے باسی مختلف عقیدوں سے تعلق رکھتے تھے۔ یہاں شیعہ، سنی، احمدی اور عیسائی پیار و محبت سے رہتے تھے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ شیعہ سنی اور احمدی صدیوں سے اپنے مردے ایک ہی قبرستان میں دفناتے تھے۔ وہاں کے لوگ مردوں میں تفرقے پر بالکل یقین نہیں رکھتے تھے۔ گاؤں کی عمومی ثقافت کے مطابق یہاں کے لوگ بھی بہت مہمان نواز تھے۔ اس مہمان نوازی کا ثبوت خالد کے مجاہد ساتھیوں نے ایک پر تکلف دعوت کا اہتمام کر کے دیا۔ نماز عشاء اور پر تکلف دعوت کے بعد سب نے خالد سے جہاد کے ایمان افروز واقعات سنانے کی فرمائش کی۔ خالد نے کچھ اپنے واقعات اور کچھ سنے سنائے واقعات سنا کر ان مقامی مجاہدین کا دل گرما دیا۔ داستان کے اس مرحلہ کے بعد ایک مقامی مجاہد کمانڈر نے کھڑے ہو کر اس طرح خالد کا شکریہ ادا کیا:

''سب سے پہلے تو ہم سب قاری سفیان کے شکر گزار ہیں کہ جنہوں نے آپ کو ہماری تربیت اور حوصلہ افزائی کے لئے

یہاں بھیجا''۔ آپ کی شجاعت اور بہادری کی وجہ سے ہی آپ کو تمام مجاہدین خالدِ ثانی کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ کتنی عظیم ہوگی وہ ماں جس نے ایک ایسے بہادر بیٹے کو جنم دیا اور اس کا نام تاریخ اسلام کے سب سے زیادہ بہادر انسان.... سیف اللہ... حضرت خالد بن ولید کے نام سے منسوب کیا''۔

خالد کو یہ سنتے ہی زوردار کھانسی آ گئی۔

اس اچانک کھانسی کی وجہ سے مقامی کمانڈر کے خطاب میں رخنہ پڑ گیا تھا۔

خالد کھانستے کھانستے سوچ رہا تھا کہ:

''وہ ساون کے موسم میں پیدا ہوا تھا، اس لئے اس کی ماں نے اس کا نام ساون رکھ دیا تھا۔ اگر وہ سُوکھے (بھادوں) میں پیدا ہوتا تو شاید اس کا نام ''سُوکھا'' رکھ دیا جاتا''۔

ایک مجاہد ساتھی نے جلدی سے پانی کا گلاس خالد کو دیا تا کہ اس کی کھانسی میں افاقہ ہو سکے۔ خالد نے جلدی سے کچھ گھونٹ پانی کے پئے جس سے اس کی کھانسی ختم گئی۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ ان تمام ساتھیوں کے سامنے سچ بول دے اور یہ بات بتادے کہ وہ ایک اچھوت عورت کا بیٹا ہے۔ حضرت خالد بن ولید کی نسبت سے یہ نام اس کو قاری سُفیان نے اس کے اسلام لانے پر دیا تھا۔

خالد نے اشارے سے مقامی کمانڈر کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

جب وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا تو خالد نے کہا:

''آیئے! یہاں کے مسائل پر گفتگو کریں۔ اپنی تعریف سننا انسان کو خود پسندی کے عیب میں مبتلا کر دیتا ہے''۔

ایک مقامی ساتھی نے بات کو یہ کہہ کر آگے بڑھایا:

''اس علاقے کے لوگ اب بھی آپس میں شادی بیاہ کرتے ہیں۔ شیعہ اور سُنیوں میں باہمی شادیاں عام ہیں اسلام پر ظلم کی انتہا تو یہ ہے کہ یہاں سُنیوں اور کافر احمدیوں میں بھی رشتہ داریوں کا رواج ہے''۔

خالد نے کچھ سوچ کر کہا:

''آپ فکر نہ کریں! ہم کچھ ایسا کریں گے کہ یہاں کا ماحول بدل جائے گا۔ یہاں کے مسلمان کافروں سے رشتہ داریاں کرنا بھول جائیں''۔

ایک ساتھی نے سوال کیا:

''کمانڈر صاحب، ہماری تربیت کب سے شروع ہو گی؟؟''۔

خالد نے جواب دیا:

''میں نے کچھ ضروری سامان آرڈر کیا ہے۔ وہ کل تک آجائے گا۔ کل سے ہی آپ لوگوں کی بنیادی تربیت شروع ہو جائے گی''۔

کچھ دیر سوچ کر خالد نے ایک سوال کیا:

''کیا آپ کے ساتھیوں میں کوئی ایسا شخص مِل جائے گا جو یہ جانتا ہو کہ کس قبر میں کس فرقہ کا مردہ دفن ہے اور وہ ان کی نشاندہی کر سکے''۔

ایک ساتھی نے جواب دیا:

''جی کمانڈر صاحب! یہ نشاندہی کوئی مُشکل کام نہیں۔ آپ صرف حکم کریں!''

خالد نے کہا:

''آپ یہ کریں کہ ایک سرخ رنگ سے شیعہ اور قادیانی مردوں کی قبروں پر نشان لگوا دیں۔ یہ کام دو دنوں میں ہو جانا چاہیے''۔

مقامی کمانڈر نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

''جیسا آپ کا حکم جناب''

خالد نے کہا:

''آپ تمام حضرات کا بہت شکریہ۔ ہم اپنے مقاصد ضرور حاصل کریں گے۔ آپ لوگ دیکھیں گے کہ ایک سال کے اندر اندر اس علاقے میں شیعہ، احمدی اور مسلمان ایک دوسرے سے شدید نفرت کرنے لگیں گے۔ اور یہ نفرت ہونی بھی چاہیئے۔ اللہ نے حکم دیا ہے کہ مسلمان کافروں سے نفرت کریں اور ان سے معاشرتی میل جول نہ رکھیں''۔

ایک ساتھی نے یہ سن کر بے اختیار کہا:

''واہ! ماشااللہ! کیا ایمان افروز بات کی ہے!'' اللہ نے آپ کو یونہی غازی کے رُتبے سے نہیں نوازا''۔

خالد نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا:

مجاہدو! اب آپ بھی تھک چکے ہوں گے اور میں بھی کافی تھک چُکا ہوں۔ کیوں نہ اب سونے کی تیاری کی جائے''۔

یہ کہہ کر خالد اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے کھڑے ہوتے ہی باقی افراد بھی کھڑے ہو گئے اور اس سے باری باری مصافحہ کر کے کمرے سے نکل گئے۔

(۲۰)

گاؤں کی چکی کی کوُ کوُ ، جانوروں کے گلوں میں پڑی گھنٹیوں کی جرس اور ٹریکٹروں کے انجن کی گھڑ گھڑاہٹ کے مِلے جلے شور سے خالد کی آنکھ کھُل گئی تھی۔ وہ دوسرے ساتھیوں کے ساتھ لوٹا ہاتھ میں تھامے رفع حاجت کے لئے کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو ساتھیوں نے نماز فجر کے لئے مصلاّ بچھا دیا تھا۔

خالد نے نماز کی صف بندی کی تیاری دیکھ کر کہا:

''کیوں نہ گاؤں کی مسجد میں نماز ادا کی جائے؟''۔

ایک ساتھی نے جواب میں کہا:

''یہاں کے مسلمان ابھی مکمل مسلمان نہیں۔ نماز کے بعد گلا پھاڑ کر، گا گا کر درود سلام پڑھتے ہیں۔ میرے خیال میں ایسے مُشرک امام کے پیچھے نماز جائز نہیں''۔

خالد نے ایک سکہ بند مُفتی کی طرح کہا:

''ہاں بالکل جائز نہیں، اور ہمارا فرض ہے کہ اس شرک کو ہم اس گاؤں سے اُکھاڑ پھینکیں''۔

ایک ساتھی نے دریافت کیا:

یہ کیسے ممکن ہوگا؟''

خالد نے کہا:

''میں قاری صاحب سے کہوں گا کہ اس علاقے میں ایک مدرسے کی اشد ضرورت ہے تاکہ نئی نسل کو گمراہ ہونے سے بچایا جاسکے۔

ایک نئی مسجد اور ایک مدرسے کا قیام اس گاؤں سے شرک کا زہر نکالنے کے لئے ضروری ہے۔ مدرسے

میں آس پاس کے غریب بچوں کو مفت کھانا، کپڑا اور وہ سب کچھ ملے گا جو ریاست پاکستان ان کو دینے کے قابل نہیں۔ جب یہ مقامی بچے دین خالص کے زیور سے آراستہ ہو کر میدان میں نکلیں گے تو انشاءاللہ یہاں کے تمام عیسائی اور قادیانی اسلام قبول کر لیں گے اور یہاں کا چرچ مسجد میں تبدیل ہو جائے گا''۔

یہ بات سن کر سب نے یک زبان ہو کر انشاءاللہ کہا۔

''نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے''۔ ایک ساتھی نے باہر پھیلنے والے اجالے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ خالد نے فوراً ہی امامت کا منصب سنبھال لیا۔

نماز ختم ہونے کے بعد ایک ساتھی نے کہا:

آیئے، ہم آپ کو گاؤں کی سیر کرائیں تب تک ناشتہ بھی تیار ہو جائے گا''۔

خالد نے جواب میں کہا:

''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن گاؤں والوں کو کوئی شک نہ ہو جائے''۔

ایک جہادی بھائی نے جواب میں کہا:

''آپ فکر نہ کریں، گاؤں میں اور قرب و جوار میں ہماری دہشت ہے۔ جب سے ہم نے پولیس کے ایک ایس پی کو نشانہ لگا کر مارا ہے، پولیس بھی ہمارے سامنے سے نہیں گزرتی۔ وہ ایس پی بھی کوئی عام افسر نہیں تھا بلکہ اس وقت کے وزیر داخلہ کا قریبی رشتہ دار تھا۔''

خالد نے اپنا رومال کندھے پر ڈالتے ہوئے کہا:

''چلیں! آپ سب کے ساتھ گاؤں کے سیر کرتے ہیں''۔

یہ سب لوگ اس گاؤں کے ساتھی مجاہدین کی رہبری میں کھیتوں کے بیچوں بیچ بل کھاتی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے قریبی نہر کی جانب چل دیئے۔ پگڈنڈی کے دونوں اطراف باسمتی چاول کی فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ فضا میں باسمتی چاول کی خوشبو اس طرح رچی بسی تھی کہ جیسے کسی نے چاول کی دیگیں چڑھا رکھی ہوں۔ کچھ دور چلنے کے بعد پگڈنڈی نہر کی طرف مڑ گئی۔ وہ لوگ اب نہر کی پٹڑی پر چل رہے تھے۔ دونوں جانب شیشم اور شاہ بلوط کے پرانے درختوں کی شاخیں کہیں کہیں نہر کے پانی کو چھو رہی تھیں۔

خالد نے دل میں سوچا:

''یہ خوبصورت نہر جنت میں بہنے والی نہروں سے کچھ کم تو نہیں، بس صرف حوروں کی کمی ہے''۔ ابھی وہ حوروں کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس کو ایک درخت کے نیچے گاؤں کی لڑکیاں نہاتے ہوئے نظر آئیں۔ جوانِ مردوں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر اپنے کپڑے ہاتھوں میں اُٹھائے، جھاڑیوں کے پیچھے چھپ گئیں۔ ان کے برابر سے ایک لڑکا بہت سی بھینسوں کو ہانکتا ہوا نہر میں گھس گیا۔ خالد کی نظر میں اس کا بچپن ایک فلم کی طرح چلنے لگا۔ وہ وڈیرے کے مویشی اسی طرح سے ہنکا کر نہر پر لے جاتا تھا۔ وہ اکثر اپنی پسندیدہ گائے لالی کی پیٹھ پر کھڑے ہو کر نہر کے پانی میں چھلانگ لگاتا تھا۔

ایک مقامی ساتھی نے خالد کو یوں خیالوں میں گمُ دیکھ کر کہا:

''لگتا ہے کہ آپ کو ہمارے گاؤں کے قدرتی حُسن نے مسحور کر دیا ہے''۔

خالد چونک کر ماضی کی یادوں سے نکل آیا۔

پگڈنڈی پر چلتے چلتے وہ لوگ ایک دوسرے راستے سے گاؤں میں داخل ہو گئے۔ مقامی ساتھیوں نے گاؤں کا قبرستان دِکھایا جہاں گاؤں کے تمام مردُے دفن ہوتے تھے۔

ایک ساتھی نے سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی ایک سادہ سی عمارت کی طرف اشارہ کر کے کہا:

''یہ گاؤں کا چرچ ہے، ہر اتوار کو یہاں کافی رونق ہوتی ہے''۔

اس عمارت پر لگی ایک بڑی سی صلیب اس کے چرچ ہونے کو نمایاں کر رہی تھی۔ گاؤں کا رہنے والا ساتھی گاؤں کے بارے میں کچھ اور بھی بتانا چاہتا تھا کہ خالد کے فون کی گھنٹی بجنے کی وجہ سے اسے خاموش ہو جانا پڑا ۔ خالد نے پشتو میں کافی دیر سلام دعا کی۔ دوسری طرف سے اسے بتایا گیا کہ بیس کلو بیسن کا حلوہ، دس کلو سوجی کا حلوہ، بادام پستے سمیت آج دوپہر تک گاؤں میں پہنچ جائے گا۔ یہ خبر دے کر فون کرنے والے نے فون بند کر دیا۔ کچھ مقامی مجاہد جو افغان جہاد میں شامل رہ چکے تھے، وہ پشتو سمجھتے تھے۔ وہ لوگ معنی خیز نظروں سے خالد کی طرف دیکھنے لگے۔

خالد نے ان کی سوالیہ نگاہوں کو بھانپتے ہوئے کہا:

''آپ لوگوں کو جدید سامان کے استعمال کی تربیت دینا ہے تو سامان کی بھی تو ضرورت ہے۔ بیسن کے حلوہ سے مراد سی ۴ اور سوجی کے حلوے سے مراد ٹی این ٹی بادام پستوں سے مراد مختلف ڈیٹونیٹرز اور سرکٹ

بنانے کا سامان اور بیٹریاں وغیرہ ہے۔

یہ لوگ گھومتے پھرتے واپس گاؤں کے ساتھی کے مکان پر آ گئے۔ وہاں پر ناشتہ دسترخوان پر لگ چکا تھا۔ سب نے مؤلی کے پراٹھے اور گرم گرم چائے کا لطف اٹھایا۔

عصر کی نماز کے بعد خالد نے ایک بڑے سے کاغذ پر مختلف ڈرائنگز اور سرکٹ بنائے۔ ساتھ ہی اس نے مختلف بارودی مواد کو سب ساتھیوں کو دکھایا۔ سی فور ۴ اس کا پسندیدہ بارود تھا۔ اس نے اس زردی مائل بارود کو سب کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا:

''دیکھیں! یہ دیکھنے میں کتنا نرم ہے لیکن جب یہ پھٹتا ہے تو اس کی شدّت کے آگے ٹینک تک ڈھیر ہو جاتا ہے۔ یوں تو یہ بے ضرر ہے، آگ بھی اس پر اثر نہیں کرتی۔ لیکن معمولی سے ڈیٹونیٹر کی لہروں سے یہ اتنی شدت سے پھٹتا ہے کہ لوہا پگھل جاتا ہے۔ میں آپ کو آج دو طرح کے ڈیٹونیٹرز استعمال کرنا سکھاؤں گا۔ دو دن کی تربیت میں آپ لوگ سرکٹ بنانا بھی سیکھ جائیں گے اور اپنے بنائے ہوئے بموں کو موبائیل فون کے ذریعے اڑانا بھی سیکھ لیں گے۔ فی الحال اس سطح کی تربیت آپ لوگوں کے لئے کافی ہوگی۔ انشاء اللہ یہ تربیت آپ کی جہادی سرگرمیوں کو چار چاند لگا دے گی''۔

دو دن کے اندر خالد نے کم طاقت کے بم تیار کروا کے قریبی جنگل میں دھماکے کرا کے سب کا امتحان لیا۔ سب ہی افراد نے اس کی توقع سے بڑھ کر محنت سے بم بنانے کا فن سیکھ لیا تھا۔

ان سب کا آخری امتحان لینے کے بعد خالد نے کہا:

''آج رات آپ لوگ کاروائی کے لئے تیار ہو جائیں۔ آج رات ہم بہت سے بم بنائیں گے۔ کچی قبروں کے لئے کم طاقتور اور پکی قبروں کے لئے ذرا زیادہ بارود والا۔ آپ لوگ آج دوپہر کچھ آرام کرلیں کیونکہ شاید ساری رات ہمیں کام کرنا پڑے۔ یہ کہہ کر خالد نے سب کو جانے کیا جازت دے دی۔

خالد نے پہلے سے تیار شدہ بم، بہت سے تار اور ڈیٹونیٹرز ایک تھیلے میں رکھے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ قبرستان کی طرف چل پڑا۔ گاؤں میں بالکل سناٹا تھا۔ فضا میں جھینگروں کے شور کے علاوہ کوئی اور آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ کبھی کبھی کوئی کتا بخ بھؤ کی آواز نکال کر خود ہی خاموش ہو جاتا تھا۔ خالد نے مقامی ساتھیوں کی مدد سے نشان زدہ قبروں تک ڈیٹونیٹرز تاروں سے جوڑ کر پہنچا دیے۔ ساتھی مجاہدین نے ڈیٹونیٹرز کو بارود

میں اچھی طرح گھسا کراسے قبروں کے سوراخ میں ڈال دیا۔ یہ سوراخ کرنے کے لئے انہیں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی تھی۔ اس سارے کام کو انجام دینے میں صبح کے چار بج گئے تھے، خالد اب تمام ساتھیوں کو لے کر قبرستان سے باہر گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیٹری تھی جس کا تار تمام مطلوبہ قبروں سے جڑا ہوا تھا۔

ایک محفوظ اور قدرے بلند مقام پر آ کر اس کے ایک ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''آپ ہمارے مشن کی کامیابی کے لئے دعا کریں''۔

اس ساتھی نے فوراً دعا کے لئے ہاتھ اٹھا کر کہا:

''اے میرے اللہ! جو لوگ دین خالص کی طرف نہ پلٹیں ان کو نیست و نابود فرما۔

اے میرے اللہ! یہ پاک وطن اسلام کے نام پر بنا تھا، اس کو ایک اسلامی ملک بنادے۔

ہمارے جہاد میں ترقی، و برکت عطا فرما''۔

جیسے ہی دعا ختم ہوئی سب نے ایک آواز ہو کر آمین کہا۔

خالد نے نعرہ تکبیر بلند کیا۔

جیسے ہی سب نے اللہ اکبر کہا! خالد نے بیٹری کا بٹن دبا دیا۔

ایک ساتھ کئی دھماکے ہوئے۔ قبرستان روشنیوں میں نہا گیا۔

قبروں سے مردوں کی ہڈیاں اچھل اچھل کر فضا میں بلند ہو گئیں۔

قبروں کے نزدیک اگی ہوئی خشک جھاڑیوں نے آگ پکڑ لی۔

ایک کھوپڑی فضا میں بلند ہوتی ہوئی عین ایک مجاہد ساتھی کے سر پر گری۔ وہ چوٹ لگنے یا خوف کی وجہ سے گر کر بے ہوش ہو گیا۔

خالد نے اس ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''چلو! اس کو کندھے پر لا دو اور یہاں سے چلو اب یہاں پر ٹھہرنا مناسب نہیں''۔

سب ساتھی فوراً وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔

گاؤں کے باسی دھماکے کی خوفناک آواز سے جاگ گئے تھے۔ بہت سے دیہاتی ہاتھوں سے لالٹین لئے گھروں سے نکل آئے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ زلزلہ آیا تھا، کسی کا کہنا تھا کہ ہندوستان نے حملہ کر دیا ہے۔

عرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ زلزلے کے آثار کہیں بھی نمایاں نہ تھے۔ گاؤں کے کچے اور پکے مکانات صحیح وسالم تھے۔ یہ دیہاتی گردوپیش کا جائزہ لیتے، ہوئے چہ میگوئیاں کرتے ہوئے واپس گھروں کو آ گئے۔

گاؤں کے ایک بزرگ کا معمول تھا کہ وہ فجر کی نماز سے پہلے قبرستان میں فاتحہ خوانی کے لئے آتے تھے۔ وہ حسب معمول پو پھٹنے سے پہلے قبرستان میں آئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں جا بجا قبریں کھلی ہوئی تھیں۔ ہر طرف مردوں کی ہڈیاں، بکھری پڑی ہوئی تھیں۔ آوارہ کتے ہڈیوں کو منہ میں دبوچے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ ان بزرگ نے کتوں کو بھگانے کی بڑی کوشش کی مگر وہ ایک قبر سے دوسری قبر میں گھس جاتے تھے۔ آخر کار تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ اوسان بحال ہونے کے بعد وہ مسجد کی طرف چل پڑے۔

مسجد میں لوگ جماعت کے لئے جمع ہو چکے تھے۔ بزرگوار نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا:

''غضب ہو گیا ہے قبرستان پر چڑیلوں نے حملہ کر دیا ہے۔ آدھے سے زیادہ قبریں کھلی پڑیں ہیں اور مردوں کی ہڈیاں باہر نکلی پڑی ہیں۔

سب لوگ فوراً قبرستان چلیں''۔

ایک نمازی نے پیش امام کو مخاطب کر کے کہا:

''مولانا صاحب! جلدی سے نماز پڑھائیں۔۔ ہم سب کو جا کر دیکھنا چاہیے کہ ماجرا کیا ہے''۔

مولانا صاحب نے یہ سنتے ہی اقامت کہی اور جلدی جلدی نماز ختم کی۔ سب نمازی تیز تیز قدم اُٹھائے قبرستان کی طرف چل پڑے۔ قبرستان کی حالت دیکھ کر کمزور دل کے افراد رونے لگے۔ ایک سمجھدار آدمی نے فوراً ایک موٹر سائیکل سوار کو پولیس چوکی پر اطلاع کرنے کے لئے روانہ کر دیا۔

ایک نوجوان نے کہا:

''پولیس کیا کرے گی؟ نامعلوم افراد کے خلاف پرچہ درج کر لے گی''۔ سب لوگ اس نوجوان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ آہستہ آہستہ اس واقع کی خبر گاؤں میں پھیل گئی تھی۔

(۲۱)

خالد گجرات کے دور افتادہ گاؤں کے مجاہدوں کو تربیت دینے اور اُس کے نظریات کے مطابق غیر مسلم مُردوں کی قبور کو تباہ کرنے کے بعد اپنی مادرِ علمی کے دروازے پر کھڑا تھا۔ برسوں پہلے یہاں سے کراچی، پھر کراچی سے کشمیر اور پھر افغانستان جہاد کے لئے چلا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہ منظر ابھی تک محفوظ تھا جب وہ اس مدرسے کی دیوار کے سائے میں نقاہت کی وجہ سے بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ اس مدرسے نے اِس کو کھانے کو دیا، رہنے کو جگہ دی، قاری صاحب نے اِس کو باپ جیسا پیار دیا، وہ جہاں بھی، جس محاذ پر بھی برسر پیکار رہا، قاری صاحب نے اس سے ہمیشہ رابطہ رکھا۔ خیالوں کی دنیا سے نکل کر اس نے مدرسے کے چھوٹے گیٹ کو کھٹکھٹایا۔ ایک باریش نوجوان نے دروازہ کھول کر پوچھا:

''آپ کو کس سے ملنا ہے؟''۔

خالد نے نوجوان سے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا:

''میرا نام خالد سفیانی ہے، میں قاری سفیان کا مہمان ہوں''۔

دروازہ کھولنے والے نوجوان نے یہ سنتے ہی جوش میں کہا:

''پہ خیر!... پہ خیر!... آپ یقیناً کمانڈر خالد ہیں... سارا مدرسہ آپ کی آمد کا منتظر ہے''۔

یہ کہہ کر نوجوان خالد کا سفری تھیلا اپنے ہاتھ میں تھام کر خالد کو قاری سُفیان کے حجرے کی طرف لے چلا۔ حجرے کے باہر بیٹھے ہوئے محافظ خالد کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے وہ اس کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ خالد نے خود ہی کہا:

''یارا تم نے بھی نہیں پہچانا؟ میں خالد ہوں''، دونوں محافظ اپنے ہتھیار کرسیوں پر رکھ کر اسُ سے بغل گیر ہو گئے۔

اس گرمجوش استقبال کے بعد ایک محافظ نے کہا:

''ماشاءاللہ! کیسا قد کاٹھ نکالا ہے۔ جہاد کی برکتوں نے تم کو ایک نوجوان لڑکے سے ایک مردِ آہن میں تبدیل کر دیا ہے۔ سارے مدرسے کو تمہارے کارناموں پر فخر ہے۔ چلو! آؤ! قاری صاحب صبح سے تمہارے منتظر ہیں۔ قاری صاحب کو خالد کے آنے کی خبر مل چکی تھی۔ وہ اپنے منہ بولے، بیٹے کا استقبال کرنے خود ہی دروازے پر آگئے تھے۔ انہوں نے خالد کو دیکھ کر دور ہی سے اپنے بازو اس کو گلے لگانے کے لئے وا کر لئے تھے۔ خالد بے اختیاری سے قاری صاحب سے لپٹ گیا۔

قاری صاحب نے اسے گلے سے لگانے کے بعد اس کی پیشانی کہ چومتے ہوئے کہا:

''ماشاءاللہ! ماشاءاللہ!۔ تُو تو سر سے پیر تک مجاہد ہو گیا ہے۔ تجھ کو اللہ نے غازی کا رُتبہ عطا کیا ہے۔ قسم ہے!

مجاہدوں کے پاک خون کی۔۔۔۔ تُو اس دور کا خالد بن ولید ہے''۔

خالد نے مختصراً جواب میں کہا:

''میں جو کچھ بھی ہوں آپ کی وجہ سے ہوں'' قاری صاحب اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئے اور دیوار کے ساتھ بچھے ہوئے گدّے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گئے۔

بیٹھنے کے بعد قاری صاحب نے کہا:

''اتنی کم عمر میں، جتنی کامیابیاں تمُ نے حاصل کی ہیں وہ اللہ کے حکم اور اس کی رضا کے بغیر ممکن نہ تھیں''۔

قاری صاحب نے یہ جملہ اُوپر کی طرف اس طرح دیکھتے ہوئے کہا جیسے وہ آسمانوں پر لکھا ہوا پڑھ کر یہ سب کہہ رہے ہوں۔

خالد نے شکر گزار نگاہوں سے قاری صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''اگر آپ کی عنایات اور دُعائیں شاملِ حال نہ ہوتیں تو میں اس مقام پر کہاں پہنچ سکتا تھا۔ کہاں ایک وڈیرے کے سوکھے ٹکڑوں پر پلنے والا اچھوت اور اب ایک مجاہد کمانڈر یہ سب آپ کی دین ہے''۔

قاری صاحب نے خالد سے کہا:

''تم سفر سے آئے ہو۔ پہلے جا کر غسل کر لو! اور ہاں! محافظ تم کو برابر والے گھر کی چابی دے دے گا۔ اب تم کمرے میں نہیں ایک گھر میں رہو گے جو ایک کمانڈر کے شایانِ شان ہونا چاہئے''۔

خالد اپنے سفری تھیلے سے دھلا ہوا کرُتا شلوار نکال کر حمام کی طرف چلا گیا۔ یہ غسل خانے بالکل پہلے جیسے ہی تھے۔ بس فرق یہ تھا کہ حمام میں آنے جانے والے کسی طالب علم کو وہ نہیں پہچان سکتا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار غسل خانہ اس مدرسے میں ہی دیکھا تھا۔

وہ یہ سوچتا ہوا غسل خانے میں گھس گیا کہ:

''بہتی نہر میں نہانے میں جو مزا ہے وہ دُنیا کے کسی غسل خانے میں نہیں''۔

خالد غسل کر کے قاری صاحب کے حجرے میں آیا تو وہاں دستر خوان لگ چکا تھا۔ وہاں پر قاری صاحب کے علاوہ مُلّا سواتی، جن کے سر اور داڑھی کے بال سفید ہو چکے تھے موجود تھے۔ خالد کے ہاتھوں ان کی پیشانی پر لگا ہوا زخم کا نشان ایک صلیب کی صورت میں ابھی تک ان کے ماتھے کے بیچوں بیچ نمایاں تھا۔ شیخ الحدیث کی توندان گزشتہ سالوں میں دوگنا ہو چکی تھی۔ خالد کو اندر آتا دیکھ کر مُلّا سواتی نے اُٹھ کر اس کا استقبال کیا اور گرمجوشی سے گلے ملے۔ خالد کو اُن سے گلے ملتے ہوئے اب بھی کراہیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اُن سے گلے ملنے کے بعد اس نے شیخ الحدیث سے مصافحہ کیا۔ وہ بے چارے مٹاپے کی وجہ سے اپنی جگہ سے ہلنے سے قاصر تھے۔ خادم دستر خوان پر کھانا لگا چکا تھا۔ قاری صاحب نے خود اپنے ہاتھ سے خالد کی پلیٹ میں سالن ڈالا۔ مُلّا سواتی کی پیشانی پر پڑنے والے بل بتا رہے تھے کہ قاری صاحب کا خالد پر اتنا مہربان ہونا شاید انہیں نہیں بھا رہا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد قاری صاحب نے مُلّا سواتی اور شیخ الحدیث کو مخاطب ہو کر کہا:

''آپ حضرات یہاں تشریف رکھیں!، میں خالد کو اس کا حجرہ دکھا دوں۔ یہ کہہ کر قاری صاحب خالد کو اپنے ساتھ لے کر باہر نکل گئے خالد کے حجرے کی طرف چہل قدمی کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

بیٹا! میں تم پر فخر کرتا ہوں، تمُ نے واپسی پر وادی گلگت میں جو دہشت پھیلائی ہے میں اس بات سے بہت خوش ہوں لیکن قبروں کو بموں سے اڑانا قبائلی علاقوں میں تو قبول کر لیا جاتا ہے لیکن شہروں سے وابستہ علاقوں میں یہ عمل لوگوں کو ہمارے خلاف اکسا سکتا ہے۔ آئندہ شہروں میں قبروں کو نشانہ نہ بنانا، ابھی اس کا

وقت نہیں آیا ہے، میرے بیٹے وقت ذرا بدل گیا ہے۔ امریکا یورپی ملکوں کو ساتھ ملا کر افغانستان میں آ بیٹھا ہے۔ پر تم فکر نہ کرو۔ امریکیوں کو شاید معلوم نہیں کہ افغانستان غیر ملکی فوجوں کو راس نہیں آتا ہے۔ جس طرح ہم نے قربانیاں دے کر روس کو باہر نکالا اسی طرح ہم اپنے خون کا نذرانہ دے کر امریکی کتوں کو بھی وہاں سے نکال باہر کریں گے۔ اور اس بار جو اسلامی حکومت کابل میں تشکیل پائے گی۔ اس کی سرحدوں میں پاکستان بھی شامل ہوگا۔ میں تم کو ابھی سے اسلامی امارات پاکستان کا وزیر دفاع نامزد کرتا ہوں''۔

خالد نے نہایت سعادت مندی سے کہا:

''میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں جنابِ امیر!''

قاری صاحب نے مزید کہا:

''بیٹا! اب بلا اجازت کوئی کارروائی نہ کرنا۔ حالات خراب ہیں۔

حکومت پاکستان اور پاکستانی فوج نے آنکھیں پھیرنا شروع کر دی ہیں۔

حکومت پاکستان نے کئی مجاہدین کو پکڑ کر امریکیوں کے حوالے کر دیا ہے۔ حکومت پاکستان نفاذِ اسلام کے وعدے سے یکسر پھر گئی ہے... بیٹا! مجھے معلوم ہے کہ مجاہدین تمہیں شمشیرِ بے نیام کہتے ہیں لیکن اب سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کا وقت ہے''۔

یہ نصیحت کرنے کے بعد انہوں نے مزید کہا:

''بیٹا! تم اس گھر میں رہو گے جو ایک کمانڈر کے شایانِ شان ہے۔ تمہارا دورِ حدیث جہادی سرگرمیوں کی وجہ سے نامکمل رہ گیا تھا۔ اب تم تعلیم میں دھیان دینا''۔

جیسے آپ کا حکم جناب!۔۔۔ لیکن اگر میں کچھ روز اپنے ہاتھ کافروں کے خون سے نہ رنگوں تو مجھے بے چینی ہونے لگتی ہے۔

میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنا سر دیواروں سے ٹکراؤں''۔

قاری صاحب نے اس کا حالِ دل سن کر جواباً کہا:

''بیٹا! کچھ عرصے آرام کرو پھر تم کو وزیرستان جانا ہوگا۔ وہاں تم چھوٹے حقانی صاحب کے مدرسے میں رہنا اور سرحد پار کر کے جی بھر کے امریکی کتوں کو مارنا''۔

خالد قاری صاحب کی یہ باتیں سُن کر مطمئن ہو گیا۔ وہ اس کو نئے مکان کے دروازے پر رخصت کر کے اپنے حجرے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابھی وہ راستے میں ہی تھے کہ ان کے موبائل سے تلاوت کی مخصوص آواز آئی۔ دُوسری طرف اُن کے ایک بڑے معتقد افسر کا فون تھا۔

ان کی آواز سنتے ہی قاری صاحب نے کہا:

''بریگیڈیئر صاحب! آپ تو ہم کو بھول ہی گئے ہیں''۔

دوسری طرف سے جواب آیا:

''آپ تو میرے مرشد ہیں میں بھلا آپ کو کیسے بھُلا سکتا ہوں دوسری بات یہ کہ آج سے آپ مجھے جنرل کہہ سکتے ہیں۔ آپ کی دعا سے میں میجر جنرل بن گیا ہوں''۔

قاری صاحب نے گرم جوشی سے کہا:

''بہت بہت مبارک ہو آپ کو! خیر! آپ پر مٹھائی اُدھار رہی''۔

جنرل صاحب نے جواب میں کہا:

''میں اُدھار کا قائل نہیں، کچھ ہی دیر میں آپ کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہونے والا ہوں''۔

قاری صاحب نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا:

''خوش آمدید! خوش آمدید! میں آپ کا مُنتظر ہوں''۔ یہ کہہ کر قاری صاحب نے حسب معمول دعائیں دیتے ہوئے فون بند کر دیا۔

وہ حجرے میں آئے تو مُلا سواتی اور شیخ الحدیث چائے پینے میں مصروف تھے قاری صاحب نے ان حضرات سے کہا:

''آپ حضرات معاف فرمایئے گا۔ ایک ضروری مہمان آنے والے ہیں''۔

یہ دونوں قاری صاحب کا مطلب سمجھ گئے۔ مُلا سواتی نے شیخ الحدیث کو اٹھنے میں مدد دی۔ یہ دونوں حضرات رسمی سلام و دعا کرتے ہوئے حجرے سے نکل گئے۔ قاری صاحب نے خادم سے فوری طور پر حجرے کی صفائی کرنے اور نیا دسترخوان بچھانے کو کہا اور خود کپڑے تبدیل کرنے اندر چلے گئے۔

قاری صاحب کو اِس اہم ملاقاتی کا زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ اُن کے ذاتی محافظ نے خبر دی کہ

بریگیڈیئر صاحب مدرسہ میں داخل ہو چکے ہیں۔

قاری صاحب ان کا استقبال کرنے خود حجرے کے دروازے پر آ گئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں اُن کو جنرل صاحب آتے ہوئے نظر آئے۔ اُن کے کے پیچھے ان کا ایک اردلی مٹھائی کا ٹوکرا ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے تھا۔ جنرل صاحب اِس وقت یونیفارم میں نہیں تھے۔ انہوں نے قاری صاحب سے گلے ملنے کے بعد اُن کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ قاری صاحب بے تکلفی سے جنرل صاحب کا ہاتھ پکڑ کر حجرے میں لے آئے۔

انہوں نے جنرل صاحب کے محافظ کو ہاتھوں میں مٹھائی کا بڑا سا ٹوکرا دیکھ کر کہا:

''ایک پلیٹ میں کچھ مٹھائی چائے کے ساتھ حجرے میں بھجوا دو!، باقی سب نماز کے بعد طلباء میں تقسیم کرا دینا!'' محافظ نے مٹھائی کا ٹوکرا انہی احکامات کے ساتھ قاری صاحب کے خادم کے حوالے کر دیا۔

جنرل صاحب حجرے میں آئے تو ان کے بیٹھتے ہی قاری صاحب نے ان کا پسندیدہ الائچی والا قہوہ اپنے ہاتھوں سے اُن کے لیئے پیالی میں انڈیلا۔

جنرل صاحب نے یہ دیکھ کر کہا:

آپ میرے مُرشد ہیں۔ برائے مہربانی مجھے خدمت کا موقع دیا کریں''۔

قاری صاحب نے فوراً کہا:

''آپ میرے مہمان ہیں۔ ایک مہمان کی خاطر داری عبادت کا درجہ رکھتی ہے''۔

جنرل صاحب نے کہا:

''آپ کی نظرِ کرم اور دعائیں میرے لئے کافی ہیں''۔

قاری صاحب نے ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھا کر کہا:

''اللہ آپ کو مزید ترقی، سربلندی اور عزت عطا فرمائے''

جنرل صاحب نے کہا:

''ایک دعا اور کیجئے کہ مجھے اللہ رب العزت شہادت کی سرفرازی عطا فرمائے''۔

جواب میں قاری صاحب نے آمین کہا اور مٹھائی کی پلیٹ اپنے مہمان کی جانب بڑھائی.

جنرل صاحب نے بالوشاہی کا ایک ٹکڑا اٹھاتے ہوئے کہا:

’’آپ نے بتایا تھا کہ آپ نے مدرسے کے پچھلے حصے میں سبزیوں کی کاشت شروع کروائی ہے تاکہ طلباء کے کھانے کا معیار بلند ہو۔۔۔کیا مجھے آپ اپنے سبزیوں کے باغیچے دکھانا پسند کریں گے؟‘‘

قاری صاحب جنرل صاحب کا اشارہ سمجھ گئے، انہوں نے کہا:

’’کیوں نہیں سو بسم اللہ۔ بلکہ آپ کچھ سبزیاں اپنے ہاتھ سے توڑ کر ہماری بہن کے لیے تحفہ کے طور پر لے جایئے گا۔ آیئے! میں آپ کو باغیچے کا دورہ کراتا ہوں‘‘۔

جنرل صاحب اس بہانے سے قاری صاحب کو حجرے سے باہر لے آئے۔ وہ دونوں باغیچے کی طرف چہل قدمی کرنے لگے۔

جنرل صاحب نے کچھ دیر سوچنے کے بعد یوں گفتگو شروع کی:

’’آپ کو میں یہ بتانا چاہتا تھا کہ اب شاید ہماری مُلاقات اتنی آسانی سے نہ ہو پائے۔ مجھے اسٹریٹجک ویپن ڈویژن کی ذمے داری سونپ دی گئی ہے۔ ابھی میں نے چارج نہیں لیا ہے۔ اس لئے میں آپ سے ملنے کو آسکا ہوں۔ پاکستان کے ایٹمی ہتھیار اب میری کمان میں ہوں گے، میں ایک لیفٹننٹ جنرل کو رپورٹ کروں گا۔ چارج لینے کے بعد مجھ سے اگر کوئی چڑیا بھی ٹکرائے گی تو کاؤنٹر انٹیلی جنس والوں کو پتہ چل جائے گا۔‘‘

قاری صاحب نے کہا:

’’ماشاء اللہ! بہت اہم ذمہ داری ہے۔ آپ جیسا قابل افسر ہی اس ذمہ داری کے قابل ہوسکتا ہے۔

جنرل صاحب نے قاری صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

’’بہت شکریہ آپ کی عزت افزائی کا۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ فی الحال کسی عرب مجاہد کو اپنے مدرسہ میں نہ رکھیں۔

میں نہیں چاہوں گا کہ آپ کا مدرسہ سی آئی اے کی نظروں میں آئے یا یہاں سے کوئی مجاہد گرفتار ہو کر گوانتانامے پہنچے‘‘۔

قاری صاحب نے جواب میں کہا:

’’بہت شکریہ میں کافی محتاط ہوں۔ میں نے آپ کی تجویز پر کشمیر سے بھی باقی مجاہدین کو واپس بلوالیا

ہے''۔

جنرل صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:

''مرشد ایک شرعی مسئلہ پوچھنا چاہتا ہوں''۔

''فرض کریں! اگر ہندوستان سے جنگ چھڑ جائے اور اعلیٰ کمان سے دلی پر ایٹمی میزائیل داغنے کا آرڈر آجائے تو کیا اِس حکم پر عمل اسلامی تعلیمات کے مطابق ہوگا''۔

قاری صاحب نے جواب میں کہا:

''بے شک عین اسلامی ہوگا۔ امیر کی بات پر عمل کرنا اسلام کا بنیادی جز ہے۔ آپ کا اعلیٰ افسر آپ کا امیر بھی ہے''۔

جنرل صاحب نے کہا:

''بے شک آپ نے درست کہا۔ مگر میرے روحانی امیر آپ ہی ہیں۔

لیکن میرے دل میں ایک سوال ہے.

قاری صاحب نے کہا:

''وہ کیا؟''

جنرل صاحب نے کہا:

''دہلی میں مسلمان بھی بہت رہتے ہیں اور وہ شہر اولیاء اللہ کے مزارات سے بھرا ہوا ہے۔ کیا ایسے شہر پر میزائل داغنا جائز ہوگا؟''۔

قاری صاحب کہا:

''ہاں بیٹا! بالکل جائز ہوگا۔ اِس جنگ میں کام آنے والے مسلمان شہادت کا رتبہ پائیں گے۔ رہی بات اولیا اللہ کے مزاروں کی تو یہ سارے مزارات شرک کا گڑھ اور غیر اسلامی ہیں۔ اِن کا تباہ ہو جانا ہی بہتر ہوگا۔ ویسے بھی غزوَہ ہند کی ابتداء دہلی کی تباہی سے ہی ہوگی''۔ جنرل صاحب نے کہا:

''آپ نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا''۔

اِس دوران قاری صاحب نے اپنے ہاتھوں سے جنرل صاحب کے لئے تازہ سبزیاں توڑ کر اپنے

رومال میں باندھنا شروع کر دیں۔ سبزیوں سے بھرا رومال جنرل صاحب کو تھما کر قاری صاحب نے کہا:

''اگر کوئی ضروری پیغام دینا ہوا تو آپ کو مل جائے گا''

جنرل صاحب نے حیران ہو کر پوچھا:

''وہ کس طرح؟''۔

قاری صاحب نے کہا:

''آپ کے میس میں ایک بیرا مجاہدین میں سے ہے۔ اگر کوئی ضروری پیغام ہوا تو وہ سبز رنگ کی روشنائی سے لکھا ہو گا۔ آپ سمجھ جائیے گا کہ میرا پیغام ہے''۔

جنرل صاحب نے کہا:

''مرشد کا پیغام سر آنکھوں پر'' اب مجھے اجازت دیں، میرا زیادہ دیر یہاں رکنا مناسب نہیں۔ قاری صاحب جنرل صاحب کو مدرسے کے صدر دروازے تک چھوڑنے آئے، جہاں اُن کے محافظ اور اردلی اُن کے منتظر تھے۔ قاری صاحب نے جنرل صاحب کا ماتھا چوما اور دعائیں دیتے ہوئے انہیں رخصت کیا۔ جب تک جنرل صاحب کی گاڑی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی وہ اس وقت تک مدرسہ کے مرکزی دروازے پر کھڑے رہے۔

(۲۲)

ہندوستان کے شہر بنارس کی صبح گنگا کے خوبصورت نظاروں کی وجہ سے مشہور ہے لیکن ارون کے گھر آج کل صبح کا منظر کچھ عجیب ہوتا تھا۔ اس کی ماں روز صبح اسے روزگار نہ ڈھونڈنے پر طعنے دینا شروع کر دیتی تھیں ۔ان کو سیاست سے کوئی سروکار نہ تھا۔ انہیں صرف اِس بات کی فکر تھی کہ ارون کی نوکری لگتے ہی اس کے سہرے کے پھول کھل جائیں۔ حسب معمول آج بھی ارون ماں کی کڑوی کسیلی باتیں سن کر اپنے کمرے میں آکر بیٹھ گیا تھا۔ اِس کی ماں اُس پر کتنا ہی غصہ کیوں نہ کرے مگر اُس کی محبت ہمیشہ غصّے پر غالب آجاتی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ اپنے لختِ جگر کے لئے دودھ کا گلاس لئے کمرے میں آئی۔

اس نے بیٹے کو گلاس تھماتے ہوئے کہا:

''ایک بات کہوں؟''

ارون نے جھنجھلاتے ہوئے طنزاً کہا:

''جہاں اتنی باتیں کہہ ڈالی ہیں...ایک اور سہی''۔

ماں نے احسان جتانے والے انداز میں کہا:

''تیرے بھلے کی ہی بات ہے''۔

ارون نے دودھ کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا:

اچھا کہیے''۔

''ماں نے ایک ہی سانس میں کہا:

''دیکھ! تجھے ماسٹرز کئے ہوئے ایک سال ہو گیا ہے۔ تو اتنے برسوں میں مکّر جی کے کافی قریب ہو گیا ہے۔۔اس کے لئے تجھے کوئی اچھی سرکاری نوکری دلانا کوئی مشکل نہیں۔ تو اُن سے اِس بارے میں بات

کرا''۔

ارون نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

''ماں جی آپ نے صحیح بات کہی ہے۔ میرا تو اس طرف کبھی دھیان ہی نہیں گیا۔۔۔۔ میں نیتا جی سے اس بارے میں ضرور بات کروں گا''۔ یہ بات اس نے جلدی جلدی دودھ کے گھونٹ بھرتے ہوئے کہی۔ اسے پارٹی کے دفتر پہنچنے کی جلدی تھی۔ آج کی ہونے والے پارٹی میٹنگ کی تیاری اس کی ذمہ داری تھی۔ اُس نے دودھ پینے کے بعد ماں کے قدم چھوئے اور موٹر سائیکل گھر سے نکالتے ہوئے پارٹی دفتر کی جانب روانہ ہو گیا۔

ارون نے پارٹی دفتر آ کر میٹنگ کی تیاریاں بروقت کر لی تھیں۔ سارے ہندوستان سے پارٹی کے نیتاؤں کو آنا تھا۔ اُن کے رہنے، کھانے اور آنے جانے کا بندوبست بھی ارون کی ذمہ داری تھی۔ میٹنگ کے کمرے میں ارون نے پہلے ہی سے تمام نیتاؤں کے نام اُن کے بیٹھنے کی جگہوں پر لکھ کر لگا دئے تھے۔ میٹنگ کی کاروائی کا آغاز ہوتے ہی ارون نے اپنا لیپ ٹاپ سنبھال کر میٹنگ کی کاروائی کو قلمبند کرنا شروع کر دیا۔ کھانے کے وقفے کے بعد میٹنگ دیر تک چلتی رہی۔

میٹنگ کے آخر میں مکرُ جی نے ارون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''میٹنگ کے اس حصّے کو لکھنے کی ضرورت نہیں یہ آف دی ریکارڈ رہنا چاہیئے''۔

ارون نے جواب میں کہا:

''جی میں سمجھ گیا''۔

یہ کہہ کر ارون نے لیپ ٹاپ کو ایک طرف رکھ دیا۔ مکرُ جی نے اپنے مخصوص طریقے سے کرتے کی آستینوں کو الٹائے ہوئے یوں گویا ہوئے:

''میرے پیارے مترو! ہندوستان کی راج نیتی ہزاروں برسوں سے جنگوں اور فسادوں کے ارد گرد گھوم رہی ہے۔ چاہے وہ مہا یودھ ہو یا تقسیم کے دنگے، گجرات کے فسادات ہوں یا سکھوں کا قتل عام۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں راج نیتی انسانی خون کی بھینٹ مانگتی ہے۔ جو اس راج نیتی کی دیوی کو خون کی بھینٹ چڑھائے گا وہ اُسی کے چرنوں میں بیٹھے گی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوستان میں آج جو مسلمان نظر آتے ہیں

وہ اصل میں ہندو ہی تھے جن کو عربوں، ترکوں اور افغانوں کی بے رحم تلواروں کے خوف نے مسلمان بنادیا تھا۔اب اِن مسلمانوں کو ان کے پرانے دھرم کی طرف لوٹانا ہی ہوگا۔جیسے مغلوں کی تلواروں نے ان کو ہندو سے مسلمان بنایا تھا، اسُی طرح سے اب ہماری تلواریں ان کو مسلمان سے ہندو بنائیں گی۔میرے پیارے سجنو! آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم تاج محل کو ڈھا کر گھر بیٹھ جائیں گے۔ہم اِس دیش سے قابض مغلوں کی ایک ایک نشانی کو مٹا کر اس کو پوتر کردیں گے۔پیارے مترو! چناؤ میں ایک لہر اور ہوا کی ضرورت ہوتی اور وہ ہوا خون کی ہولی کھیلے بِنا نہیں چلے گی۔اس دفعہ چناؤ سے پہلے بنارس سے گجرات تک فسادات کا ہونا ضروری ہے۔۔۔پھر آپ دیکھیں گے کہ اس دفعہ ہمیں دلی میں حکومت بنانے سے کون روکے گا۔''

مکرُ جی کی اس جذباتی تقریر کے دوران تمام لوگ سر ہلِا ہلا کر ان کو تعاون کا یقین دلاتے رہے۔تقریر ختم کرنے کے بعد مکرُ جی نے کہا:

''کل کی خاص میٹنگ میں آپ سب سے اہم باتیں ہوں گی''۔

اب آپ لوگ آرام کریں۔۔۔۔اروں نے کتنا اچھا انتظام کیا ہے، آپ سب کا ہوٹل بالکل قریب ہے، آپ کو کھانے پینے کی کوئی دقت نہ ہوگی، آپ سے کل صبح پھر مُلاقات ہوگی۔تمام شرکائے میٹنگ مکرُ جی سے ایک ایک کر کے مصافحہ کرتے ہوئے میٹنگ کے کمرے سے نکل گئے۔سب کے جانے کے بعد مکرُ جی نے ارون سے کہا:

''تم آج رات آفس میں ہی رکُ جاؤ...ابھی کافی کام باقی ہیں، اور ہاں قریبی ریسٹورنٹ کو کھانے کا آرڈر دے دو۔میری پسند تو تمھیں معلوم ہی ہے۔تم کھانا میرے ساتھ ہی کھانا''۔

ارون نے جواب میں اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ دفتر میں رُکنے کے خیال سے بہت ہی خوش تھا کیوں کہ اس بہانے اسے اپنی نوکری کے بارے میں بات کرنے کا موقع بھی ملنے کا امکان تھا۔مکرُ جی ارون سے کھانے کا آرڈر دینے کے بارے میں کہنے کے بعد اپنے دفتر میں چلے گئے۔ارون وقت بچانے کے لئے کھانا لینے خود ہی ریسٹورنٹ چلا گیا تا کہ مکرُ جی کو کھانے کے لئے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے۔

ارون نے کھانا لانے کے بعد سلیقے سے دستر خوان پر سجا کر مکرُ جی کو بلانے کو ان کے دفتر کے دروازے

پر دستک دی۔ شاید نیتا جی کو بھی بہت بھوک لگی تھی وہ فوراً ہی دفتر سے نکل آئے، دونوں ہاتھ دھونے کے بعد کھانے کے لئے بیٹھ گئے۔

مکرجی نے مرغی کی ران کو بھنبھوڑتے ہوئے ارون سے پوچھا:

''بیٹا! تمہاری ماں نے تمہارے لئے کوئی لڑکی وڑکی دیکھی یا ہماری طرح کنوارہ رہنے کا ارادہ ہے''۔

ارون کو اب اچھا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔۔۔اس نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگاتے ہوئے کہا:

''ماں نے کہا ہے کہ پہلے نوکری ڈھونڈو پھر لڑکی ڈھونڈوں گی بنا نوکری کے کون لڑکی دے گا''۔

مکرجی یہ سن کر مسکرائے اور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولے:

''بس اتنی سی بات! سرکاری نوکری تو میں تم کو کل ہی دلا دوں پر پھر تم چناؤ نہیں لڑ سکو گے۔ میں نے تم کو بنارس سے پارٹی ٹکٹ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے بلکہ بھگوان نے چاہا تو میں تم کو ہندوستان کا سب سے کم عمر وزیر بناؤں گا۔ نوجوانوں کے امور کی وزارت تم ہی چلاؤ گے۔ بے وقوف تم نوکری کے خواب دیکھ رہے ہو۔ میں چاہتا ہوں لوگ تم سے نوکریاں مانگنے آئیں۔ تمہاری ماں کے پاس تمہارے اتنے رشتے آئیں گے کہ ان کو کسی ایک کو تمہارے لئے منتخب کرنا مشکل ہو جائے گا''۔

ارون کا چہرہ مکرجی کی باتیں سن کر خوشی سے تمتمانے لگا۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں وزارت کی گدی پر بیٹھ چکا تھا۔ بے خیالی میں تیز مرچ کو چبانے سے لگنے والی مرچوں کی وجہ سے وہ خیالی دنیا سے باہر آ گیا۔

(۲۳)

خالد کو ابھی وزیرستان اور افغانستان میں اپنی کارروائیاں کرتے ہوئے ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ قاری صاحب نے اسے واپس آنے کا حکم دے دیا۔ وہ اپنے امیر کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے فوراً واپس مدرسے آ گیا تھا۔ وزیرستان میں اس نے امریکیوں کا شکار کرنے کے ساتھ ساتھ پاکستانی فوجیوں کا شکار بھی دل کھول کر کیا تھا۔ مجاہدین کی نظر میں پاکستانی فوج نے اِن سے غداری کی تھی۔ اِن کی نظر میں پاکستانی فوجی امریکی فوجیوں سے بھی بڑے مجرم تھے۔ وزیرستان میں موجود عربی مجاہدین نے اس کے فن دہشت گردی کو اور نکھار دیا تھا۔ وہ سڑک کے کنارے رکھنے والے ایسے بم تخلیق کرنا سیکھ گیا تھا جو دور سے تو کیا قریب سے بھی علاقائی پتھروں اور چٹانوں کی شکل کے لگتے تھے۔ اِن بموں سے اس نے بہت سے پاکستانی اور امریکی فوجوں کے قافلوں کو نشانہ بنایا تھا۔ بم بنانے کی مہارت کے علاوہ خالد عربی مجاہدین کی طرح مخالفین کو ذبح کرنے میں ماہر ہو چکا تھا اس کو یاد بھی نہیں تھا کہ اس نے کتنے پاکستانی فوجیوں کے سر کاٹے تھے۔

مدرسہ میں پہنچے ہوئے اُسے کافی روز ہو چکے تھے۔ آج مدرسے کے حجرے میں خالد کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ بے چینی تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ بے چینی کو ختم کرنے کے لئے میدان کے دو چکر بھی لگا آیا تھا مگر اس کا اختلاج قلب دور ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ قاری صاحب نے اسے وزیرستان سے واپس بلا کر دوبارہ حدیث و تفسیر کا دور مکمل کرنے پر لگا دیا تھا۔ قاری صاحب کے احترام میں وہ درسِ قران میں موجود تو ہوتا تھا لیکن اس کے دل کو قرآن سننے یا پڑھنے کوئی سکون نہیں ملتا تھا۔ خالد نے اپنی بے سکونی سے نمٹنے کے لئے اپنے کرتے کو اُتار کر ایک کونے میں پھینک دیا۔ پھر اس نے بے قراری سے میز پر کچھ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر کی جدوجہد کے بعد ایک کتاب کے نیچے سے اسے اپنا پسندیدہ خنجر مل گیا۔

خالد نے خنجر کے چمکتے ہوئے پھل پر اپنی زبان پھیری۔ یہ روسی خنجر تھا، جو ایک کمانڈر نے روسی فوجی کو

قتل کرنے کے بعد مالِ غنیمت کے طور پر ہتھیایا تھا۔ خالد کو یہ خنجر اس کمانڈر نے افغانستان میں صوبہ ہزارہ جات کو فتح کرنے کے موقع پر اس کی بہادری کے انعام میں دیا تھا۔ خالد نے خنجر پر زبان دوبارہ پھیر کر اس کے پھل کو اپنے لعاب دہن سے گیلا کیا۔ اس عمل کے بعد اُس نے خنجر کی نوک سے اپنے بازو پر ایک لکیر کھینچی۔ اس لکیر پر خون کے چھوٹے چھوٹے قطروں نے آہستہ آہستہ نمودار ہو کر لہو کی ایک دھار کی شکل اختیار کر لی۔ خالد نے خنجر میز پر رکھنے کے بعد اپنے ہاتھ کو بہتے ہوئے خون سے آلودہ کر کے اپنے منہ پر ملنا شروع کر دیا۔ تازہ انسانی لہو کی مہک سے اس کی طبیعت بشاش ہونا شروع ہو گئی۔ بے قراری کم ہونے کے بعد اس کا دماغ سوچنے اور سمجھنے کے قابل ہو گیا تو اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ:

''وہ کب تک یوں اپنے لہو سے خود کو اطمینان بخشتا رہے گا جب کہ اِس شہر میں بھی نہ جانے کتنے کافر اور ملحد رہتے ہیں۔۔۔کیوں نہ اس بارے میں قاری صاحب سے بات کی جائے''۔

انہیں خیالات میں مدغم ہوتے ہوتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ فجر کی نماز قاری صاحب نے ہی پڑھائی تھی۔

بعد از نماز اس نے قاری صاحب سے کہا:

''آپ سے کچھ عرض کرنا ہے''۔

قاری صاحب نے کہا: ''اچھا میرے ساتھ حجرے میں چلو وہاں بات ہو گی ناشتہ بھی میرے ساتھ ہی کرنا۔ ایک پنجابی طالب علم نے پائے تیار کیے ہیں، نہ جانے یہ پنجابی لوگ ناشتے میں پائے کیوں کھاتے ہیں؟''۔

یہ بات قاری صاحب نے مسکراتے ہوئے کہی۔

دوسرے اساتذہ کو قاری صاحب کی خالد سے یہ قربت حسد میں مبتلا کر رہی تھی، پر وہ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکتے تھے۔ قاری صاحب کو حجرے میں آتا دیکھ کر خادم نے دسترخوان لگا دیا۔ قاری صاحب نے خالد کے شانے کو سہارا بنا کر بیٹھتے ہوئے دریافت کیا:

ہاں بیٹا کہو! کیا بات ہے؟''۔

خالد نے کہا: ''آپ کے اِس مجاہد بیٹے کو آرام کی زندگی سے آرام نہیں ملتا۔ اتنے دن ہو گئے ہیں

میرے ہاتھوں کسی کافر کا خون نہیں بہا۔ آپ برائے مہربانی مجھے واپس وزیرستان جانے کا حکم دیدیں یا اگر آپ اجازت دیں تو اِس شہر میں بھی کافروں کی کمی نہیں ۔۔

میں کبھی کبھی اِن کے خون سے شجرِ اسلام کی آبیاری کرلیا کروں؟

یہ بات خالد نے خاصے جوش میں کہی۔

قاری صاحب نے جواب میں کہا:

''نہ میرے بیٹے! دیکھو چور بھی کبھی اپنے محلے میں واردات نہیں کرتا ہے. میں نے تم کو وزیرستان سے ایک بہت عظیم تر مقصد کے لئے طلب کیا ہے۔ تم کو اِس بارے میں آگاہ کرنا ابھی مناسب نہیں''. قاری صاحب گفتگو کے دوران اپنے ہاتھ سے خالد کی پلیٹ میں سالن ڈالنے کے بعد خالد کو کھانا شروع کرنے کو کہا اور کہنے لگے:

''بیٹا! میں کچھ روز کے لئے سعودی عرب جا رہا ہوں۔ حکومت پاکستان شاید ہمارے بنکوں کے کھاتے منجمد کرنے جا رہی ہے۔ ہماری حکومت امریکا کے ہاتھوں گھٹنے ٹیک چکی ہے۔ دعا کرو کہ ہم کو مالی مشکلات کا سامنا نہ ہو۔ سارے ملک میں مدرسے چلانا اور ہزاروں طلباء کی کفالت کوئی معمولی کام نہیں''۔

خالد نے پر جوش لہجے میں کہا:

''اگر سعوی عرب میں کام نہ بنے تو آپ حکم کریں۔ کراچی اور لاہور میں بہت سے دولت مند شیعہ ،قادیانی، ہندو، آغا خانی اور بوہرے کافر رہتے ہیں۔ ایک ایک اسامی سے کم از کم دس بیس کرروڑ روپے تاوان وصول کیا جاسکتا ہے۔ ہم آپ کے قدموں میں روپوں کے پہاڑ کھڑے کردیں گے''۔

قاری صاحب نے فخر سے خالد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

''بیٹا حالات خراب ضرور ہیں لیکن اتنے بھی نہیں۔ تم ایک ہفتہ صبر کرو اور میرے آنے کا انتظار کرو۔ اللہ نے تم کو ایک اہم کام کے لئے منتخب کیا ہے''۔

یہ سُن کر خالد خاموشی سے کھانے میں مشغول ہوگیا۔

(۲۴)

قاری صاحب نے سعودی عرب سے واپس آتے ہی کوہستانی کمانڈرز کا اجلاس طلب کر لیا تھا۔ اجلاس میں حسبِ معمول قرآن کی تلاوت سے شروع ہوا۔ قاری صاحب نے تلاوت کی گئی آیات کی مختصر تفسیر بیان کرنے کے بعد اپنا خطاب یوں شروع کیا:

''میرے عزیز مجاہدو! اللہ رب العزت نے پاکستان کو عالم اسلام میں سب سے مضبوط فوج سے نوازا ہے۔ یہ مملکت جس پر بالآخر اسلام ہی نافذ ہونا ہے، اپنی اسٹریٹیجک جغرافیائی حدود کی وجہ سے یکتا ہے۔ بدقسمتی سے اس ارضِ مقدس کے ساتھ کچھ لعنتیں بھی وابستہ ہیں۔ سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ ہمارا شمالی سرحدی علاقہ جو چینی ترکستان سے ملتا ہے وہ کافر شیعوں اور اسماعیلیوں کے قبضے میں ہے۔ یہ لوگ جہاد کو چین تک پھیلانے میں سخت رُکاوٹ ہیں۔ ان علاقوں کی سرحدیں صرف چین سے ہی نہیں بلکہ انڈیا اور افغانستان تک ملتی ہیں۔ جب تک ہم اِن علاقوں کو شیعوں اور اسماعیلیوں کے ناپاک وجود سے خالی نہ کرا لیں ہمارے جہاد کے عظیم تر مقاصد کامیاب نہیں ہوں گے۔ غضب تو یہ ہے کہ اس علاقے میں ایک قبیلہ ایسا بھی ہے جو اپنے کافر ہونے پر فخر کرتا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اِس سرزمین کو مشرکین سے خالی کروالیں، کوہستانی بھائیو! آپ کے عزائم چٹانوں کی طرح اٹل ہیں، آپ کی طبیعت پہاڑوں کی طرح سفاک ہے۔ کیا آپ تیار ہیں کہ اِن علاقوں سے کُفار کے ناپاک وجود کو مٹا ڈالیں؟''۔

یہ سنتے ہی کوہستانی کمانڈرز نے ایک آواز ہو کر زوردار تکبیر کے نعروں سے اپنی آمادگی کا اظہار کیا۔

ایک وقفے کے بعد قاری صاحب نے سلسلۂ کلام کو دوبارہ اس طرح شروع کیا:

''عزیز مجاہدو! آپ لشکر کو منظم کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اسلحے اور دیگر وسائل کا بندوبست اللہ نے غیب سے کر دیا ہے''۔

یہ بات سنتے ہی حجرہ ایک بار پھر تکبیر کے نعروں سے گونج اٹھا۔

(۲۵)

آج دہلی میں نجومیوں کی بین الاقوامی کانفرنس کا آخری دن تھا۔ اس کانفرنس میں دُنیا بھر کے جوتشی، ستارہ شناس اپنے مقالات پڑھنے اور اپنی تحقیقات کا ہندوستانی جوتشیوں سے تبادلہ کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ ہندوستان کی سیاست میں جوتشیوں کی ہدایات بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ اکثر سیاست دانوں نے تو جوتشیوں کو ملازم رکھا ہوا ہے تا کہ وہ قدم قدم پر اُن کی رہنمائی حاصل کر سکیں۔ ہندوستان میں جوتشیوں کے اثر و رسوخ کا کیا یہ عالم ہے کہ محکمہ آثار قدیمہ ایک جوتشی کی پیش گوئی کو صحیح مان کر، ایک پرانے مندر کے نیچے دبے سونے کے ذخائر کو مہینوں ڈھونڈ تا رہا تھا مگر خزانہ ہاتھ نہ آسکا تھا۔ ہندوستان بھر کے صحافی اور ٹیلی ویژن کے نمائندے اس کانفرنس کی براہ راست نشریات کے لئے وہاں موجود تھے۔ ایک تجسس سے بھر پور انتظار کے بعد کانفرنس میں شریک نجومیوں کے نمائندے نے پریس کانفرنس ہال میں آکر ہندوستان و پاکستان کے مستقبل کے بارے میں کچھ اس طرح بیان جاری کیا:

''کانفرنس میں موجود دنیا بھر کے نجومی جس میں پاکستان اور بنگلا دیش کے نجومی بھی شامل ہیں، انہوں نے مشترکہ حساب سے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ۔۔۔ اگلے پانچ برس گزرنے سے پہلے ہی ان تینوں ممالک کے درمیان سرحدیں مٹ جائیں گی''۔

کانفرنس کے اس مشترکہ اعلامیہ نے صحافیوں کے درمیان ایک سنسنی پھیلا دی تھی۔ کئی صحافیوں نے سوالات کرنے کے لئے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔

اکثر صحافیوں کا ایک ہی سوال تھا:

''کیا ہندوستان، پاکستان اور بنگلا دیش پھر سے ایک مُلک بن جائیں گے؟''

کانفرنس کے ترجمان کا جواب تھا کہ:

''نجوم کے ماہرین ہر سوال کا جواب حساب نکال کر دیتے ہیں جس میں کافی وقت درکار ہوتا ہے۔ لہذا
وہ اس لمحے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔
کانفرنس کی اس مشترکہ مستقبل بینی کی وجہ سے سیاستدان طرح طرح کے بیانات دینے لگے تھے۔ ہر
کوئی اپنے نظریات کی بنیاد پر نجومیوں کی پیش گوئی کی تشریح کر رہا تھا۔ ہندو قوم پرست تحریکوں کے رہنما کا
خیال تھا کہ اکھنڈ بھارت کا خواب بہت جلد حقیقت بننے والا ہے۔ گو کہ پاکستان میں نجومیوں کی پیش گوئیاں
اتنا اثر نہیں کرتیں جتنا کہ ہندوستان میں لیکن اسلامی انتہا پسند اس پیش گوئی کی تشریح اس طرح کر رہے تھے کہ
غزوہ ہند میں پاکستان کی کامیابی ہوگی اور اس کامیابی کے نتیجہ میں اسلام کا جھنڈا ہندوستان پر لہرائے گا۔
جہادی طاقتوں کی امیدیں اپنی جگہ، لیکن پاکستان میں فوجیوں اور انتہا پسندوں کے درمیان بڑھتی ہوئی
خلیج اب دُشمنی کا رنگ اختیار کرتی
جارہی تھی۔ پاکستان میں جنگوں کے دوران شاید ہی کرنل سے اُونچے عہدے کا کوئی فوجی افسر مارا گیا
ہو لیکن انتہا پسندوں سے جاری جنگ میں افسران کی ایک بڑی تعداد ماری جا چکی تھی جن میں جنرل تک کے
اعلیٰ عہدے کے حامل افسران بھی شامل تھے۔ قاری صاحب نے بدلتے ہوئے حالات کو بھانپ کر مجاہدین
کو بلوچستان میں شیعوں کے قتلِ عام سے روک دیا تھا۔ اُن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ بلوچستان میں مذہبی
تشدد بلوچ علیحدگی پسند تحریک کا رُخ موڑنے کیلئے شروع کرایا گیا تھا۔ وہ کشمیر اور بلوچستان میں جہاد کی
اہمیت کو ایک بار پھر سے اجاگر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُن کے قریبی رُفقاء کا خیال تھا کہ جب تک
ہندوستان اور پاکستان کی فوجیں ایک دوسرے سے نہیں ٹکرائیں گی۔ اس وقت تک غزوہ ہند کی فتح کی حدیث
کی تعبیر نہیں ملے گی۔ انہوں نے پاکستانی فوج سے مذاکرات میں ناکامی کی صورت میں اپنے آخری منصوبے
کو عملی جامہ پہنانے کا مصمم عزم کر رکھا تھا۔

(۲۶)

حجرے کے دروازے پر زوردار دستک سے خالد کی آنکھ کھل گئی۔ اتنی رات گئے دستک اس کے لئے خلافِ معمول بات تھی۔ اس نے اپنے روسی خنجر کو مضبوطی سے سیدھے ہاتھ میں تھام کر دروازے کے قریب آکر پوچھا:

''کون ہے؟''۔

باہر سے جواب آیا:

''میں ہوں بیٹا!''

خالد نے قاری صاحب کی آواز پہچان کر خنجر واپس کتابوں کے نیچے رکھ کر فوراً دروازہ کھول دیا۔

قاری صاحب نے حجرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا:

''بیٹا! تمہارے انتظار کرنے کے دن ختم ہوگئے ہیں اب چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ''۔

خالد نے حیرانی سے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''آدھی رات کو؟''

قاری صاحب نے جواباً کہا:

''ہاں بیٹا!۔ نیند تم گاڑی میں ہی پوری کر لینا۔ ہم کو صبح تک لاہور میں ہونا چاہئے۔ تم کو کوئی سامان لینے کی ضرورت نہیں، تمہارے مشن کی تفصیلات لاہور پہنچنے کے بعد بتاؤں گا''۔

یہ سنتے ہی خالد نے کہا:

''لبیک یا امیر! جیسے آپ کا حکم''۔

یہ کہنے کے بعد وہ قاری صاحب کے پیچھے چل دیا۔ مدرسے کے مرکزی دروازے کے قریب قاری

صاحب کی لینڈ کروزر تیار کھڑی تھی۔ محافظ گاڑی میں پہلے ہی سوار ہو چکے تھے۔ قاری صاحب کو آتے ہوئے دیکھ کر ڈرائیور نے پھرتی سے ان کے لئے دروازہ کھول دیا۔ قاری صاحب معمول کے مطابق اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی گاڑی لاہور کے لئے روانہ ہوگئی۔

انہوں نے خالد سے کہا:

''بیٹا! تم سو جاؤ، میں نے تم کو گہری نیند سے جگایا تھا۔ میں تو سفر میں بیٹھے بیٹھے ہی سو جاتا ہوں۔ خالد قاری صاحب کے کہنے پر لیٹ گیا مگر اس کی آنکھوں سے نیند اڑ چکی تھی۔ اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ اس کے ذمہ کوئی اہم کام سپرد کیے جانے والا ہے۔

مختلف خیالوں کے تانے بانے بنتے ہوئے اسے نیند آ گئی۔

''بیٹا! اٹھ جاؤ فجر کا وقت ہو گیا ہے''۔

قاری صاحب نے یہ کہہ کر خالد کو جگایا۔

وہ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا. ڈرائیور نے ایک ٹرکوں کے اڈے پر لینڈ کروزر کو روک دیا۔ وہاں پر سب نے وضو کر کے قاری صاحب کی امامت میں نماز فجر ادا کی۔ نماز کے بعد سب نے وہیں پر ناشتہ کیا۔ سیر ہو کر ناشتہ کرنے کے بعد سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے مزید سفر کے بعد گاڑی ایک مدرسے کے باہر آ کر رک گئی۔ ڈرائیور نے اتر کر مدرسے کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولنے والے نے ڈرائیور کو پہچان کر فوراً ہی مدرسے کا دروازہ گاڑی کے لئے کھول دیا۔ ڈرائیور نے گاڑی مدرسے کے اندر پارک کر دی۔ یہ بہت شاندار مدرسہ تھا۔ اس کی تعمیر میں نیلے ٹائیلز کو استعمال کیا گیا تھا۔ عمارت وسطی ایشیاء کے طرز تعمیر سے مماثلت رکھتی تھی۔ قاری صاحب کی آمد کی خبر اس مدرسے کے مہتم تک پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے اپنے دفتر سے نکل کر قاری صاحب کا پر جوش استقبال کیا۔ خالد ابھی تک یہاں آنے کے مقصد سے بے خبر تھا۔ مدرسے کے مہتم نے قاری صاحب سے کہا:

''آیئے! میں آپ کو مہمان خانے تک چھوڑ آؤں۔ کچھ ہی دیر میں میرے درس کا وقت ہونے والا ہے۔ میں درس کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ دوپہر تک آپ کا خاص آدمی اپنی امانت لینے کے لئے حاضر ہو جائے گا۔''

یہ کہہ کر وہ قاری صاحب اور خالد سے مصافحہ کر کے چلے گئے۔ خالد کا تجسس کے مارے دم گھٹا جا رہا تھا۔

اس نے مہمان خانے میں داخل ہوتے ہی پوچھا:

آپ نے مشن کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا''۔

قاری صاحب نے اپنے شانوں پر پڑے رومال کے دونوں کونوں کو ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے کہا:

''بیٹا! گاڑی میں بات کرنا مناسب نہ تھا۔ ڈرائیور اور محافظین سب کو اس مشن سے بے خبر رکھنا بہت اہم ہے''۔

یہ کہہ کر قاری صاحب کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔ اُن کی یہ خاموشی خالد کے لئے ناقابلِ برداشت ہوتے جا رہی تھی۔

کچھ دیر کی سوچ و بچار کے بعد قاری صاحب پھر یوں گویا ہوئے:

''بیٹا! آج دوپہر ایک آدمی تم کو لینے آئے گا۔ تم کو اِس بار کشمیر کی سرحد سے نہیں بلکہ پنجاب کی سرحد سے ہندوستان میں داخل ہونا ہوگا''۔

خالد نے جواباً کہا:

''ہندوستان نے سارے علاقے میں حفاظتی باڑھ لگا دی ہے، یہ سرحد عبور کرنا تقریباً ناممکن ہے''۔

قاری صاحب نے مزید کہا:

''بیٹا! ساری دُنیا میں ایک مخلوق بستی ہے جس کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے اور نہ کوئی قومیت، اُن کا مذہب صرف اور صرف پیسہ ہوتا ہے۔ اس مخلوق کو سمگلر کہتے ہیں۔۔۔ ایک قابلِ اعتبار سمگلر تم کو بحفاظت دلی تک پہنچائے گا۔ اب تم کو اپنے مشن کی تکمیل تک وہاں ہی رہنا ہوگا''۔ خالد کی آنکھوں میں یہ بات سن کر ایک چمک سی آگئی۔

اس نے خوشی کے جذبات سے بوجھل لہجے میں دریافت کیا:

''مجھے وہاں کیا کرنا ہوگا؟''۔

قاری صاحب نے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

''بیٹا! تفصیلات میں جانا ابھی مناسب نہیں ۔ بس یہ سمجھ لو کہ تمہارا نام غزوۂ ہند کے اولین مجاہدین کی فہرست میں درج ہوگا۔ اور جنت کی خوبصورت ترین حوریں تمہارے حصے میں آئیں گی''۔

یہ بات قاری صاحب نے اپنی مخصوص مُسکراہٹ کے ساتھ کہی۔ مہمان خانے میں بچھے ہوئے قالین پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے خالد کو بھی اپنے برابر میں بیٹھنے کو کہا۔

اس کے بیٹھ جانے کے بعد وہ دوبارہ یوں گویا ہوئے:

''مشن کی تفصیلات تم کو دلی میں ہی ملیں گی۔ اِس ضمن میں تم کو تمام وسائل وہیں پر مہیا کئے جائیں گے ۔ مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔ تم یہ تاریخی معرکہ سر کر کے انشاءاللہ دوبارہ مجھ سے آملو گے''۔

خالد نے جواب میں کہا:

''آپ کی جیسے مرضی امیر!۔ میری خواہش تو شروع سے شہادت کی ہی رہی ہے۔ آپ دعا کریں کہ اللہ مجھے اپنے پاس بلالے''۔

یہ بات سُن کر قاری صاحب نے ہاتھ اٹھا کر مشن کی کامیابی کے لئے دعا کرائی۔ دعا کے درمیان خالد صرف دل سے آمین کہتا رہا۔ دعا کے بعد قاری صاحب خالد کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائے اور پھر کہا:

''بیٹا! ایک اہم بات میں تم سے کئی روز سے کہنا چاہ رہا تھا لیکن بھول جاتا تھا''۔

خالد نے تجسس سے بھرپور لہجے میں کہا:

''کون سی بات جناب؟''۔

قاری صاحب نے شفقت بھرے لہجے میں کہا:

''بیٹا! تمہارے اُستاد مُلّا سواتی کی تیسری بیوی جن کا تعلق باجوڑ سے ہے۔ اُن کی بیٹی کو تیرھواں سال لگ گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں ان کی بیٹی کا ہاتھ تمہارے لئے مانگ لوں۔ وہ مجھے ناں نہیں کر سکتے۔ مجھے احساس ہے کہ تم کو جہادی سرگرمیوں نے کبھی گھر بسانے کی فرصت نہیں دی۔ مُلّا سواتی کی بیٹی کو تم اپنے موجودہ مشن کا انعام سمجھنا''۔

قاری صاحب کی یہ بات سن کر خالد کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ اس کی نظروں میں مُلّا سواتی کا منحوس چہرہ گھومنے لگا۔ مُلّا سواتیؒ کو مدرسے کے نوجوان طالب علم اب مُلّا صلیبی کہتے تھے۔ خالد کے ذہن

میں وہ منظر ایک فِلم کی طرح چلنے لگا جب اس نے شیشے کا پیالہ مُلّا سواتی کے سر پر دے مارا تھا اور اس نے مدرسے میں ڈھونگ رچایا تھا کہ روزے رکھنے سے ہو جانے والی کمزوری کی وجہ سے وہ گر گیا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اے اللہ! وہ دنِ نہ لانا کہ مُلّا صلیبی میرا افسر بن جائے۔ اِس سوچ نے اس کے چہرے پر غصے کی جگہ مُسکراہٹ نے لے لی''۔

قاری صاحب نے اُس کی مسکراہٹ کو رضامندی سمجھتے ہوئے کہا:

''اللہ ہمارے مشن کو کامیاب کرے۔

بیٹا! اب تم آرام کرو۔۔۔ مجھے کچھ اور لوگوں سے ملنا ہے'۔

یہ کہہ کر قاری صاحب اسے مہمان خانے میں چھوڑ کر باہر نکل گئے۔

(۲۷)

لاہور کے نواحی مدرسے سے قاری صاحب نے خالد کو ایک اجنبی کے ساتھ بہت سی دعاؤں کے ساتھ رخصت کر دیا۔ لگ بھگ دو گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد وہ لوگ قصور کے ایک نواحی گاؤں میں کھانا کھانے کے لئے رُکے۔ وہاں پر اس اجنبی نے خالد کو مقامی وضع قطع کا لباس پہننے کو دیا اور اس کے بال بھی مقامی طرز کے کٹوا دیے۔ اس کو آئینے میں اپنی شکل اجنبی لگ رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بال، پتلی مونچھیں، کلین شیو۔ اس کو اپنا یہ حُلیہ بہت بُرا لگ رہا تھا۔ جب سے اُس کی داڑھی نکلی تھی اس نے کبھی بھی اسے نہیں منڈوایا تھا۔ قاری صاحب کی ہدایات کے مُطابق اسے اجنبی آدمی کی ہر ہدایت پر عمل کرنا تھا۔ گاؤں میں حجامت کرانے، نہانے اور کپڑے بدلنے کے بعد ان لوگوں نے کھانا کھایا اور اگلے سفر کے لئے تیار ہو گئے۔ کوئی ایک گھنٹہ پکی سڑک پر سفر کرنے کے بعد کچا پکا رستہ شروع ہو گیا۔ کچے پکے رستے پر ایک گھنٹہ سفر کرنے کے بعد گاڑی کو سرحدی رینجرز نے معمول کی تلاشی کے لئے روکا لیکن ڈرائیور کو پہچان کر بغیر کسی پوچھ گچھ کے آگے جانے کی اجازت دے دی۔ گاڑی سرحدی گاؤں میں سُرخ اینٹوں سے بنے ایک گھر کے احاطے میں آ کر رک گئی۔

اجنبی آدمی نے خالد سے کہا:

''آج رات تم آرام کرو۔ گھر میں نوکرانی تمہیں روٹی پانی دے دے گی۔ کل رات تم کو بارڈر پار کرنا ہوگا۔ اور ہاں گھر سے باہر قدم نہ رکھنا''۔

انتظار کی گھڑیاں خالد سے کاٹے نہیں کٹ رہی تھیں۔ سارا وقت اسی سوچ میں گزر رہا تھا کہ ہندوستان میں کیا مشن انجام دینا ہوگا۔ قاری صاحب کی اتنی احتیاط اور رازداری کا مطلب تھا کہ مشن بہت ہی اہم ہے۔ خدا خدا کر کے اگلی شام آئی۔ گاؤں میں عشاء کی نماز تک گھپ اندھیرا چھا چُکا تھا۔ اجنبی گھر آیا اور اس سے فوراً چلنے کے لئے کہا۔ وہ اجنبی کے پیچھے کھیتوں کی درمیانی پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ کچھ دیر چلنے کے بعد درختوں کا

ایک جھنڈ آیا جس کے بیچ ایک کچا مکان بنا ہوا تھا۔ وہ اندھیرے میں اجنبی کے پیچھے اس کچی کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔ اجنبی نے اندر آ کر اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ روشن کر کے، کچے فرش کے ایک حصے کو ایک دروازے کی طرح کھول دیا۔ دیکھنے میں کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ فرش کھل بھی سکتا ہے۔

اجنبی نے سپاٹ لہجے میں خالد سے کہا:

''اپنی دھوتی گھٹنوں تک اُٹھاؤ''۔

خالد نے دھوتی کو گھٹنوں تک اٹھا دیا۔ اجنبی نے اس کے گھٹنوں پر موٹی تہہ دار پٹیاں باندھ دیں۔ اسی طرح اس نے کہنیوں پر بھی موٹی پٹیاں کس دیں۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے خالد کی کمر پر ایک تھیلا باندھتے ہوئے کہا:

''اس میں ایک بوتل میں پانی ہے اور کچھ روٹی۔ تم کو سرنگ میں کم از کم چار گھنٹے پیٹ کے بل رینگ کر چلنا ہوگا۔ تمہاری کمر سے ایک ریڑھی بھی بندھی ہوگی جس کو کھینچنا تمہارے لئے مُشکل نہ ہوگا۔ چلو اب میرے پیچھے پیچھے نیچے اترو''۔

یہ کہہ کر اجنبی نیچے گڑھے میں اُترنے لگا۔ گڑھا نیچے کافی کشادہ تھا جو آگے جا کر ایک سرُنگ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ گڑھے میں نیچے آ کر اجنبی نے ایک بیل کی طرح اس کی کمر سے چھوٹی سی ریڑھی کو باندھ کر کہا:

''جا جواناں رب راکھا''۔

خالد کے لئے پیٹ کے بل چلنا کوئی مسئلہ نہ تھا، اجنبی نے اس کے گھٹنوں اور کہنیوں پر پٹیاں باندھ کر اس کے سفر کو اور آسان بنا دیا تھا۔ سرنگ میں کہیں کہیں نمی تھی اور پانی کی موجودگی ناگواری کا احساس دلاتی تھی تو بعض حصوں میں آکسیجن کی کمی کی وجہ سے دم گھٹنے لگتا تھا۔ چالاک اسمگلرز نے مناسب فاصلوں پر باریک پائپوں کے ذریعے چھت سے آکسیجن اندر آنے کے لئے انتظام کر رکھا تھا۔

خالد کو سرُنگ میں رینگتے رینگتے کافی دیر ہو گئی تھی۔ اُس کا حلق پیاس کی شدت سے خشک ہو چکا تھا۔ اس نے رک کر کمر پر بندھے تھیلے کو کھولا۔ اس میں ایک بوتل میں پانی اور ساگ چپڑی ہوئی روٹی موجود تھی۔ ساگ چپڑی روٹی دیکھ کر اُسے ماں یاد آ گئی۔ جب وہ وڈیرے کے مویشیوں کو چرانے جنگل جاتا تھا تو اس کی

ماں اکثر ایک پوٹلی میں ساگ چپڑی روٹی باندھ دیتی تھی۔ وہ اندھیرے میں بیگ کو ٹٹول رہا تھا کہ اس کا ہاتھ بیگ میں موجود ٹارچ سے ٹکرایا۔ اس نے ٹارچ روشن کی تو خوشی کی ایک احساس اس کی روح تک اُتر گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اندھیرا انسان کو رفتہ رفتہ مایوسی کی طرف دھکیلنے لگتا ہے اور روشنی انسان میں امید کی کرن پیدا کر دیتی ہے۔ اس نے گھٹنوں کے بل لیٹے ہوئے پانی پیا اور روٹی کو جلدی جلدی حلق سے اُتارا۔ وہ جلد از جلد اس قید خانے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اسُے اچانک خیال آیا کہ کیوں نہ وہ دیکھے کہ اس کی کمر سے بندھی ریڑھی میں کیا سامان ہے۔ وہ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد تھیلے اور ریڑھی میں بندھے سامان کا جائزہ لینے میں کامیاب ہوگیا۔ پلاسٹک میں لپٹے سفید پوڈر کو وہ دیکھتے ہی پہچان گیا۔ ''اسے سمگلر نے بہت چالاکی سے ایک گدھے کی طرح استعمال کیا تھا''۔

اسے یہ بات سوچ کر ہنسی آ گئی۔

وہ سوچنے لگا کہ:

''یہ سمگلرز کتنے غریب ہیں۔ اس ساری ہیروئین کا وزن دس کلو بھی نہ ہوگا جب کہ اس کے کمانڈرز افغانستان سے ٹرک بھر بھر کے یہ قیمتی سفید پوڈر پاکستان روانہ کرتے تھے''۔

اس نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ دو گھنٹے سے زیادہ بغیر کسی وقفے کے رینگتا رہا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق ابھی اُسے دو گھنٹے مزید اپنے وجود کے ساتھ ساتھ ہیروئین سے بھری ریڑھی کو بھی گھسیٹنا تھا۔ اُسے رینگتے ہوئے ایک گھنٹہ ہی ہوا تھا۔ کہ اسے سُرنگ کے اگلے سرے پر جلتی بجھتی روشنی نظر آئی۔ اس نے روشنی دیکھ کر اپنے رینگنے کی رفتار کو تیز کر دیا۔ کچھ اور دیر رینگنے کے بعد اس نے دیکھا کہ کوئی ٹارچ سے سُرنگ میں روشنی پھیلا رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ٹارچ کی روشنی کے قریب آ گیا۔ خالد کو ٹارچ کے قریب رُکتے ہی آواز آئی:

''آجا! پتر۔ تو وقت سے پہلے ہی آ گیا ہے۔ شاباش! اوئے''۔

خالد کو احساس ہوا کہ تنگ سُرنگ ختم ہو چکی ہے۔ اس نے کھڑا ہونے کی بے اختیار کوشش کی تو وہ اپنی کمر سے ریڑھی بندھی ہونے کی وجہ سے لڑکھڑا گیا۔ ٹارچ تھامے ہوئے آدمی نے اس کو تھام کر گرنے سے بچا لیا۔ خالد کو سنبھالنے کے بعد اس آدمی نے ریڑھی سے منسلک بندوں کو خالد کی کمر سے کھول کر اسے کھڑا

ہونے میں مدد دی۔

اس آدمی نے خالد کو ٹارچ سے رستہ دکھاتے ہوئے کہا:

جوان! اس سیڑھی سے چڑھ کر اوپر نکل جا!۔ خالد پھرتی سے ٹارچ کی روشنی میں سیڑھیوں کی مدد سے اوپر نکل آیا۔ اس کمرے میں جلنے والے ایک کم وولٹ کے بلب سے اتنا اجالا پھیلا ہوا تھا کہ وہ سب کچھ دیکھ سکتا تھا۔ یہ ایک کچا سا کمرہ تھا جہاں گوبر کے اُپلے اور خشک گھاس کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ سُرنگ میں اس کا استقبال کرنے والے آدمی نے پیلا کرتا اور سفید پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ اس کی پگڑی اور ہاتھ میں پہنے ہوئے کڑے سے لگتا تھا کہ وہ سکھ دھرم کا ماننے والا ہے۔ عام سکھ روایت کے برخلاف اس کی داڑھی تراشیدہ تھی ۔اس نے اُجالے میں آ کر خالد کو غور سے دیکھا اور اسے بہت گرم جوشی سے گلے لگا کر کہا:

''اوئے ویرا! گھبرانے کی بات نہیں۔۔۔۔تُو کل دلی میں ہوگا، میرا نام بلبیر ہے۔

چل! اب میرے پیچھے پیچھے چل۔ سویرا ہونے سے پہلے پنڈ پہنچنا ہے''۔

یہ کہہ کر بلبیر اس کا ہاتھ تھامے اس کچی کوٹھڑی سے نکل گیا۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ چلتے ہوئے یہ لوگ گاؤں کے قریب پہنچ گئے۔ گاؤں کے کتے شاید بلبیر کو پہچانتے تھے۔ وہ اس کو دیکھ کر بھونکنے کے بجائے خوُ خا کی آواز نکال کر چپ ہو جاتے تھے۔ بلبیر گاؤں کی سرحد پر کھیتوں سے ملحقہ ایک گھر میں داخل ہوگیا۔ چہار دیواری میں ایک ٹریکٹر ٹرالی، اور کچھ زرعی مشینوں کی موجودگی اہل خانہ کی خوشحالی کی عکاسی کر رہی تھی۔ ٹرالی بوریوں سے لدی ہوئی تھی۔ بلبیر نے گھر میں آتے ہی اُسے غسل خانے کا راستہ دکھاتے ہوئے کہا:

'' جا! وِیرا، جلدی سے نہا لے۔۔۔۔ میری دھوتی غسل خانے میں لٹکی ہوئی ہے۔ تُو وہ نہا کر پہن لینا۔۔۔ ذرا دیکھ تیرے سارا وجود کیچڑ میں لت پت ہے''۔

خالد نے اس کے کہنے پر اپنی حالت پر غور کیا۔ واقعی سرنگ میں جا بجا نمی اور کیچڑ تھی۔ غسل خانہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کہ ایک سرحدی گاؤں میں شہر کی تمام سہولتوں سے بھرپور غسل خانہ بھی ہوسکتا ہے؟۔ وہ گرم پانی سے کافی دیر تک نہاتا رہا۔ جب وہ نہا کر باہر آیا تو پراٹھوں کی خوشبو نے اس کی بھوک کو اور بڑھا دیا۔ بلبیر نے گرم پراٹھے، انڈے اور لسی کا بھرا ہوا گلاس برآمدے میں بچھے ہوئے لکڑی کے تخت پر رکھ دیا تھا۔ خالد بلبیر کے کہے بغیر تخت پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ باہر سویرا ہونا شروع ہوگیا تھا، مندروں کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو

گئیں تھیں۔ان گھنٹیوں کی آوازوں سے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ ایک بار پھر کشمیر میں آ گیا ہو۔بلبیر بھی اُس کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا تھا۔خالد پہلے ہی پراٹھوں پر ٹوٹ پڑا تھا۔

ایک پراٹھا ختم کر کے خالد نے لسی کا گلاس ایک گھونٹ میں ختم کرنے کے بعد کہا:

''بڑا سواد آیا ہے، کچھ اور لسی مِل جائے گی؟''۔

بلبیر نے کہا:

''ویرا!۔۔۔لسی بہت ہے دِل کھول کر کھا اور پی''۔

یہ کہہ کر وہ اندر گیا اور تھوڑی دیر میں دو اور لسی سے لبالب بھرے ہوئے گلاس لے کر آ گیا۔

اس نے ان گلاسوں کو تخت پر خالد کے سامنے رکھتے ہوئے کہا:

''لے شہزادے رج کر پی۔گھر کی پالی ہوئی بھینسوں کے دودھ کی لسی ہے۔یہ بازار میں نہیں مِل سکتی''

خالد نے ایک اور لسی کا گلاس اپنے حلق میں اتارنے کے بعد کہا:

''بلبیر! مجھے تمہاری پنجابی بڑی اچھی لگتی ہے پر کچھ الفاظ میرے سر سے گزر جاتے ہیں''۔

بلبیر! نے یہ سن کر بہت زوردار قہقہہ لگا کر کہا:

''یارا! میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔تیری پنجابی بھی بڑی نرالی ہے۔لگتا ہے کہ تو سارے سُر سنگیت کے ساتھ پنجابی بولتا ہے۔۔۔کچھ الفاظ میرے سر سے بھی گزر جاتے ہیں پر تیرا لہجہ میٹھا ہے''۔

خالد نے کہا:

''میری ماں بولی سرائیکی ہے۔جو دُنیا کی سب سے میٹھی زبان ہے۔۔شاید اسی لئے میری پنجابی میں تجھے سنگیت سنائی دیتا ہے''۔بلبیر نے سر ہلا کر کہا:

''ہاں شاید یہی وجہ ہوگی''۔''میں تجھے کرتا پجامہ لا کر دیتا ہوں اسے فوراً پہن لے،اب وقت ہو گیا ہے مجھے تجھ کو قریبی شہر پہنچانا ہے۔اس وقت بارڈر فورس کے سپاہی آدھی نیند میں ہوتے ہیں''۔

یہ کہہ کر بلبیر گھر کے اندر گیا اور تھوڑی دیر میں کرتا پجامہ اور کئی جوڑی جوتے ہاتھوں میں اٹھائے واپس آیا اس نے کپڑے خالد کو دیتے ہوئے کہا:

''لے یہ پہن کر آ جا۔غسل خانے میں دھلے ہوئے کچھے اور بنیان لٹکے ہیں جو اچھا لگے پہن لینا''۔

خالد کو پجامہ پہنتے ہوئے عجیب لگ رہا تھا۔

وہ سوچنے لگا کہ ”یہ ہندوستانی پنجابی بھی عجیب لوگ ہیں! عورتوں کا لباس پہنتے ہیں“۔

یہ سوچتے ہوئے وہ جلدی سے کپڑے بدل کر باہر آ گیا۔

بلبیر نے اس کے سر پر پیلے رنگ کی پگڑی باندھ کر اس کو ایک سکھ کے روپ میں ڈھال دیا تھا۔

بلبیر نے خالد کو کہا:

چل یارا! جلدی کر، میں ٹریکٹر اسٹارٹ کرتا ہوں تو میرے برابر میں بیٹھ جا۔ رستے میں اگر بارڈر فورس نے کچھ پوچھا تو پہلے مجھے جواب دینے دینا۔ اگر ضرورت پڑے تو کہہ دینا کہ تو میرے چاچے کا بیٹا ہے اور دلی سے آیا ہے“۔ یہ کہہ کر بلبیر نے ٹریکٹر اسٹارٹ کر دیا۔ ٹریکٹر ٹرالی سمیت گاؤں کی گلیوں سے ہوتا ہوا باہر کی طرف آیا۔ گاؤں سے باہر بارڈر فورس کی چوکی پر کھڑے سپاہی نے بلبیر کو پہچان کر دور سے ہی آگے جانے کا اشارہ کر دیا۔ تقریباً تین گھنٹے کے سفر کے بعد یہ لوگ فیروز پور کی غلہ منڈی پہنچ گئے۔ وہاں پر بلبیر کے آدمی اس کا انتظار کر رہے تھے۔

اس نے ٹریکٹر ٹرالی ان کے حوالے کر کے خالد سے کہا:

”چل ویرا! تو میرے ساتھ گوردوارے چل میں ذرا وہاں ماتھا ٹیک آؤں“۔

خالد اس کے ساتھ چل پڑا۔

راستے میں اس نے فون پر کسی کو کہا:

”آپ کی امانت پہنچ گئی ہے۔ آپ گوردوارے آ جائیں“۔

بلبیر نے گوردوارے کے برابر ایک ریسٹورنٹ میں خالد کو لے جا کر ایک چائے کا آرڈر کر کے خالد سے کہا:

”بس میں گرنتھ صاحب کو ماتھا ٹیک کر ابھی آتا ہوں۔ تم اتنی دیر میں چائے پیو“۔

چائے کی خالد کو شدید طلب ہو رہی تھی۔ کئی گھنٹوں کی مشقت اور شب بیداری کی وجہ سے اس پر نیند کا غلبہ طاری ہونا شروع ہو گیا تھا۔ بیرے نے گرم گرم چائے کا گلاس خالد کے سامنے لا کر رکھا تو چائے کی خوشبو سے ہی اس کی آدھی تھکان دور ہو گئی۔ ابھی اس نے چائے ختم کی ہی تھی بلبیر واپس آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک

اور آدمی بھی تھا۔ جس کی داڑھی موچھیں نہیں تھیں۔ اس کی ناک پر جمی موٹی سی عینک سے لگتا تھا کہ وہ ایک پڑھا لکھا آدمی ہے۔

بلبیر نے خالد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''لیں جی! آپ کی امانت بحفاظت آپ کے حوالے''۔

اس آدمی نے بلبیر سے کہا:

''بہت بہت دھنے واد۔۔۔۔تم کاروبار میں ایک دم کھرے آدمی ہو۔ اسی لئے ہمارا تمہارا ساتھ اتنے برسوں سے ہے اور رہے گا۔

یہ سن کر بلبیر نے مومنیت کے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا:

'شیروں کی دوستی شیروں کے ساتھ ہی جمتی ہے''۔

اب مجھے آگیا دیں۔ مجھے واپس گاؤں جانا ہے''۔ اُس کے ساتھ آنے والے آدمی نے اٹھ کر بلبیر کو بہت گرم جوشی سے گلے لگا کر رخصت کیا۔

بلبیر کے جانے کے بعد اس آدمی نے کہا:

''میرا نام امجد ہے۔ میں قاری صاحب کا خاص آدمی ہوں۔ لیکن تم مجھ کو مہندر پکارو گے۔ اور تمہارا نام یہاں ہرجیت سنگھ ہے۔ چلو ہرجیت ٹرین کا وقت ہونے والا ہے۔ میں نے فرسٹ کلاس کا کیبن سفر کے لئے مختص کیا ہے جو صرف دو افراد کے لئے ہے۔ باقی باتیں سفر کے دوران ہوں گی۔ تم سفر کے دوران آرام سے سو سکو گے''۔

خالد نے کہا:

''جیسے آپ کہیں''۔

وہ دونوں ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئے، قریب سے گزرتی خالی ٹیکسی کو امجد نے ہاتھ دے کر روکا اور ڈرائیور کو سٹیشن چلنے کو کہا۔ ڈرائیور فوراً ہی راضی ہو گیا۔

فیروز پور کینٹ اسٹیشن پہنچ کر امجد (مہندر) نے اسٹیشن کے لاکر میں رکھا ہوا اپنا سفری بیگ نکالا۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے خالد سے کہا:

''پنجاب میل کو آنے میں ابھی کچھ وقت ہے چلو میں تم کو ٹھنڈا پلا دوں''۔ یہ کہ کر وہ قریبی اسٹال کی طرف بڑھ گئے جہاں ایک آدمی ٹھنڈا لیموں پانی بیچ رہا تھا۔ کچھ دیر میں ان کی مطلوبہ ٹرین آگئی۔ اس میں فرسٹ کلاس ائرکنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ اِن کے لئے مختص تھا۔ خالد کو ٹرین میں سوار ہوتے ہی نیند آنے لگی۔

اس کی نیند سے بوجھل آنکھیں دیکھ کر امجد نے اُسے کہا:

''تم سو جاؤ جب تمہاری نیند پوری ہو جائے گی تو باقی باتیں ہوں گی''۔ خالد فوراً ہی اپنی نشست پر لیٹ گیا۔

خالد نے آنکھ کھلتے ہی امجد سے پوچھا:

''کیا وقت ہوا ہے؟''

امجد نے کہا:

''دوپہر کے چار بج چکے ہیں برخوردار! تم پورے پانچ گھنٹے ہاتھی گھوڑے بیچ کر سوئے ہو''۔ اِس دوران خالد اُٹھ کر بیٹھ چُکا تھا۔

ہاں! کافی تھکن تھی۔ تنگ سُرنگ میں گھنٹوں رینگنے سے کمر میں بل پڑ گئے تھے''۔

امجد نے خالد کی طرف پرستائش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا:

''اگر تمہارے جہادی کارناموں پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ سُرنگ پار کرنا تو تمہارے لئے بچوں جیسا کھیل تھا۔ لیکن اصل امتحان اب شروع ہوگا جس میں صرف بہادری کی ہی نہیں بلکہ ذہانت کی بھی ضرورت ہوگی''۔

خالد نے کہا:

''مجھے ابھی تک معلوم نہیں کہ کیا کرنا ہے؟''

امجد نے کہا:

''ذرا صبر سے کام لو! سب پتہ چل جائے گا۔ تم ہی اِس مشن کے کمانڈر ہو گے۔ فی الحال تم کو ایک گھر میں اپنی خالہ کے ساتھ رہنا ہے۔ اپنے پنجابی لہجے کو ہندوستانی پنجابی لہجے میں ڈھالنا ہے اور ایک تعمیراتی سامان بیچنے والے ڈھابے پر کام کرنا ہے''۔

یہ کہنے کے بعد امجد نے اپنے بیگ سے نوٹوں کی گڈی نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا:

''تمہاری جیب بالکل خالی ہے۔ یہ تم رکھ لو۔ اس مشن میں تم کو جس چیز کی ضرورت ہوگی وہ ملتی رہے گی۔ تم خرچے کی کوئی فکر نہ کرنا۔

خالد نے مسکرانے پر اکتفا کرتے ہوئے پوچھا:

''دلی کتنی دور ہے؟''

امجد نے مُسکرا کر جواب دیا:

''دلی ہنوز دُور است، ہم ایک گھنٹے میں دلی کے سٹیشن پر ہوں گے''

خالد نے کہا:

''اللہ وہ دن لائے گا کہ جب دلی پر دوبارہ اسلام کا جھنڈا لہرے گا''۔

امجد نے بڑے یقین سے کہا:

''آمین ثم آمین!''۔

دونوں ایک عزم کے ساتھ مسکرا دیئے۔

(۲۸)

خالد کو دلّی میں اپنی فرضی خالہ کے ساتھ رہتے ہوئے سات ماہ ہو گئے تھے۔ اس کا قیام دلّی کے راج پاتھ کے علاقے سے ملحقہ ایک محلے میں تھا۔ اِن سات ماہ میں اُسے دلّی میں بولی جانے والی پنجابی پر کافی دسترس حاصل ہو گئی تھی۔ اُس کے لہجے سے سب اسے پنجاب کا ہی سمجھتے تھے۔ اس کے پاس ایک اسکوٹر تھا جس پر وہ صبح سویرے اپنے کام پر چلا جاتا تھا۔ دلّی میں یہ رواج عام تھا کہ سیاسی اثر و رسوخ رکھنے والے لوگ ریاستی حکومت سے تعمیر کے ٹھیکے لے کر چھوٹی کمپنیوں کو آگے بڑھا دیتے تھے۔ اس طرح ان کی جیبیں بغیر کسی محنت کے بھر جاتی تھیں۔ خالد جس ٹھیکیداری اور تعمیر سے متعلقہ سامان بیچنے کے دھابے پر کام کرتا تھا۔ وہ دراصل گذشتہ کچھ برسوں سے اس کے جہادی بھائیوں نے قائم کیا تھا۔ اس دھابے کے ایک کمرے میں خالد نے اپنا کام خاموشی سے شروع کر رکھا تھا۔ پچھلے دو سالوں سے دلّی کا ایک ٹھیکیدار اِن کو راج پاتھ اور انڈیا گیٹ کے علاقے میں رنگ و روغن اور چھوٹی موٹی مرمت کا کام دے رہا تھا۔ اِس بار ان کو راج پاتھ اور راشٹر پتی بھون کی سڑک پر لگے کنکریٹ کے بوسیدہ کھمبوں کو تبدیل کرنے کا کام مِلا تھا۔ ان کو اِن چھوٹے چھوٹے کھمبوں میں پڑی لوہے کی زنگ آلود زنجیر کو تبدیل کر کے نئی زنجیر ڈالنا تھی۔ یہ سارا کام یوم جمہوریہ کی پریڈ سے پہلے ختم ہو جانا چاہیئے تھا۔ خالد کو اسی لمحے کا

انتظار تھا۔ اس کے ساتھ رابطے میں رہنے والوں نے اس کی ضرورت کا سارا سامان پہلے ہی فراہم کر دیا تھا۔ اس کے پاس اتنا پلاسٹک بارود پہنچ چکا تھا کہ جس سے وہ کم از کم پچاس کھمبوں کو خوفناک بموں میں ڈھال سکتا تھا۔ اس نے اپنی ورکشاپ کے ذریعے کے کھمبوں کو مطلوبہ ڈیزائین میں اس طرح ڈھال لیا تھا کہ اُن میں آسانی سے بارود بھرا جا سکے۔ اس نے خاص طور سے بارود والے حصے کو سیسے کی ایک پرت سے ملفوف کیا تھا تا کہ ڈیٹونیٹر کی نشاندھی نہ ہو سکے۔ وہ خوش تھا کہ اِن کھمبوں سے لوہے کی زنجیر کو گذارنا تھا، لہٰذا دھات کو پہچاننے والے آلات زنجیر کی موجودگی کی وجہ سے لازمی وارننگ دیں گے مگر اس وارننگ کو نظر

انداز کرنا ہی ہوگا۔

خالد نے سگنلز کے لئے جو بیٹریاں کھمبوں میں فٹ کی تھیں وہ ایک سال کے لئے کارآمد تھیں جبکہ یوم جمہوریہ آنے میں صرف تین ماہ کا وقت تھا۔ خالد نے تیز دھار وزن دار لوہے کی ٹکڑے بارود میں ملائے تھے۔ ان تیز دھار قاتل ٹکڑوں سے شکار کی جان بچنا بہت مشکل تھا۔ عربی مجاہدوں سے پٹھانوں کی سرزمین پر سیکھا ہوا فن ہندوستان کی دھرتی پر اپنا سکہ بٹھانے والا تھا۔ راج مستریوں نے وقت سے پہلے ہی ان کھمبوں کو مقررہ جگہوں پر نصب کر دیا تھا۔ بارود والے کھمبے خالد نے آمنے سامنے نصب کئے تھے تاکہ وہ اپنی بھرپور طاقت سے پھٹیں اور لوگوں کو بھاگنے کا راستہ بجھائی نہ دے۔ اتنے سارے بموں کو ایک ریموٹ سے پھاڑنے کی جو ٹکنالوجی اس نے عربی مجاہدین سے سیکھی تھی اس سے شاید ہندوستانی فوج بھی ناواقف تھی۔

یوم جمہوریہ سے ایک مہینے پہلے دو جوان اس کے پاس پہنچ چکے تھے جن کی عمریں اٹھارہ اور بیس سال سے زیادہ نہیں تھیں۔ یہ دونوں فدائی تھے اور جلد از جلد فدائی حملہ کر کے حوروں کی آغوش میں سما جانا چاہتے تھے۔ اِن دونوں کا زیادہ تر وقت نمازیں پڑھنے اور قرآن کی تلاوت میں گزر جاتا تھا۔

یومِ جمہوریہ کی پریڈ سے ایک دن پہلے ہی خالد نے ائرپورٹ کے لاکر میں اپنا سوٹ کیس رکھ دیا تھا۔ اِس سوٹ کیس میں اس کا ہندوستانی پاسپورٹ موجود تھا۔ جس پر دبئی کا وزٹ ویزا لگا ہوا تھا۔ یومِ جمہوریہ کی شام کو اس کی فلائیٹ بک ہو چکی تھی۔

خالد نے یومِ جمہوریہ کو یومِ جہاد ہند کا نام دیا ہوا تھا۔ آج اس یومِ کی صبح ہونے والی تھی۔ نوجوان فدائین تہجد کی نماز پڑھنے کے بعد نہیں سوئے تھے۔ اِن دونوں نے فجر کی نماز خالد کی اقتدا میں ادا کی۔ نماز کے بعد خالد نے اِن کو اپنے ہاتھوں سے بارودی جیکٹ پہنائی۔ یہ جیکٹ عام بارودی جیکٹوں کے مقابلے میں کافی ہلکی تھی۔ اِس جیکٹ پر اِن دونوں کو کُرتا پہنایا گیا۔ اِس عمل کے بعد خالد نے دونوں کے گلے میں گلاب کے ہار ڈالنے کے بعد کالے دھاگے میں بندھی ہوئی ایک چابی گلے میں ڈالتے ہوئے کہا:

''میرے فدائی بھائیو!۔۔۔۔ جب تم جنت کے دروازے پر پہنچو گے تو وہاں کی خوبصورت ترین حور تم کو خوش آمدید کہے گی۔ وہ تم کو سرخ یاقوت سے بنے ہوئے محل کی طرف لے جائے گی اور کہے گی کہ اے اِس محل کے مالک! آپ اِس کا تالا کھول کر اِس میں داخل ہو جائیں!۔ تم اس گلے میں پڑی ہوئی چابی سے محل کا دروازہ کھول کر اندر آؤ گے اور وہ حور تمہارے پیچھے پیچھے ہوگی۔ محل کے دستور کے مطابق وہ خود تم کو ایک حوض

میں غسل کے لئے لے جائے گی جس میں بہت سی کنیزیں تمہاری منتظر ہوں گی۔ وہ تم کو عرقِ گلاب سے غسل دلائیں گی۔ ان کنیزوں اور حوروں کے جسم پر کوئی کپڑا نہ ہوگا۔ یہ سب تم پر حلال ہوں گی۔ بے شک اللہ نے مجاہدوں کو بہت بڑے انعامات سے نوازنے کا وعدہ کیا ہے''۔

خالد کی باتیں سن کر فدائین کے چہرے فرطِ جذبات سے تمتمانے لگے۔ خالد نے خود اُن دونوں کو گرم دودھ پینے کو دیا، جب انہوں نے دودھ پی لیا تو خالد نے دونوں لڑکوں کو اپنے پیچھے چلنے کو کہا۔ پریڈ کے علاقے میں صبح سے ہی چہل پہل شروع ہوگئی تھی۔ سکول کے بچے جوق در جوق اپنے والدین کے ساتھ پریڈ کے علاقے کی طرف جا رہے تھے تاکہ اُن کو مناسب جگہ سے پریڈ دیکھنے کا موقع مل سکے۔

خالد نے ایک جگہ پر ایک فدائی کو کھڑا کر کے کہا:

''دیکھو! جب دھماکے شروع ہو جائیں تو جو گاڑی بھی سامنے ہو اس کے پاس جا کر جیکٹ کی ڈوری کو کھینچ دینا''۔

یہی ہدایت اس نے دوسرے فدائی کو دوسری جگہ پر مقرر کرتے ہوئے دی۔ حکومت ہند نے دہشت گردی کے خطرے کی وجہ سے پریڈ کے وقت موبائل فون کی سروس ختم کر دی تھی۔ اِس بندش کا خالد کی منصوبہ بندی پر کوئی اثر نہیں ہونا تھا۔ اس کے بنائے ہوئے سرکٹ کا موبائل فون سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ابھی پریڈ شروع ہونے میں دیر تھی وہ مناسب جگہ پر بیٹھ کر ہندوستان کے قومی نغمے سننے میں مشغول ہو گیا۔

کافی انتظار کے بعد پریڈ صدر جمہوریہ اور وزیرِ اعظم کو سلامی دیتے ہوئے گزرنے لگی۔ خاص مہمانوں کی جگہ پر دُنیا بھر کے سفارتی نمائندے موجود تھے۔ جیسے ہی بھارتی ہتھیاروں کی نمائش کے لئے فوجی افسران کی سربراہی میں ٹرالرز گزرنا شروع ہوئے تو خالد نے اپنے کُرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کر ریموٹ کا بٹن دبا دیا۔ بہت سے دھماکے ایک ساتھ ہوئے۔ لوگ خون میں لت پت ہو کر زمین پر گرنا شروع ہوگئے۔ جو لوگ بھاگتے تھے وہ بھی بھاگتے بھاگتے گر جاتے تھے۔ کچھ ہی دیر میں ایک اور دھماکے کی آواز آئی ۔ایک فدائی نے اپنے آپ کو اڑا لیا تھا۔ خالد اب ایک اور دھماکے کا منتظر تھا۔ اس کو تشویش ہو رہی تھی کہ ابھی تک دوسرے فدائی نے اپنے آپ کو کیوں نہیں اُڑایا۔ اس نے کُرتے کی دوسری جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا ،وہ مطمئن ہو گیا۔ وہ اب دوسرا ریموٹ سوئچ دبانے کے لئے تیار تھا۔ یہ اس کا متبادل نظام تھا جس کے ذریعہ وہ فدائی کی جیکٹ کو خود اڑا سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ دوسرا فدائی ریموٹ کی پہنچ سے نکل جائے اس نے

سوئچ دبا دیا۔ اس نے دیکھا کہ اسکول کے بچوں کے عین درمیان ایک زوردار دھما ہوا جس سے ایک اور بھگدڑ مچ گئی۔

خالد نے ایک تربیت یافتہ ایجنٹ کی مانند عام لوگوں کے ہجوم میں بھاگنا شروع کر دیا تا کہ اس پر کسی کو شک نہ ہو سکے۔ کافی دور جا کر اس نے ریموٹ کے سوئچ کو ایک کچرے کے ڈبے میں پھینک دیا۔ اب اسے ایک ٹیکسی کی تلاش تھی جس کے لئے اسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ اس نے ٹیکسی والے سے ائرپورٹ چلنے کو کہا۔ ڈرائیور بھی اسی کی طرح سکھ تھا۔

اس نے خالد کو سکھ حلیئے میں دیکھ کر پنجابی میں کہا:

''یہ ہو نہ ہو پاکستان کا ہی حملہ ہے۔ ابھی ریڈیو پر خبر آئی ہے کہ برازیل کے صدر اس حملے میں معمولی زخمی ہوئے ہیں۔ جبکہ کئی وزراء اور افسران کو بھی چوٹیں آئی ہیں۔ افواہ اڑی ہوئی ہے کہ خودکش حملے میں ایک بریگیڈیئر بھی زخمی ہوئے ہیں۔ مجھے خطرہ ہے کہ دلّی میں فسادات نہ پھوٹ پڑیں''۔

خالد نے جواب میں کہا:

''ہاں جس نے بھی یہ کیا وہ بہت ظالم ہی ہوگا''۔

خالد نے ٹیکسی ڈرائیور سے ریڈیو کی آواز اونچی کرنے کو کہا تا کہ اسے تازہ خبریں مل سکیں اور ڈرائیور کے تبصروں سے نجات حاصل ہو سکے۔

ائرپورٹ پر اسے چار گھنٹے گزارنا مشکل ہو گئے تھے۔ وہاں پر موجود سارے ہندوستانی ٹیلی ویژن کے گرد جمع ہو کر تازہ ترین صورتحال سے آگاہی حاصل کر رہے تھے۔ تازہ ترین خبر یہ تھی کہ پیدل فوج سے تعلق رکھنے والے بریگیڈیئر زیادہ خون بہنے کی وجہ سے انتقال کر گئے تھے، دلّی کی پولیس نے دہشت گردوں کے قدموں کے نشان ڈھونڈنے پر کمر باندھ لی تھی۔ ایک اور بریکنگ نیوز میں وزیراعظم کی سربراہی میں ہنگامی اجلاس کی خبر تھی۔ کچھ ٹی وی چینلز نے ہندوستان پاکستان کے درمیان جنگ کا نقشہ کھینچنا شروع کر دیا تھا۔

خالد کی فلائیٹ کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا سوٹ کیس سنبھالا اور بورڈنگ کارڈ لینے کے بعد امیگریشن کی طرف بڑھ گیا۔ تین گھنٹے کی پرواز کے بعد اسے دبئی پہنچ جانا تھا۔ جن لوگوں نے اس کے دبئی کے سفر کو ممکن بنایا تھا انہوں نے اس کے لئے بذریعہ لانچ دبئی سے فوری طور پر کراچی پہنچانے کا بندوبست بھی پہلے ہی سے کر رکھا تھا۔

(۲۹)

سرزمین ہند پر دہشت گردی کی اس بھیانک کارروائی میں سینکڑوں لوگ ہلاک وزخمی ہوئے تھے۔ ہلاک وزخمی ہونے والوں میں بچوں کی ایک بڑی تعداد تھی، جن میں صدرِ جمہوریہ، برازیل کے صدر، غیر ملکی سفراءاور وزیر بھی شامل تھے۔ حکومتِ ہند نے اس اندوہ ناک واقعے پر تین روزہ قومی سوگ کا اعلان کیا تھا۔ ساری دُنیا سے ہندوستان کے لئے ہمدردی کے پیغامات آرہے تھے۔ ممبئی کے اسٹاک ایکسچینج کو ایک تاریخی مندی کا سامنا تھا۔ کاروباری لوگوں کے اربوں روپے راتوں رات ڈوب گئے تھے۔

پولیس جلد ہی اس مکان تک پہنچ گئی تھی جس میں خالد اپنی فرضی خالہ کے ساتھ رہتا تھا۔ خالد نے وہاں جان بوجھ کر کچھ ایسی دستاویزات چھوڑی تھیں کہ جن سے اس کا پاکستان سے تعلق ثابت ہونے میں کوئی ابہام نہ رہے۔ ہندوستانی ٹی وی چینلز بار بار یہ دستاویزات ٹی وی پر نشر کر رہے تھے۔ ہندوستان کے تمام شہروں میں لوگ سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ جابجا پاکستان کے جھنڈے جلائے جارہے تھے۔ دلی میں کئی مساجد پر قوم پرست ہندوؤں نے حملے کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہندوستان کے حساس شہروں میں فرقہ وارنہ فسادات روکنے اور مسلمانوں کی حفاظت کے لئے کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا۔

نیتا مکرُ جی انتخابات کے نتیجے میں اسمبلی میں حزب اختلاف کے لیڈر کے طور پر ابھرے تھے۔ انُ کے دھواں دار نفرت انگیز بیانات جلتی پر تیل ڈال رہے تھے۔ انہوں نے پاکستان کے ساتھ جنگ کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔

حکومتِ پاکستان نے ان حملوں میں سرکار کے ملوث ہونے سے صاف انکار کر کے حکومتِ ہند کو تحقیقات کرنے میں تعاون کی پیشکش کر دی تھی۔ حکومت پاکستان کے مُطابق یہ غیر ریاستی عناصر کی کاروائی تھی جو کہ پاکستان میں بھی حکومتِ پاکستان سے لڑ رہے ہیں۔ ہندوستان کا کوئی بھی سیاستدان پاکستان کے نقطۂ

نظر کو تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔

تین دن کا سوگ ختم ہونے پر وزیر اعظم نے ٹی وی پر عوام سے خطاب کر کے ان کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ سارے ہندوستان کی آنکھیں ٹی وی پر اور کان ریڈیو پر لگے ہوئے تھے۔ تقریر کے وقت سڑکیں سنسان ہو گئی تھیں۔ وزیر اعظم نے پاکستان میں جہادی سرگرمیوں کے مراکز اور تربیت گاہوں کو فضائی حملوں سے نشانہ بنانے کا اعلان کر دیا تھا۔ یہ اعلان ایک طرح سے جنگ کا نقارہ تھا، جو کہ پوری شدت کے ساتھ بج چکا تھا۔ ہندوستانی فوج کو فوری طور پر اگلے مورچوں کی طرف پیش قدمی کے احکامات مل گئے تھے۔ پاکستان نے بھی اپنی افواج کو سرحد کی جانب تعینات کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ دونوں ملکوں نے اپنے اپنے ریٹائرڈ اور ریزرو فوجیوں کو تیار رہنے کا حکم جاری کر دیا تھا۔ دونوں ملکوں کے نشریاتی ادارے دن رات قومی اور جنگی ترانے نشر کر رہے تھے۔

ہندوستان کے وزیر اعظم نے صورتحال پر بحث کے لئے قومی اسمبلی کا ہنگامی اجلاس طلب کر لیا تھا۔ حزبِ اختلاف کے رہنما کے طور پر مکرجی نے جوہری ہتھیاروں کے استعمال کی پالیسی پر سوال کر کے عالمی سطح پر ایک ہلچل مچا دی تھی۔ وزیر اعظم نے اسمبلی میں مکرجی کے سوال کے جواب میں بتایا کہ ہندوستان دس منٹ کے اندر جوابی ایٹمی حملہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ قومی اسمبلی کے اجلاس کے اگلے ہی دن حزبِ اختلاف کے رہنما نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ، وزیر اعظم قوم کو بے وقوف بنا رہے ہیں! ہندوستان کے ہتھیار داغے جانے کی پوزیشن میں نہیں۔ ان کو اس حالت میں لانے کے لئے کم از کم دو دن درکار ہوں گے۔ پریس کانفرنس سے مکرجی کے خطاب نے حکومت کے لئے ایک مسئلہ کھڑا کر دیا تھا۔ عوام نے سڑکوں پر ایٹمی ہتھیاروں کو تیار حالت میں رکھنے کی مانگ میں جلوس نکالنا شروع کر دیئے تھے۔ اپوزیشن کا کہنا تھا کہ اگر یہ مانگ پوری نہ کی گئی تو دوسری چھوٹی پارٹیوں سے مل کر حکومت گرا دی جائے گی۔ بین الاقوامی طاقتیں اس جنگی جنون کا بہت سنجیدگی سے جائزہ لے رہی تھیں۔

آخر کار حکومت ہند نے حزبِ مخالف کی مانگ کے آگے ہتھیار ڈال کر ایٹمی ہتھیاروں کو داغے جانے کی پوزیشن پر تیار رکھنے کا حکم دے دیا۔ ہندوستانی ایٹمی ہتھیاروں کے ادارے نے حکم پاتے ہی ہتھیاروں میں ایندھن بھرنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ گو کہ یہ کام بہت خفیہ طریقے سے ہو رہا تھا، لیکن پاکستان کو ان سرگرمیوں کی خبر مل چکی تھی۔

(۳۰)

پاکستان آرمی کے کمانڈر انچیف وزیراعظم سے ہنگامی مُلاقات کرنے ایوانِ وزیراعظم پہنچ چکے تھے۔ وزیراعظم نے انُ کا اپنے دفتر میں استقبال کیا۔ آرمی چیف ان کو سلیوٹ کرنے کے بعد اپنے لئے مختص صوفے پر بیٹھ گئے۔

انہوں نے گفتگو کا آغاز اس طرح سے کیا: ''جناب وزیراعظم! آپ جانتے ہیں کہ حالات ہمیں جنگ کے دہانے کی طرف دھکیل رہے ہیں''۔

وزیراعظم نے کہا: ''حکومت کو اِس کا مکمل ادراک ہے۔۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم سفارتی ذرائع اور دوست ممالک کے تعاون سے حکومتِ ہند کو باور کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ اس سانحہ میں حکومتِ پاکستان یا ہماری کسی بھی ایجنسی کا کوئی کردار نہیں تھا''۔

آرمی چیف نے سرد مہری سے کہا: ''میں امید کرتا ہوں کہ یہ کوشش کامیاب ہو''۔

وزیراعظم نے کہا: ''امریکہ اور چین سفارتی محاذوں پر سرگرم ہیں ...آپ اطمینان رکھیں .. جنگ کی نوبت نہیں آئے گی''۔

آرمی چیف نے سپاٹ لہجے میں کہا: ''تو آپ کو امریکن دوستوں نے یہ بھی بتا دیا ہوگا کہ حکومت ہندوستان نے ایٹمی میزائلوں میں ایندھن بھرنے کا حکم جاری کر دیا ہے''۔

وزیراعظم نے پُر اعتماد لہجے میں کہا: ''جی! مجھے اِس بات کی خبر ہے''۔

آرمی چیف نے پُر تشویش لہجے میں کہا: ''سٹریٹیجک لحاظ سے ہمارا ہندوستان کے ساتھ جنگی توازن بگڑ گیا ہے''۔

وزیرِاعظم نے کہا: ''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

آرمی چیف نے کہا: ''میں سفارش کروں گا کہ ہمیں بھی ایٹمی میزائلوں کو تیار حالت میں رکھنے کی اجازت دی جائے''۔

وزیراعظم نے کہا:

''آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ دہشت گردی کے اِس واقعے نے ہماری اخلاقی حیثیت کمزور کر دی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی وقت نہیں آیا کہ ہم اپنے ہتھیاروں کو لانچنگ پوزیشن پر لے آئیں''۔

آرمی چیف نے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا: ''لیکن بھارتی حکومت اپنے ہتھیاروں کو لانچنگ پوزیشن پر لا چکی ہے''۔

وزیراعظم نے جواب میں کہا: ''حکومتِ ہند نے یہ قدم انتہا پسند حزبِ اختلاف کی طرف سے حکومت گرانے کی دھمکی کے بعد اٹھایا ہے۔

ہم کو انتہا پسندوں کے جواب میں انتہا پسندانہ رویہّ اختیار نہیں کرنا چاہئے''۔

آرمی چیف نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا: ''جناب! میں پھر بھی اصرار کروں گا کہ آپ آج ہی اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے ہمیں ایٹمی میزائل تیار حالت میں رکھنے کا حاکم جاری کریں''۔

وزیراعظم نے کہا: ''میں کابینہ کی منظوری کے بغیر یہ حکم جاری نہیں کر سکتا''۔

آرمی چیف نے ذرا جارحانہ لہجے میں کہا: ''جناب! آپ شاید بھول رہے ہیں کہ میری ایک فون کال پر کابینہ آپ سمیت گھر جا سکتی ہے۔ آپ مجھے مجبور نہ کریں کہ میں جنگی ایمرجنسی نافذ کرنے کا اعلان کروں''۔

وزیراعظم نے صورت حال کی نزاکت کو بھانپ کر ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا:

''ٹھیک ہے آج آپ کو تحریری آرڈر مل جائے گا''۔

آرمی چیف نے کہا:

''شکریہ جناب وزیراعظم! آپ کو احساس ہے کہ اِس مُلک کا دِفاع ہماری اوّلین ذمہ داری ہے''۔

یہ کہہ کر آرمی چیف کھڑے ہوئے اور وزیراعظم کو ایک زوردار سلیوٹ مار کر اُن کے دفتر سے روانہ ہو گئے''۔

(۳۱)

دہشت گردی اور راج نیتی کا کھیل دونوں ملکوں کو لحہ بہ لحہ جنگ کی طرف دھکیل رہا تھا۔اِس جنگی جنون میں ہندو انتہا پسند اور مسلم جہادی دونوں طرف چھاتے جا رہے تھے۔مکرُ جی عوام کو پاکستان کے خلاف جنگ میں افواج کے شانہ بہ شانہ لڑنے پر آمادہ کرنے لئے جگہ جگہ جلسے جلوس کرتے پھر رہے تھے۔پاکستان،امریکا اور چین کے ذریعے سفارتی مذاکرات سے کشیدگی کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن پاکستان میں بھی سڑکوں پر غزوہَ ہند کے نعرے گونج رہے تھے۔چین کی سفارتی کوششوں پر اس وقت پانی پھر گیا جب ان کی حکومت نے کچھ یورپی کوہ پیماؤں کو تبتی پہاڑ کی چوٹی ''کیلاش'' کو سر کرنے کی اجازت دیدی۔ پہاڑ کی یہ چوٹی ہندوؤں کے لئے بہت ہی

مقدس تھی۔ہندوؤں کی مقدس کتابوں کے مطابق ''کیلاش'' شیو بھگوان اور بہت سی ہستیوں کے مقام کی جگہ تھی،اس جگہ کی توہین کی جارہی تھی۔

اس واقعے کی وجہ سے ہندوستان کے مسلم رہنماؤں نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا تھا جس کے مطابق

''کیلاش پر انسانی قدم رکھنا ایسے ہی تھا کہ جیسے کوئی کعبہ میں جوتوں سمیت گھس آئے''۔

مسلمان رہنماؤں کے اِس بیان سے ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوگئی تھی لیکن پاکستان پر اُن کا غیض وغضب اُسی طرح برقرار تھا۔

کیلاش کے آس پاس کے گلیشیرز سے گنگا،برہم پترا اور سندھو دریا جیسے پانی کے عظیم دھارے پھوٹتے ہیں۔ہندوستان،پاکستان اور بنگلہ دیش کا بیشتر حصہ ان ہی دریاؤں سے سیراب ہوتا ہے۔بدھا کے ماننے والوں کے بقول کیلاش،دُنیا کی ناف ہے۔دینا کی زندگی کیلاش سے وابستہ ہے۔

(۳۲)

ہندوستان نے ایٹمی میزائلوں کو داغنے کی حالت میں لا کر دُنیا کو خوف و دہشت میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایٹمی ہتھیاروں کے مخالفین نے دنیا بھر میں ایٹمی ہتھیاروں کے خلاف مظاہرے کرنا شروع کر دیئے تھے۔ امریکا اور دیگر مغربی ممالک سفارت کاری کے ذریعہ ایٹمی ہتھیاروں کو زمانہ امن کی حالت میں واپس لے جانے پر دباؤ ڈال رہے تھے۔ یہ ممالک ہندوستان کی بڑھتی ہوئی معاشی طاقت اور مارکیٹ کی اہمیت کی وجہ سے انتہائی اقدام اٹھانے سے گریزاں تھے۔

پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کے مقامات پر ہونے والی غیر معمولی سرگرمیوں نے امریکیوں کو چوکنا کر دیا تھا۔ جاسوس سیاروں اور انتہائی بلندی پر نظر نہ آنے والے ڈرونز میں نصب غیر مرئی آنکھیں پاکستان کے ایٹمی اثاثوں پر مرکوز تھیں۔ فضا میں بہت بلندی پر پرواز کرتے اِن چھوٹے چھوٹے جاسوسوں سے کسی بھی حرکت کا پوشیدہ رہنا ناممکن تھا۔ امریکا کو اس بات میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ پاکستان بھی اپنے ایٹمی ہتھیاروں کو لانچنگ پوزیشن میں لے آیا ہے۔ امریکی صدر نے اپنا خصوصی ایلچی دلّی اور اسلام آباد بھیجنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دُنیا ایک بار پھر کیوبن میزائیل بحران جیسے حالات سے دوچار ہوگئی تھی۔

پاکستان اور ہندوستان کی فوجیں روایتی جنگ کے لئے بھی سرحد پر ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھیں۔ قاری سُفیان اس صورت حال پر پھولے نہ سماتے تھے۔ اُن کی نظر میں یہ غزوہ ہند کا وہ منظر نامہ تھا کہ جس کا احادیث میں ذکر آیا ہے۔ انہوں نے غزوۂ ہند کے لئے خیبر سے کراچی تک پھیلے ہوئے مجاہدین کو جہاد کے لئے کمر بستہ رہنے کا حکم دے دیا تھا۔ یہ مجاہدین بھی دلّی کے لال قلعہ پر اسلام کا جھنڈا لہرانے کو بے تاب تھے۔

(۳۳)

خالد کسی رُکاوٹ کے بغیر دبئی سے سمگلروں کی ایک لانچ کے ذریعے کراچی پہنچ گیا تھا۔ کراچی میں لانچ پر اس کا استقبال مقامی کمانڈر نے کیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ خالد کے لئے نیا کُرتا شلوار اور پشاوری چپل لے کر آیا تھا۔

اس نے کپڑے اور چپل خالد کو دیتے ہوئے کہا:

''یہ لو نئے کپڑے۔۔۔ تمُ لانچ پر ہی بدل لو۔۔۔۔۔ میں تم کو گھاس بندر سے سیدھے ائرپورٹ لے جاؤں گا۔ تم ڈیرہ غازی خان کی پرواز سے جلد مدرسے پہنچ جاؤ گے۔ قاری صاحب کا حکمُ ہے کہ تم جلد سے جلد وہاں پہنچو''۔

خالد نے نیازمندی سے کہا: ''جیسے قاری صاحب کا حکمُ''

ابھی یہ لوگ باتیں ہی کر رہے تھے کہ مقامی کمانڈر کے موبائل پر قاری صاحب کا فون آگیا۔ کمانڈر نے قاری صاحب سے دعا و سلام کے بعد اُن سے کہا:

آپ کی امانت بحفاظت پہنچ گئی ہے۔

قاری صاحب نے مقامی کمانڈر سے کہا کہ وہ ان کی بات خالد سے کروائے۔ خالد خود بھی قاری صاحب سے بات کرنے کو بے تاب تھا۔ کمانڈر نے اپنا فون خالد کو دیتے ہو کہا:

''یہ لو قاری صاحب بات کرنا چاہتے ہیں''

قاری صاحب نے جذبات سے بھرآئے ہوئے لہجے میں کہا:

''بیٹا! میں تو کیا ہوں! فرشتے تک تمہارا ماتھا فخر سے چومتے ہیں۔ میرے بیٹے آج سے تمُ خالد سفیانی نہیں بلکہ خالد خراسانی ہو۔ لشکرِ خراسان کے اوّلین کمانڈر۔ بیٹا تم اپنے حجرُے میں پہنچو اور آرام کرو میں کچھ عُرصے کے لئے مدرسے میں نہیں ہوں۔ تم سے انشاء اللہ جلد مُلاقات ہوگی۔ اللہ تمہاری نگہبانی کرے''۔

یہ کہہ کر قاری صاحب نے فون رکھ دیا۔ اُن کے ادا کیے گئے تہنیتی اور تعریفی جملوں سے خالد کا چہرہ ابھی تک تمتما رہا تھا۔ خالد کو مقامی کمانڈر نے ائرپورٹ پر رخصت کرتے ہوئے ایک سفری بیگ گاڑی کی ڈگی سے نکال کر دیتے ہوئے کہا:

''یہ رکھ! لو۔ اس میں بیس لاکھ روپے ہیں۔ تمہارے اخراجات کے لئے''۔

اس کی پرواز کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ وہ سفری بیگ کندھے پر ڈالے اپنا ٹکٹ ہاتھ میں پکڑے ائرپورٹ کے لاؤنج میں داخل ہو گیا۔

مدرسے میں اس کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ وہاں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کس مشن پر اور کہاں تھا۔ اس سے کوئی سوال پوچھنے کی جرأت بھی نہیں کرتا تھا۔ نوجوان طلباء نے مل کر اس کے حجرے کی اچھی طرح سے صفائی کر دی تھی۔ مدرسے میں اس کے شب و روز معمول کے مطابق گزرنے لگے۔ وقت پر کھانا، نماز باجماعت اور کبھی دل کرے تو کسی درس میں جا بیٹھنا یا پھر نوجوان جہادیوں اور طلباء کو جہاد کے واقعات سنا کر ان کا دل گرمانا۔

آج پنجاب یونیورسٹی سے اسلامی جمعیت طلباء کا ایک وفد کچھ روز کے لئے مدرسے میں قیام کے لئے آیا ہوا تھا۔ یہ جمعیت کے ارکان کی تربیت کا معمول تھا کہ نوجوان کچھ وقت علماء کے ساتھ اسلامی ماحول میں گزاریں۔ یہ نوجوان علماء کے درس میں شرکت کے بعد شام کو خالد کے حجرے میں آ گئے۔ یہ لوگ خالد سے جہادِ افغانستان و کشمیر کے واقعات سننا چاہتے تھے کیوں کہ اسلامی جمعیت طلباء نے اس جہاد میں بہت سے شہداء پیش کئے تھے، خالد نے ان سب نوجوانوں کا بہت خوش دلی سے استقبال کیا۔

ان نوجوانوں کے رہنما نے ایک ایک کر کے سب کا تعارف کرانے کے بعد کہا:

''ہم سب کو فخر ہے کہ آج ہم جہادِ افغانستان کے ایک عظیم کمانڈر سے مل رہے ہیں''۔

خالد نے کہا:

''کمانڈر ہونا کوئی اتنی اہم بات نہیں اللہ کی بارگاہ میں ہر مجاہد کا درجہ برابر ہے''۔

یہ لوگ رات گئے تک جہاد کے واقعات سے اپنا دل گرماتے رہے۔ ان نوجوانوں سے تبادلہ خیالات کے دوران خالد کو معلوم ہوا کہ ان نوجوانوں میں سے ایک نوجوان نومسلم ہے۔ وہ ہندو سے مسلمان ہوا ہے۔

خالد نے اس سے دریافت کیا:

''نوجوان! کیا تم بتانا پسند کرو گے کہ اسلام کی کس خوبی نے تم کو مسلمان ہونے پر مائل کیا؟''۔

نواجون نے جواب میں کہا:

''میں نے ایک صحابیؓ کی داستان پڑھی تھی جنہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی والدہ کو دعوت اسلام دی لیکن ان کی ماں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اپنی ماں کی دل و جان سے خدمت کرتے تھے۔ پیغمبر اسلام کو بھی اِن صحابی کا یہ عمل بہت پسند تھا، اس اعلیٰ اخلاق نے مجھے اسلام کی طرف مائل کیا تھا۔ یہ نوجوان ماں کی عظمت اور ماں سے محبت کے بہت سے واقعات سناتا رہا اور خالد کی آنکھوں سے آنسو روانی سے بہتے رہے۔

خالد کو یوں روتا دیکھ کر ایک نوجوان نے پوچھا:

''آپ جیسے بہادر آدمی کی آنکھوں میں آنسو''۔

خالد نے کہا:

''بہادر لوگوں کے سینے میں بھی دلِ ہوتا ہے''۔

داستان سنانے والے نوجوان نے کہا:

''معاف کیجئے گا، شاید میں نے آپ کا دلِ دکھایا ہے''۔

خالد نے کہا:

''نہیں، تم نے میرا دلِ قطعی نہیں دُکھایا بلکہ میری آنکھیں کھول دی ہیں۔

مجھے میری ماں کی یاد نے رُلایا ہے''۔

ایک نوجوان نے پوچھا:

''کیا وہ اس دُنیا میں نہیں؟''۔

خالد نے کہا:

''معلوم نہیں شاید زندہ ہوں۔ اور اگر زندہ بھی ہوں گی تو بھی کیا۔ وہ ایک موت سے بدتر غلامی کی زندگی گزار رہی ہوں گی''۔

ایک نوجوان نے بہت تجسس سے سوال کیا:

''کیا وہ افغانستان میں کسی دشمن کی قید میں ہیں؟''۔

خالد نے کہا:

''نہیں، وہ پاکستان میں ایک کافر وڈیرے کی قید میں ہیں''۔

نوجوانوں کے اس گروہ کے قائد نے کہا:

''آپ ہمیں حکم کریں تو ہم ابھی آپ کی ماں کو آزاد کرا لائیں۔ آپ جمعیت کی طاقت پر بھروسہ تو کر کے دیکھیں''۔

آپ کا شکریہ۔ یہ کام میں انشاءاللہ اپنے زور بازو پر ہی کروں گا۔ اب آپ لوگ جائیں مجھے اپنی ماں کو آزاد کرانے کی تیاری کرنا ہے''۔

سب نوجوان یہ سن کر اٹھ کھڑے ہوئے اور باری باری خالد سے گلے ملتے ہوئے اس کے حجرے سے نکل گئے۔

(۳۴)

خالد نوجوان طلباء کے جانے کے بعد احساس ندامت کے باعث سو نہیں پا رہا تھا۔ اسے اپنی بے علمی اور جہالت پر شدید غصہ تھا۔ اِس لاعلمی کے باعث وہ اپنی ماں کے ہندو ہونے پر شدید احساس کمتری میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ کسی سے اپنی ماں کے بارے میں بات نہ کرتا تھا۔ اگر کوئی اُس سے اِس کے خاندان کے بارے میں بات کرتا تھا تو وہ اکثر بات کا موضوع بدل دیتا تھا۔

اُس نے نماز فجر کے بعد اپنے گاؤں کے علاقے کے قرب و جوار کے رہنے والے ذمہ دار جہادی بھائیوں سے فون پر رابطہ کیا۔ اس نے اُن سب کو وڈیرے حیدر شاہ کا موبائل نمبر حاصل کرنے کی ہدایت کی۔ ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں اسے وڈیرے کا نمبر مِل گیا تھا۔ وہ وڈیرے کو فون کر کے اپنی ماں کی خیریت پوچھنے کے لئے بے تاب تھا۔۔ وہ دل ہی دلِ میں دعا مانگ رہا تھا کہ اس کی ماں زندہ ہو۔

اس نے دھڑکتے ہوئے دلِ کے ساتھ وڈیرے کا نمبر ملایا۔

دوسری طرف سے وہی رعونت زدہ بھاری آواز سنائی دی، جس کو بچپن میں سن کر وہ خوف سے کانپ جاتا تھا۔

وڈیرے نے کہا:

کون ہے بابا؟۔

"خالد نے کہا:

"میں ساون ہوں۔۔۔۔ مجھے اپنی ماں سے بات کرنا ہے"۔

وڈیرے نے جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں کہا:

"کون ساون؟۔۔۔ اور کون ہے تیری ماں۔۔۔ بابا غلط نمبر پر فون کیا ہے"۔

خالد نے کہا:

''میں نے وڈیرے حیدر شاہ کے نمبر پر فون کیا ہے''۔

وڈیرے نے حیرت زدہ لہجے میں کہا:

''کیا نام ہے تیری ماں کا؟۔۔۔اور کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا؟''۔

خالد نے کہا:

''میں بھاگ بھری کا بیٹا ساون ہوں''۔

وڈیرے نے چنگھاڑتے ہوئے غضبناک لہجے میں کہا:

''تو' حرام خور ابھی تک زندہ ہے۔ بھاگ بھری ابھی تک کہتی ہے کہ میں تجھے ڈھونڈ کرلاؤں''۔

یہ بات سن کر خالد کی جان میں جان آ گئی کہ اس کی ماں زندہ ہے۔

خالد نے اپنے اوسان بحال کرتے ہوئے وڈیرے کو جواباً کہا:

''مجھے ماں کو اپنے پاس بلانا ہے''۔

وڈیرے نے پھر غصے سے آگ بگولہ ہوتے ہوئے جواب دیا:

''حرام زادے! تیری اتنی جرأت کہ وڈیرے حیدر شاہ سے اِس طرح بات کرے۔ پہلے تُو اِدھر آ۔ تُو جو اتنے سال کے لئے کام سے بھاگا ہے اس کا بدلہ کیا تیرا باپ چکائے گا؟''۔

یہ کہہ کر وڈیرے نے فون کاٹ دیا۔

خالد نے غصّے پر قابو پا کر وڈیرے کا نمبر دوبارہ ملایا۔

اس دفعہ فون وڈیرے کے بجائے اس کے کسی ملازم نے اٹھایا۔ اس نے ساون سے کہا کہ سائیں حیدر شاہ بہت مصروف ہیں وہ کسی سے بات نہیں کر سکتے''۔

خالد نے ملازم کو جواب میں کہا:

''میں ایک ہفتہ کی مہلت دیتا ہوں میری ماں مرکزی دار العلوم راجن پور میں پہنچ جانی چاہئے''۔

یہ کہہ کر خالد نے فون کاٹ دیا۔

ملازم نے یہ بات ڈرتے ڈرتے وڈیرے کو بتائی۔

وڈیرے نے ملازم کو کہا:

''اگر حیدر شاہ ایک اچھوت غلام سے ڈر گیا تو پھر وہ کیسا سیدّ اور کیسا وڈیرہ!''۔

ملازم نے کہا:

''سائیں! ذرا غور کریں اس نے دار العلوم پہنچانے کو کہا ہے کہیں وہ مولویوں سے تو نہیں مِل گیا''۔

وڈیرے نے کہا:

''تم فکر نہ کرو!۔۔۔وہ کچھ نہیں کرسکتا۔۔۔اُس کی ماں تو یہیں ہے۔۔ویسے بھی اِن اچھوتوں میں بزدلی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے''۔ملازم وڈیرے کی بات سن کر خاموش ہوگیا۔

(۳۵)

ہندوستان میں ایٹمی ہتھیاروں کو داغے جانے کی سطح پر آنے کے بعد پاکستان آرمی بھی اپنے ایٹمی ہتھیاروں کو اس سطح پر لانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ قاری صاحب کے مرید خاص ''جنرل صاحب'' کو ایٹمی ہتھیاروں کو استعمال کرنے کی مشق کرنے کے احکامات موصول ہو چکے تھے۔ امریکہ جنگ پر آمادہ ہندوستان کو ایٹمی ہتھیار زمانہ امن کی سطح پر لانے میں قائل کرنے پر ناکام ہو چکا تھا۔ عالمی طاقتوں کا اگلا قدم اقوام متحدہ کی قرارداد کے ذریعے دونوں ممالک کی افواج کو زمانہ امن کی سطح پر لانے پر مجبور کرنا تھا۔

جنرل صاحب کو اِس بات کا اچھی طرح اندازہ تھا کہ دونوں ممالک کو اقوام متحدہ کی اپیل پر ہر حالت میں کان دھرنا ہوں گے۔

آج شام جنرل صاحب کی قیادت میں ایٹمی ہتھیار داغنے کی آخری مشق تھی۔ اسٹریٹیجک ہتھیاروں کے مرکز میں غیر معمولی گہما گہمی تھی۔ مرکز کے سربراہ ''جنرل صاحب'' کو میزائل داغنے کا صدارتی خفیہ کوڈ موصول ہو چکا تھا۔ یہ کوڈ ایک ایسے بریف کیس میں مقفل تھا جس کو جنرل صاحب اِس ادارے کے بریگیڈیئر کے ساتھ ہی مل کر کھول سکتے تھے۔ اِس بس موجود کوڈ کو کمپیوٹر میں فیڈ کر کے دلی کو ٹارگٹ کرنا ممکن تھا۔ جنرل صاحب ایک فرضی کوڈ سے دلی کو فرضی طور پر کئی دفعہ کامیابی سے اُجاڑ چکے تھے۔ آج کی آخری مشق کامیابی سے سرانجام دینے کے بعد جنرل صاحب مشق کے نتیجے کی رپورٹ آرمی چیف کو ہیڈ کوارٹر بھیجنے کے لئے اپنے چیمبر میں چلے گئے۔

ایٹمی ہتھیاروں کے کنٹرول اور کمانڈ مرکز کے انچارج بریگیڈیئر اپنے کمپیوٹر پہ نظریں لگائے مستعد بیٹھے تھے کہ اُن کے انٹر کام کی گھنٹی بجی۔ انٹر کام پر ٹمٹمانے والی سرخ روشنی بتا رہی تھی کہ یہ کمان اور کنٹرول سنٹر کے جنرل صاحب کی کال تھی۔ بریگیڈیئر صاحب نے کال موصول کرنے کے بٹن کو دبا کر مخصوص فوجی انداز میں کہا:

''سر!'' دوسری طرف سے جنرل صاحب نے حکم جاری کرتے ہوئے کہا:

''آپ میرے چیمبر میں رپورٹ کریں''۔

بریگیڈیئر جنرل صاحب کے چیمبر کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے چیمبر کے پہلے دروازے پر لگے کیمرے پر اپنی آنکھ رکھ کر خودکار حفاظتی نظام کو اپنی پہچان کروائی۔ چیمبر کا دروازہ ایک خودکار نظام کے تحت کھل کر بند ہوگیا۔ انہوں نے یہی عمل دوسرے دروازے پر دھرایا تو وہ دروازہ بھی ان کے لئے کھل گیا بریگیڈیئر صاحب نے کمرے میں آکر ایک زوردار سلیوٹ کر کے کہا:

''یس سر!''

جنرل صاحب نے ایک دھاتی بریف کیس اپنی میز پر رکھتے ہوئے کہا:

''بریگیڈیئر۔ ایمرجنسی کے آرڈر آگئے ہیں! میں نے اپنا کوڈ اس میں فیڈ کر دیا ہے۔ یہ ہے ایمرجنسی کا پیغام۔

یہ بات انہوں نے ایک کاغذ اپنے ہاتھ میں لہراتے ہوئے کہی۔ اب آپ اپنا کوڈ اس میں فیڈ کر دیں تاکہ اس ایمرجنسی کی صورتحال سے نمٹا جا سکے''۔

بریگیڈیئر صاحب نے آنکھیں بند کر کے اپنے سینئر کے حکم پر عمل کرنے کی روایت کی پاسداری کرتے ہوئے ''یس سر'' کہا اور اپنا کوڈ ایک الیکٹرونک آلے پر دیکھ کر بریف کیس میں فیڈ کر دیا۔ بریف کیس فوراً ہی ایک ٹک کی آواز کے ساتھ کھل گیا۔

جنرل صاحب نے انہیں دوسرا آرڈر جاری کرتے ہوئے کہا:

''چیمبر کے کمانڈ سسٹم کے کمپیوٹر پر جا کر آپ بریف کیس کھولنے کو رپوٹ کریں''۔

بریگیڈیئر صاحب ''یس سر'' کہہ کر جنرل صاحب کے کمرے سے ملحقہ دوسرے کمرے کی طرف چلے گئے۔

جنرل صاحب اپنی میز کی دراز سے اپنا ہکلیر اینڈ کوچ کا یو پی ایس پستول نکال کر بریگیڈیئر صاحب کے پیچھے چل پڑے۔ بریگیڈیئر صاحب کمپیوٹر کے کی بورڈ پر جھکے ہوئے ایک فارم کو بھر رہے تھے۔ جنرل صاحب نے قریب سے بریگیڈیئر صاحب کی کھوپڑی پر فائر کر دیا۔ ان کے طاقتور پستول کی گولی بریگیڈیئر

صاحب کے سر کو چیرتی ہوئی دیوار سے جاٹکرائی۔ اس ساؤنڈ پروف چیمبر سے فائر کی آواز کا باہر جانا ناممکن تھا۔ بریگیڈیئر صاحب کو قتل کرنے کے بعد جنرل صاحب اطمینان سے واپس اپنی ٹیبل پر آکر بیٹھ گئے۔ ایک وقفے کے بعد انہوں نے انٹرکام سے کال کر کے ہتھیاروں کے داغے جانے کے نظام کے آخری اہم افسر ''کرنل صاحب'' کو اپنے چیمبر میں طلب کیا۔ کچھ ہی لمحے میں کرنل صاحب اُن کے سامنے کھڑے تھے۔

جنرل صاحب نے ان کو حکم دیتے ہوئے کہا:

''آپ اسی وقت سویلین سائنس دانوں اور انجینئرز کو بریفنگ روم میں جمع ہونے کا حکم دیں۔ ایک ایمرجنسی بریفنگ دینا ہے''۔

کرنل صاحب نے ''یس سر'' کہہ کر انٹرکام پر ہی میٹنگ کے احکامات جاری کر دیئے۔

کرنل صاحب کے حکم جاری کرتے ہی، جنرل صاحب نے تیزی سے گولی کرنل صاحب کی پیشانی پر داغ دی۔

''کرنل صاحب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جیسے کہ پوچھ رہی ہوں ''بروٹس تم بھی''!۔

اب جنرل صاحب نے دو پستول اور نکالے اور اُن کو اپنی جیبوں میں ڈال لیا۔ انہوں نے صدارتی کوڈ والے بریف کیس سے ایٹمی ہتھیار داغے جانے کے کوڈ والے سربمہر لفافے کو کھول کر اُن سے کوڈ نکال کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ وہ بہت پرسکون انداز سے اپنے چیمبر سے نکل کر بریفنگ روم کی طرف چل پڑے۔ وہاں پر ضروری مہارتیں رکھنے والا سویلین عملہ جنرل صاحب کا منتظر تھا۔ جنرل صاحب نے کمرے میں آتے ہی اپنے دونوں ہاتھ جیبوں سے باہر نکالے۔ اِن کے دونوں ہاتھوں میں بھرے ہوئے پستول تھے۔ انہوں نے ایک ایک پر تاک کر فائر کرنا شروع کر دیے۔ کسی کو بھی اس بات کی توقع نہ تھی۔ کوئی بھی اس قابل نہ تھا کہ اپنا دفاع کر سکے۔ ایک نوجوان لڑکی جو ڈیٹا تجزیہ کار تھی، زخمی حالت میں رینگتی ہوئی جنرل صاحب کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔

جنرل صاحب نے اس کے سر میں قریب سے گولی مار کر اسے زندگی سے رہائی دلا دی۔ اب وہ کنٹرول روم میں آئے اور انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کچھ قرآنی آیات کی تلاوت کرنے کے بعد اس طرح دعا کی:

''اے میرے اللہ! آج جتنے مسلمان ایک عظیم مقصد کی خاطر شہید ہوئے ہیں ان سب کو اپنے جوار

رحمت میں جگہ دے۔ آج جتنے مسلمان دِلّی میں شہید ہونے والے ہیں ان کو غزوۂ ہند کے اولین شہداء میں شمار کرنا''۔

یہ دعا مانگنے کے بعد جنرل صاحب نے ہتھیاروں کے کنٹرول کے مرکزی کمپیوٹر کو سنبھال لیا۔

کئی دفعہ میزائل داغنے کی مشق نے جنرل صاحب کو پُر اعتماد بنا دیا تھا۔ انہوں نے نہایت ذہانت اور چالاکی سے اس ضمن میں ساری مہارتیں حاصل کر لی تھیں۔

جنرل صاحب نے مرکزی کمپیوٹر پر گلوبل پوزیشنگ سسٹم کے ذریعے میزائل کو دلّی پر مرکوز کر کے دلِ میں کہا:

''اے میرے اللہ! غزوۂ ہند کے راستے میں یہ میری ایک ادنیٰ سی خدمت ہے اسے اپنی بارگاہ میں قبول کرنا''۔

اس دعائیہ خیال کے بعد انہوں نے میزائل داغنے کے کوڈ کو فیڈ کرنا شروع کر دیا۔ کوڈ کو کئی دفعہ مختلف دوسرے کمپیوٹر پر کامیابی سے فیڈ کرنے کے بعد ایک سرخ بٹن کو دباتے ہی زمین میں پوشیدہ لانچر باہر نکل آیا۔ اس لانچر پر ایک ہزاروں ٹن وزنی دیوہیکل میزائل اپنی وحشت ناک پرواز کے لئے تیار تھا۔ کچھ ہی لمحوں میں میزائل کے نچلے حصے میں ایندھن نے جلنا شروع کر دیا اور میزائل نے ایک زوردار دھماکے سے پرواز شروع کر دی۔ دورانِ پرواز میزائل سے کچھ چھوٹے چھوٹے بم اطراف سے گر رہے تھے جن سے سفید دھواں نکل رہا تھا۔

میزائل لانچ ہوتے ہی سی آئی اے نے صدر امریکا کو اس واقعے کے بارے میں بتا دیا جنہوں نے فوراً ہی ہاٹ لائن پر وزیر اعظم ہندوستان کو فون کر کے دفاعی اقدامات کرنے کی ہدایت کی۔ حکومت ہند اس خبر سے لرز گئی تھی۔ ہندوستانی آرمی کی کمان نے فوراً امریکا کی فراہم کردہ میزائل دفاعی ڈھال کو متحرک کر دیا۔

ایٹمی حملے میں پہل نہ کرنا حکومتِ ہند کا بنیادی جنگی اصول تھا تاہم اب حکومت ہند جوابی حملے کے لئے آزاد تھی۔

دفاعی شیلڈ کو متحرک کرتے ہی حکومتِ ہند نے اسلام آباد پر ایٹمی میزائل داغنے کا حکمُ جاری کر دیا۔ امریکا، انڈیا اور پاکستان کی ایٹمی تنصیبات میں ہونے والی حرکات وسکنات پر ہمہ وقت نظر رکھا ہوا تھا۔

ہندوستان سے میزائل داغے جانے کا حکم جاری ہوتے ہی امریکا نے پاکستانی حکومت کو آگاہ کر دیا۔ پاکستان کے دفاعی حکام نے فوراً میزائل دفاعی ڈھال کو متحرک کر کے اپنی ہوائی حدود محفوظ کر لیں۔

پاکستان کی طرف سے داغا ہوا ایٹمی میزائل جیسے ہی ہندوستان کی سرحد میں آیا تو دفاعی نظام نے اس پر چھوٹے گائیڈڈ میزائلوں سے حملہ کر کے اسے فضا میں ہی تباہ کرنے کی کوشش کی۔ ایٹمی میزائل سے گرنے والے حرارتی بم گائیڈڈ میزائلوں کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گئے۔ خوفناک تباہ کن ایٹمی میزائل دلی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ دفاعی ڈھال کے آخری حربے نے ایٹمی میزائل کے مواصلاتی نظام میں کامیابی سے دخل اندازی کر کے اسے راستے سے بھٹکا دیا۔ یہ تباہ کن شیطانی ہتھیار اپنے راستے سے بھٹک کر شمال میں انجانی منزل کی طرف مڑ گیا تھا۔ کنٹرول روم میں موت کے منہ میں بیٹھے ہوئے تمام افراد کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ سب نے کھڑے ہو کر "جے ہند" کا نعرہ لگایا۔ سب لوگ جذبات سے مغلوب ہو کر ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔

نظام الدین اور غالب کا دلی اجڑنے سے بال بال بچ گیا تھا۔

جس طرح دفاعی ڈھال نے دلی کو اجڑنے سے بچالیا بالکل اسی طرح دین اسلام کے نام پر بسائے جانے والے پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد کو بھی اس امریکی نظام نے بچالیا تھا۔ اسلام آباد کی طرف بڑھنے والے خوفناک ایٹمی میزائل نے اپنا رُخ پہاڑوں کی طرف موڑ لیا تھا۔ دفاعی ڈھال کے کنٹرول رُوم میں بیٹھے اہل کاروں کے تکبیر کے نعروں سے کنٹرول رُوم کے در و دیوار گونج اٹھے تھے۔ کنٹرول رُوم کے اہل کار ایک دوسرے سے گلے مل کر اسلام آباد کے بچ جانے پر مبارکباد دیتے ہوئے شدت جذبات سے رو پڑے تھے۔

ان ایٹمی حملوں نے صرف دونوں ملکوں کو ہی نہیں بلکہ اقوام عالم کو بھی لرزا دیا تھا۔ اقوام متحدہ نے فوری طور پر ایک مشترکہ قرارداد منظور کر ڈالی تھی، جس کے تحت ہندوستان و پاکستان کو تمام ایٹمی ہتھیاروں کو اقوام متحدہ کے حوالے کر کے اپنی تمام ایٹمی صلاحیتوں کو ختم کرنا تھا۔

اب ان دونوں ملکوں کے پاس اس قرارداد پر عمل کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔ دونوں ممالک پر چڑھا ہوا جنگی جنون جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔

(۳۶)

پاکستان کی طرف سے داغا گیا ایٹمی میزائیل دفاعی ڈھال کی وجہ سے گمراہ ہو کر دلی کے بجائے شمالی پہاڑی سلسلوں میں بھٹک کر دنیا کے سب سے بڑے غیر قطبی گلیشیر کے اوپر پہاڑی چٹانوں سے ٹکرا گیا تھا۔ اس گلیشیر کو ہندوستانی فوجیں کئی دہائیوں سے اپنی عمل داری میں لانے کی کوششوں میں مصروف تھیں جب کہ پاکستان، ہندوستانی فوج کو اس غیر آباد برفانی خطے پر مزید پیش قدمی سے روکنے میں مصروف تھا۔ اس محدود جنگ نے دُنیا کے سب سے اونچے اور سب سے بڑے گلیشیر کو اسلحہ کے ڈپو میں تبدیل کر دیا تھا۔ بھاری مشینوں کی نقل و حرکت سے اِس قدرتی خطے کو پہلے ہی بہت نقصان پہنچ چکا تھا۔

میزائل کے پہاڑ سے ٹکراتے ہی گلیشیر پر موجود ہندوستانی اور پاکستانی فوجیوں کے جسم پگھل گئے تھے۔ پاکستان کی طرف وادی گلگت اور اسکردو اور ہندوستان کی طرف لیہ اور لداخ میں زلزلہ کے جھٹکے محسوس ہوئے۔ دونوں طرف کے لوگوں نے مسجدوں میں زلزلے کے عذاب سے پناہ کے واسطے اذانیں دینا شروع کر دیں۔ لوگ چوپالوں میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ اسکردو شہر سے کافی اوپر پہاڑوں کے دامن میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں اکثر گھروں کی دیواریں گر پڑی تھیں۔ بہت سے لوگ ملبے کے نیچے دبے ہوئے تھے۔ گاؤں کے نوجوان لوگوں کو ملبے کے نیچے سے نکالنے میں مصروف تھے۔

ملبے کے نیچے سے نکلتے ہوئے ایک زخمی نے کہا:

''میں سوکھی ہوئی خوبانیوں کو چھت پر سے اکھٹا کرنے گیا تو میں نے پہاڑوں میں روشنی کا ایک بہت بڑا سا گولا دیکھا تھا، جیسے سورج پہاڑوں سے اُبھر رہا ہو''۔ ابھی یہ آدمی بات کر ہی رہا تھا کہ اسُے کھانسی کا دورہ پڑا اور اُس کی ناک اور کانوں سے خون بہنے لگا۔ کچھ نوجوان اُس زخمی کی مدد کرنے کو بڑھے لیکن یہاں موجود سب ہی لوگوں کو کھانسی آنے کے ساتھ ساتھ ان سب کی ناکوں سے خون بہنے لگا تھا۔ سب لوگ خون کی

الٹیاں کر کے بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

تبت میں لہاسہ سے کئی کلومیٹر دور کیلاش پہاڑ کے دامن میں بدھ بھکشوؤں کا ایک گروہ خانہ بدوشوں کے خیمے میں رات گزارنے کے لئے رُکا ہوا تھا۔ ان زائرین کے قیام سے اِس ہمالیائی خانہ بدوش کو گرمیوں کے موسم میں خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ خانہ بدوش نے اپنے مہمانوں کے لئے یاک کا گرم دودھ پیالوں میں ڈال کر بکری کا خشک گوشت ان کے سامنے رکھا۔ اُس کا خیمہ ایک ایسی جگہ نصب تھا جہاں سے چاندنی رات میں کیلاش کی چاندی سے ڈھکی ہوئی چوٹی صاف نظر آتی تھی۔ بدھ بھکشو اِس چوٹی کو خیمے سے دیکھتے ہوئے عبادات کر سکتے تھے۔ خانہ بدوش زائرین کی خاطر مدارت سے فارغ ہو کر بکریوں کو اکھٹا کرنے چلا گیا جو خیمے کے آس پاس چر رہی تھیں۔ اس نے بکریوں کو کھونٹوں سے باندھنے کے بعد اُن کو رات کی سردی سے بچاؤ کے کپڑے پہنا دیئے۔ اس کام سے فرصت پا کر وہ بکری کے بچوں کو ایک ایک کر کے مٹی کے بنے ہوئے تنوروں میں ڈالنے لگا تا کہ وہ رات کی سردی سے محفوظ رہ سکیں۔ ابھی وہ ایک ہی بچے کو تنور میں ڈال پایا تھا کہ ایک ہولناک دھماکہ ہوا۔

دیوی اور دیوتاؤں کے مسکن ''کیلاش'' پہاڑ کی چوٹی کو روشنی کے ایک بڑے سے ہالے نے اپنے احاطے میں لے لیا۔

وہ اِس معجزے کو دیکھ کر فوراً سجدے میں گر گیا۔

جب اس نے سجدے سے سر اٹھایا تو دیکھا کہ بکری کے بچوں کے اجسام سے گوشت پگھل کر گر رہا تھا۔

بھیڑ کی اون سے بنا ہوا اس کا خیمہ جل رہا تھا اور وہ چاہنے کے باوجود حرکت کرنے سے معذور تھا۔

اس کے حلق میں پیاس کی شدت سے کانٹے پڑ گئے تھے۔ اس کی بکریاں خون کی الٹیاں کرتے ہوئے زمین پر تڑپ رہی تھیں۔

اُسے بھی ایک خون کی الٹی آئی اور اس کی آنکھوں سے کیلاش کا نظارہ ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گیا۔

(۳۷)

خالد کو وڈیرے سے فون پر بات کرنے کے بعد اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔ اُس نے وڈیرے کے علاقے میں سرگرم عمل ساتھی کو وڈیرے کی حرکات وسکنات اور اس کے روزمرّہ کے معمولات کی تفصیلات فراہم کرنے کو کہا۔ مقامی ساتھی نے اسے دو دن میں ضروری تفصیلات فراہم کر دیں۔ ان تفصیلات کے مطابق وڈیرہ اب صرف ایک جاگیردار ہی نہیں رہا تھا بلکہ ایک شوگر مل اور جننگ فیکٹری لگا کر اپنی زمینوں کی پیداوار سے اور زیادہ کمائی کرنے لگا تھا۔ آج کل جننگ کے سیزن کی وجہ سے وہ روز صبح سات بجے اپنی لینڈ کروزر میں گاؤں سے جننگ فیکٹری جانے کے لئے روانہ ہو جاتا تھا۔ گاڑی عام طور پر وہ خود ہی چلاتا تھا۔ اُس کے محافظ گاڑی میں پیچھے بیٹھتے تھے۔ یہ معلومات خالد کے لئے کافی تھیں۔ وہ ان معلومات کے حاصل ہونے کے فوراً بعد اپنی گاڑی میں ضروری سامان لاد کر وڈیرے کے گاؤں کے قریب واقع ایک اور گاؤں کو جانے کے لئے نکل گیا۔ اس گاؤں میں اس کے جہادی ساتھی رہتے تھے۔ اُس نے ایک شب وہاں بسر کی اور صبح ہونے سے پہلے وڈیرے کے گاؤں سے کافی دور اپنی گاڑی پارک کر کے اپنا سفری تھیلا گلے میں لٹکائے گاؤں کے داخلی راستے کی طرف چل پڑا۔ گاؤں کے قرب و جوار میں کچھ نہیں بدلا تھا۔ سوائے اس کے کہ داخلی راستے کے دونوں اطراف درخت لگا دئے گئے تھے اور داخلی سڑک نیم پختہ ہو چکی تھے۔ یہ وہی راستہ تھا جس کی طرف آنا وڈیرے کے پشتینی غلاموں کے لئے ممنوع تھا۔ خالد نے ایک مناسب مقام دیکھ کر سڑک کے کنارے ایک طاقتور بم نصب کر دیا۔ بم نصب کرنے کی جگہ سے کچھ پہلے اس نے قریبی درختوں سے کچھ لکڑیاں کاٹ کر سڑک پر ڈال دیں۔ اس کارروائی کے بعد اس نے اپنے سفری بیگ سے دوربین نکالی اور گاؤں سے آنے والے رستے کی طرف دیکھنے لگا۔ صبح کے سات بج چکے تھے مگر وڈیرے کی لینڈ کروزر کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ دوربین سے کافی دیر تک دیکھنے کی وجہ سے اس آنکھیں دکھنے

لگی تھیں۔

اُس نے ایک بار پھر گاؤں کی طرف دیکھا۔ دور سے کچھ دھول اڑتی نظر آئی۔ کچھ غور کرنے کے بعد اس نے دیکھا کہ ایک بڑی سی گاڑی بہت تیز رفتاری سے گاؤں کی طرف سے آرہی تھی۔ یہ گاڑی سڑک پر بکھری ہوئی شاخوں کے پاس آکر رک گئی۔ ایک آدمی کلاشنکوف ہاتھ میں تھامے گاڑی سے اترا، اس نے ان شاخوں کو سڑک کے اطراف پھینک کر راستے کو صاف کیا۔ اس کاروائی کے بعد وہ آدمی گاڑی کے پچھلے حصے میں دوبارہ جا کر بیٹھ گیا۔ یہ گاڑی وڈیرے کی لینڈ کروزر ہی تھی۔ اس گاؤں میں کسی اور آدمی کے پاس گاڑی نہیں تھی۔ خالد ایک درخت کے پیچھے ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں پکڑے پیٹ کے بل لیٹ چکا تھا۔ اس کے پلان کے مطابق گاڑی رینگتی ہوئی سڑک کے کنارے نصب بم کے پاس سے گزری۔ خالد نے ریموٹ کا بٹن دبانے میں کوئی دیر نہ لگائی۔

ایک زوردار دھماکے سے وڈیرے کی گاڑی اُچھل کر کھیت میں جا گری۔ گاڑی میں آگ لگ گئی تھی۔

وڈیرے کا نچلا دھڑ ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔

جبکہ اوپر کا حصہ محافظین کے بدن کے چیتھڑوں سے مدغم ہو گیا تھا۔ زندگی میں یہ بے چارے وڈیرے کے قریب نہیں بیٹھ سکتے تھے لیکن موت نے ان کو وڈیرے سے ہم آغوش کر دیا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر خالد نے سجدے میں گر کر اللہ کا شکر کیا۔ اُس نے اپنے موبائل سے جلتی ہوئی گاڑی کی کچھ تصویریں کھینچیں اور گاؤں سے باہر کی طرف چل پڑا۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ اپنی گاڑی تک آیا اور اطمینان سے گاڑی کا رخ راجن پور کی طرف موڑ دیا۔ راستے میں خبروں کا وقت ہوا تو اُس نے ریڈیو آن کر دیا۔ انڈیا اور پاکستان بیجنگ میں امن کے معاہدے پر دستخط کرنے والے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں دونوں ممالک سے ایٹمی ہتھیاروں کی منتقلی کا عمل شروع ہونے والا تھا۔ جنوبی ایشیاء کو غیر ایٹمی خطہ قرار دے دیا گیا تھا۔ اِن سب خبروں کو سن کر بھی اسے غزوۂ ہند کی حدیث پر مکمل یقین تھا۔ اُسے یقین تھا کہ بالآخر پاکستان اور ہندوستان میں جنگ ہونی ہے اور اسلام کا جھنڈا لال قلعے پر لہرانا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان نے دارالحکومتوں کو تباہی سے بچ جانے پر ایٹمی حملے کے دن کو یومِ امن قرار دے دیا تھا۔ اب ہر سال امن کی تقریبات دونوں دارالحکومتوں میں ایک دن منائی جایا کریں گی۔ خالد نے مزید خبریں سنے بغیر ریڈیو کو بند کر دیا۔ اُسے امن کی ان آشاؤں سے شدید نفرت تھی۔

غزوۂ ہند کے خواب پر پانی پھر جانے کی وجہ سے وہ مایوسی سے گاڑی چلا رہا تھا۔امن کی اس خبر سے وڈیرے کے قتل کی خوشی ماند پڑ گئی تھی۔گاڑی چلاتے ہوئے اُسے اچانک بھوک ستانے لگی۔اُس نے راستے میں ہائی وے پر بنے ایک چھپر ہوٹل پر گاڑی روک لی۔وہ گاڑی سے نکل کر چھپر کے سائے میں بچھی ہوئی ایک چارپائی پر جا بیٹھا۔کچھ ہی دیر میں بیرا اُس سے آرڈر لینے آگیا۔اُس نے کڑاہی گوشت آرڈر کرنے کے ساتھ ہی بیرے کو کھانے کے فوراً بعد دودھ پتی چائے لانے کو بھی کہہ دیا۔اُسے کھانے کے لئے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

اُس کے سامنے بیرے نے تازہ تیار کردہ کڑھائی گوشت اور گرم گرم نان چارپائی پر لا کر رکھ دیئے تھے ۔ابھی اُس نے اِس خوشبو اُڑاتے ہوئے کھانے کا پہلا نوالہ ہی منہ میں رکھا تھا کہ اُس کی نظر ایک بچے پر پڑی جس کی عمر بہ مشکل بارہ یا تیرہ سال ہوگی۔یہ لڑکا کافی بدحال لگ رہا تھا۔اس کے پیر ننگے تھے۔وہ جس طرح سے کھانے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ بہت بھوکا تھا۔اس لڑکے میں خالد کو اپنے بچپن کی جھلک نظر آرہی تھی۔گاؤں سے فرار کے وقت وہ کم وبیش اس لڑکے کی ہی عمر کا تھا۔جب وہ ایسے ہی چھپر ہوٹل میں دور کھڑا کھانا کھاتے ہوئے لوگوں کو حسرت سے دیکھ رہا تھا۔وہ گھر سے بھاگ کر اتنا خوفزدہ تھا کہ اس میں کسی سے کھانا مانگنے کی ہمت بھی نہ تھی۔اس نے دور کھڑے اس سہمے ہوئے لڑکے کو اشارے سے پاس بلایا۔وہ لڑکا جھجکتے ہوئے اُس کے پاس آگیا۔

خالد نے اس لڑکے سے پوچھا:

''بھوک لگی ہے''؟۔

لڑکے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

خالد نے اسے کہا:

''آؤ چارپائی پر بیٹھ جاؤ!'' یہ کہہ خالد نے اپنا کھانا اس کی طرف سرکا دیا۔

اتنے میں بیرا دوڑتے ہوئے آیا اور اس نے لڑکے کو دھتکار کر وہاں سے بھاگ جانے کو کہا۔

خالد نے بیرے کو غصے سے دیکھ کر کہا:

''جب میں نے اس کو اپنے پاس بٹھایا ہے تو تُو کون ہوتا ہے اس کو بھگانے والا؟''۔

بیرا خالد کے تیور دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

خالد نے اُسے اور کھانا لانے کا آرڈر کیا۔

خالد نے لڑکے سے کہا:

''چلو! شاباش کھانا کھاؤ۔۔تم کو یہاں سے کوئی نہیں بھگا سکتا''۔

لڑکا یہ سنتے ہی کھانے پر ٹوٹ پڑا۔کھانا کھانے کے بعد وہ خالد کی طرف تشکر بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

خالد نے اس سے پوچھا:

''چائے پیو گے'؟۔

لڑکے نے جواب میں سر ہلا دیا۔

خالد نے بیرے سے لڑکے کے لئے بھی دودھ پتی چائے لانے کو کہا۔

بیرا فوراً ہی چائے لے آیا۔

خالد نے خود چینک سے لڑکے کے لئے پیالی میں چائے ڈال کر اس کے ہاتھ میں تھمانے کے بعد پوچھا:

''گھر سے بھاگ کر آئے ہو؟''۔

لڑکے نے پہلی بار لب کھولے۔کہا:

''ہاں!''۔

خالد نے پوچھا:

''کیوں بھاگے ہو؟''

لڑکے نے جواب میں کہا:

''ماں کے مرنے کے بعد باپ اور بھی زیادہ مارتا ہے''۔

خالد نے اُس سے پوچھا:

''بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟''۔

لڑکے نے جواب میں کہا:

''انڈیا''۔

خالد نے حیرانی سے پوچھا:

''وہاں کون ہے تمہارا؟''۔

لڑکے نے جواب میں کہا:

''سلمان خان''۔

خالد نے پوچھا:

''یہ کوئی رشتہ دار ہے تمہارا؟''۔

لڑکے نے جواب میں کہا:

''نہیں''۔

خالد نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا:

''پھر کون ہے وہ تمہار؟ا''۔

لڑکے نے کہا:

''وہ بہت مشہور ہے۔ فلموں میں کام کرتا ہے۔ بڑا دلیر ہے! دس آدمیوں کو اکیلے ہی مار دیتا ہے''۔ میں اُس سے فلموں میں کام کرنا سیکھوں گا''۔ خالد کے چہرے پر اس کی معصومانہ باتیں سن کر مسکراہٹ آگئی۔ اس کو ساتھ میں اس بات پر غصہ بھی آرہا تھا کہ ہندوستان مسلمانوں کی نوجوان نسل کو بگاڑ رہا ہے۔

خالد نے لڑکے سے پوچھا:

''تمہارا نام تو میں نے پوچھا ہی نہیں!۔ کیا نام ہے تمہارا؟''۔

لڑکے نے جواب میں کہا:

''بوٹا سلمان خان''۔

خالد نے کہا:

''تم اتنے چھوٹے سے ہو اور تمہارا نام اتنا لمبا؟''۔

لڑکے نے کہا:

''نام تو میرا بوٹا ہے پر میں خود کو سلمان خان ہی کہتا ہوں''

خالد نے اس کو سمجھانے والے انداز میں کہا:

''دیکھو! سلمان خان ایک دشمن مُلک ہندوستان میں رہتا ہے۔ وہاں تم بغیر پاسپورٹ اور ویزا کے نہیں جاسکتے۔ اتنی دور جانے کے لئے تم کو بہت سے روپوں کی ضرورت بھی ہوگی۔ اگر تم وہاں پہنچ بھی گئے تو تم فلموں میں کام کرنا کیسے سیکھو گے؟۔ یہ کام تو پڑھے لکھے لوگوں کا ہوتا ہے''۔

لڑکا خالد کے باتیں سن کر سوچ میں پڑ گیا۔

خالد نے اسے سوچ میں گم دیکھ کر کہا:

''تم میرے ساتھ چلو میں تم کو اسکول میں داخل کرا دوں گا۔ تم پڑھ لکھ کر جو چاہو بن جانا، لیکن تم کو اِس کے بدلے میری ماں کی خدمت کرنا ہوگی۔ وہ جلد ہی میرے پاس آنے والی ہے''۔ یہ بات کہتے ہوئے خالد کی آنکھوں میں ایک چمک سی آ گئی۔

لڑکے نے خالد کی بات کے جواب میں سر ہلا کر اس کے ساتھ جانے کی حامی بھر لی۔

خالد نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا:

''چلو پھر چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ''۔

بوٹا خالد کے پیچھے گاڑی کی طرف چل دیا۔

خالد نے گاڑی کا دروازہ کھول کر بوٹے کو سوار ہونے میں مدد دی۔

بوٹے نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا:

سلمان خان کے پاس بھی ایک فلم میں ایسی ہی گاڑی تھی''۔

بوٹے نے خالد کی ڈبل کیبن گاڑی کو دیکھ کر کہا۔

خالد نے سلمان خان کی کوئی فِلم نہیں دیکھی تھی۔ اس کو اپنے بچپن کی دیکھی ہوئی ایتابھ بچن کی فلموں کی کچھ جھلک یاد تھی۔

خالد نے گاڑی چلاتے ہوئے پوچھا:

''تمہارے گاؤں کا کیا نام ہے؟''۔

بوٹے نے جواب میں کہا:

''گوٹھ مری''۔بوٹے سے باتیں کر کے اس کا سفر اچھا کٹ رہا تھا۔اس لڑکے کی معصومانہ باتیں اسے اچھی لگ رہی تھیں۔

خالد نے اس سے پھر ایک سوال کیا:

''کیا تم مسلمان ہو؟''۔

''بوٹے نے جواب میں کہا:

''معلوم نہیں۔شاید میری ماں کو معلوم ہو پر وہ تو مر گئی ہے''۔

خالد نے دوسرا سوال کیا:

''کبھی تم مسجد نماز پڑھنے گئے ہو؟''۔

بوٹے نے کہا:

''نہیں''۔

خالد نے پوچھا:

''تمہارا باپ مسجد جاتا تھا؟''۔

بوٹے نے جواب میں کہا:

''نہیں،وہ صرف جوا کھیلنے اور بھٹے پر کام کرنے جاتا تھا''۔اس سے پہلے وہ بوٹے سے اور کوئی سوال پوچھتا،اس کے موبائل پر ایک مجاہد ساتھی کی کال آگئی۔

مجاہد ساتھی نے کہا:

''مبارک ہو!بم کے حملے میں کافر وڈیرہ جعفر شاہ مارا گیا''۔

خالد نے کہا:

خیر مبارک ہو!۔میں مصروف ہوں تم کو بعد میں فون کروں گا''۔

خالد کو افسوس ہوا کہ گاڑی میں وڈیرہ حیدر شاہ موجود نہیں تھا۔

پھراس نے خود کو تسلی دیتے ہوئے کہا:

''کوئی بات نہیں !اگراس نے میری ماں کو جلد از جلد نہ بھیجا تو اب اُس کی ہی باری ہوگی''۔

اسی دوران اس نے چائے کے ایک ڈھابے پر گاڑی روک کر پیسے جیب سے نکال کر بوٹے کو دیتے ہوئے کہا:

''تم جا کر وہاں سے چائے اور بسکٹ منگاؤ میں ابھی وہاں آتا ہوں''۔

بوٹے کے جانے کے بعد اُس نے وڈیرے کو فون کیا۔

وڈیرے نے فوراً ہی فون اٹھالیا۔

خالد نے اس سے کہا:

''تمہارا سابقہ غلام ساون بات کر رہا ہوں۔ میرا نشانہ تو تم تھے پر بچ گئے۔۔۔ خیر! کب تک بچو گے؟''

وڈیرے نے شکست خوردہ آواز میں کہا:

''بابا تم چاہتے کیا ہو آخر؟''۔

خالد نے سپاٹ لہجے میں کہا:

''کل تک میری ماں ایک کروڑ روپوں سمیت دارالعلوم راجن پور میں پہنچ جانی چاہیے۔ روپوں کی گڈیاں کھلی ہونی چاہیں۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم کو نشانہ بنانے سے پہلے میں تمہاری حویلی کو خاندان سمیت جلادوں گا''۔

یہ کہہ کر خالد فون بند کر کے چائے پینے کے لئے گاڑی سے نکل کر ڈھابے کی طرف چل دیا۔

جس وقت خالد نے وڈیرے کو فون کیا وہ جائے وقوعہ پر علاقے کے ایس پی کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔

وڈیرے نے ایس پی سے کہا:

''اِس سانحے کا مجرم دارالعلوم راجن پور میں موجود ہے۔ اگر تم اس کو گرفتار کر کے پولیس مقابلے میں مرا دو تو میرا بلینک چیک حاضر ہے،

رقم خود بھر لینا''۔

ایس پی نے وڈیرے سے پوچھا:

''جناب! وہ آخر آپ کے پیچھے کیوں پڑا گیا ہے؟''۔

وڈیرے نے ایس پی کو جواب دیتے ہوئے کہا:

''وہ اپنی ماں کو میرے پاس سے لے جانا چاہتا ہے۔ وہ خود بھی اور اس کی ماں بھی میری قرض دار ہے''۔

نوجوان ایس پی ایک پڑھا لکھا افسر تھا جو خود اِن جاگیرداروں کو ناپسند کرتا تھا لیکن اُن کے سیاسی اثرورسوخ کی وجہ سے اُسے اکثر اُن کے ناجائز کاموں پر پردہ ڈالنا پڑتا تھا، لیکن وہ وڈیرے کی خاطر کسی غریب کی بددُعا لینے کو تیار نہ تھا۔

اُس نے وڈیرے کو کہا:

''سائیں! آپ سے ہمارے ڈی آئی جی صاحب کے پرانے تعلقات ہیں لیکن آپ جن لوگوں پر ہاتھ ڈالنے کا کہہ رہے ہیں وہ بڑی سرکار کے لوگ ہیں۔ یہ لوگ سایہ ہیں۔ پرچھائیں۔۔۔ پرچھائیوں کو نہ تو گرفتار کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی مارا جاسکتا ہے۔ آپ کو میرا مشورہ ہے کہ دے دلا کر اپنی جان چھڑائیں۔ ان لوگوں سے دشمنی نہ ہی رکھیں تو بہتر ہے''۔

وڈیرہ ایس پی کی بات سن کر خاموش ہوگیا۔

پولیس نے وڈیرے اور اس کے محافظین کی لاشوں کے ٹکڑے اکٹھا کر کے قانونی کاروائی کے لئے ہسپتال بھجوادیئے۔ لاش کی باقیات دو دن کے بعد کفن دفن کے لئے واپس ملیں گی۔ یہ بات ایس پی نے وڈیرے کو بتا کر واپس جانے کی اجازت لی اور اپنی سرکاری گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

راستے میں بازار میں رک کر خالد نے بوٹے کے لئے چپل اور نئے کپڑے خریدے۔ اس نے حجرے میں آکر کچھ طلباء کو صفائی کے کام پر لگا دیا۔ وہ حجرے کو ماں کے استقبال کے لئے تیار کر رہا تھا۔

اگلی صبح وڈیرے نے اپنے منشی کو ایک کروڑ روپے ایک تھیلے میں تیار رکھنے کو کہا۔ دوسرے ملازم سے اس نے بھاگ بھری کو حاضر کرنے کو

کہا۔

لمحے بھر میں بھاگ بھری اطاق پر سہمی کھڑی تھی۔

وڈیرے کے بلاوے کا مطلب ہوتا تھا کہ ملازم سے کوئی غلطی ہوئی ہے، اب وہ اس کے سامنے وڈیرے کے ملازموں سے پٹنے کے لئے تیار ہو جائے۔

وہ بے چاری وڈیرے کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

وڈیرے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''تیرا ساؤن زندہ ہے''۔

بھاگ بھری نے بے تابی سے پوچھا:

''کہاں ہے؟۔۔۔کیسا ہے؟''۔

یہ الفاظ کہہ کر اس نے دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا۔

وڈیرے نے کہا:

''رومت! چل گاڑی میں بیٹھ تجھے اس کے پاس لے جانا ہے''۔

یہ سنتے ہی وہ گاڑی کی طرف چل دی۔

ڈرائیور نے اسے محافظوں والے حصے میں بٹھا دیا۔ بھاگ بھری کے بیٹھنے سے پہلے ڈرائیور نے ایک چادر سیٹ پر بچھا دی تھی تا کہ ایک سیدزادے کی گاڑی اچھوت بھاگ بھری کے وجود سے ناپاک نہ ہو جائے ۔وڈیرے نے گاڑی روانہ ہونے سے پہلے خالد کو فون کر کے کہا کہ وہ دو سے چار گھنٹوں میں دارلعلوم میں پہنچ جائے گا۔

خالد وڈیرے کا فون سن کر خوشی سے جھوم اُٹھا۔اس نے دل میں سوچا کہ ماں کے آنے میں ابھی چار گھنٹے ہیں اور ابھی بہت سے کام کرنا ہیں۔ یہ سوچ کر اس نے بوٹے کو آواز دی:

''بوٹے! چل میرے ساتھ''۔

بوٹا اپنے ہاتھوں سے بال سنوارتا ہوا دوڑا آیا۔

خالد بوٹے کو ساتھ لئے بازار میں آ گیا۔وہ سب سے پہلے کرمو حلوائی کی دکان پر آیا اور کرمو حلوائی کو مخاطب کر کے کہا:

’’کرمو چاچا! تم دو گھنٹے میں سارے مدرسے کے طلباء کے لئے تازہ بالوشاہیاں تیار کر سکتے ہو؟‘‘۔

’’ہاں! ہاں! کیوں نہیں، بیٹا یہ دُکان تو چلتی ہی مدرسے کی وجہ سے ہے۔ بیٹا! تازہ قلاقند بھی بنا دوں قاری صاحب کے لئے؟‘‘۔

خالد نے دل میں سوچا:

’’قاری صاحب تو ہیں نہیں، پر ماں کو شاید یہ مٹھائی اچھی لگے۔ اُس نے کبھی برفی اور قلاقند کی شکل تک نہ دیکھی ہوگی‘‘۔

یہ سوچ کر خالد نے حلوائی کو کہا:

’’ہاں چاچا! ایسا کرو تھوڑی تھوڑی ہر طرح کی مٹھائی الگ سے ایک ٹوکرے میں تیار کر کے پیک کر دینا۔ایک خاص مہمان کو پیش کرنا ہے۔ کرمو حلوائی اکثر مٹھائی کا ٹوکرا قاری صاحب کے خاص مہمانوں کے لئے تیار کرتا تھا۔ مٹھائی کا آرڈر دینے کے بعد وہ کپڑوں کی دوکان میں گیا وہاں اس نے اپنے اور ماں کے لئے نئے کپڑے خریدے۔ بوٹے کو مزید ایک اور جوڑا کپڑوں کا دلوایا۔

اب یہ دونوں حجام کی دکان میں گھس گئے۔دکانُ میں اس وقت کوئی اور گاہک نہیں تھا۔

حجام نے اس کو کرسی پر بٹھا کر پوچھا:

’’صاحب! کیسے بال کاٹوں؟‘‘۔

بوٹے نے بیچ میں ٹانگ اڑاتے ہوئے کہا:

’’سلمان خان جیسے‘‘۔

حجام نے کہا:

’’صاحب میں بہت اچھا سلمان خان کٹ بناتا ہوں‘‘۔

خالد نے بوٹے سے پوچھا:

’’یہ سلمان خان ہے کون بلا کہ ہر کوئی اس کو جانتا ہے؟‘‘۔

حجام نے دُکان کی دیوار پر آویزاں ایک پوسٹر کی طرف اشارہ کر کے کہا:

’’صاحب! دیکھیں یہ ہے سلمان خان‘‘۔

پوسٹر میں سلمان خان ایک ہیروئین کے ساتھ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے کھڑا تھا۔ پوسٹر دیکھ کر خالد کی ہنسی چھوٹ گئی۔

خالد نے حجام سے کہا:

''بس! بس بھائی تم میرے بال ذرا چھوٹے کردو پر اِس بوٹے کے سلمان خان جیسے بنا دینا۔۔۔۔اور ہاں ذرا میری داڑھی بھی تراش دینا'' خالد سوچنے لگا:

''اگر اس کا کوئی چھوٹا بھائی ہوتا تو شاید بوٹے جیسا ہی ہوتا۔ خالد نے حجام کو داڑھی نا مونڈنے کی تلقین کی اور بال کٹوانے کے بعد وہ دونوں مدرسے میں آ گئے۔

خالد اور بوٗٹا غسل کرنے کے بعد نئے کپڑے پہن کر ماں کے استقبال کے لئے تیار ہو چکےُ تھے۔ مدرسے کے صدر دروازے پر طلباء کو وڈیرے کے آنے کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ خالد نے قاری صاحب کے محافظوں کو خاص طور سے سمجھایا تھا کہ ڈیرے کو کلاشنکوفوں کے سائے میں اس کے حجرے تک پہنچایا جائے۔

کچھ وقت ہی گزرا تھا کہ ایک طالب عالم دوڑتا ہوا آیا، اس نے کہا:

''آپ کے مہمان آ چکے ہیں''۔

وڈیرے کے ساتھ منشی تھا، جس نے روپوں سے بھرا ہو تھیلا اٹھا رکھا تھا۔ وڈیرے کے محافظ لینڈ کروزر میں ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ قاری صاحب کے محافظین کلاشنکوف کندھے پر لٹکائے وڈیرے کے پاس آئے اور اس سے کہا:

''کمانڈر صاحب نے آپ کو اکیلے میں اپنی ماں کے ساتھ آنے کی دعوت دی ہے۔۔۔۔ان کی ماں کہاں ہیں؟''۔

وڈیرے نے کہا:

''وہ گاڑی میں موجود ہیں''۔

وڈیرے نے منشی سے کہا:

جا! بھاگ بھری کو لے آ!۔

منشی جلدی سے بھاگ بھری کو لے آیا۔

منشی کے پیچھے گھاگرا چولی پہنے ایک عورت چل رہی تھی جس کے بال بکھرے ہوئے اور پاؤں ننگے تھے۔

محافظ نے وڈیرے کو کہا:

''آپ لوگ عورتوں کو ایسے برہنہ سر اور برہنہ پیر لاتے ہیں؟''۔

یہ کہہ کر محافظ نے منشی کے کندھے پر پڑی اجرک اُتار کر بہت احترام سے بھاگ بھری کے سر پر ڈال دی۔

وڈیرے نے کہا:

''معاف کرنا بھائی!۔ یہ سب جلدی کی وجہ سے ہوا''۔

محافظ نے وڈیرے سے کہا:

''آپ کے ساتھ حجرے میں صرف ماں جا سکتی ہیں''۔

وڈیرے نے کہا:

بہت بہتر، یہ کہہ کر اس نے روپوں کا تھیلا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ محافظ نے وڈیرے کی حجرے تک پہنچنے میں رہنمائی کی۔ خالد حجرے کے دروازے پر ماں کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ وڈیرے کو وہ اُس کی مخصوص پگڑی کی وجہ سے پہچان گیا تھا۔

وہ کافی بوڑھا لگ رہا تھا۔ اس کی نوک دار مونچھوں کے سارے بال سفید ہو گئے تھے۔

اُس کے پیچھے بھاگ بھری کھڑی تھی۔

وڈیرہ خالد کو آگے بڑھتا دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا تاکہ وہ ماں سے مل سکے۔

خالد نے دیکھا کہ ماں کے بالوں میں چاندی چھا چکی تھی۔ وہ کافی کمزور لگ رہی تھی پر اس کا چہرہ ویسا ہی تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر کہا:

''ماں! میں ہوں خالد۔۔۔۔ تیرا بیٹا''۔

بھاگ بھری نے سہمے ہوئے لہجہ میں کہا:

''کون خالد؟، میرا بیٹا تو ساون ہے''۔

خالد نے جذبات سے لرزتی آواز میں کہا:

''ہاں! ماں میں ساون ہی ہوں۔۔۔۔ دُنیا مجھے خالد کہتی ہے''۔

بھاگ بھری نے اس کے سر اور چہرے پر ہاتھ پھیر کر کہا:

''تو اتنا جوان ہو گیا ہے!''۔ گھر سے ایسے گیا کہ ماں کو مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ وہ شکوے کرتی اور آنسو بہاتی اپنے لختِ جگر کے گلے لگ گئی۔

وڈیرے نے روپوں سے بھرا تھیلا خالد کو تھماتے ہوئے کہا:

''جو ہوا۔۔۔ اب وہ ماضی کا قصہ ہے۔۔۔ تمہاری ماں تمہارے پاس ہے۔۔۔ اب ہماری تمہاری کوئی دشمنی نہیں''۔

خالد نے رُوپوں کا تھیلا کھول کر دیکھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد ماں کو کہا:

''ماں! جھولی پھیلاؤ''۔

بھاگ بھری نے حیران ہوتے ہوئے اپنی پیوند زدہ جھولی کو پھیلا دیا۔

خالد۔ نے روپوں سے بھرا تھیلا ماں کی جھولی میں انڈیل دیا۔

روپوں سے جھولی اتنی بھر گئی کہ روپے بھاگ بھری کے قدموں میں گرنے لگے۔

خالد نے ماں سے کہا:

''ماں! تم نے جو اس وڈیرے کے لئے زندگی بھر مفت میں کام کیا ہے، یہ اُس کی اجرت ہے''۔

روپوں سے ماں کی جھولی بھرنے کے بعد خالد نے وڈیرے کی طرف دیکھ کر کہا:

''دشمنی ایسے ہی ختم نہیں ہو جاتی حیدر شاہ!۔ تم اپنی پگڑی اُتار کر ماں کے قدموں میں رکھ کر اپنی تمام زیادتیوں کی معافی مانگو اور ماں سے وعدہ کرو کہ تم گوٹھ واپس جا کر سارے غلاموں کو آزاد کر دو گے''۔

وڈیرہ خالد کے خوف سے بُری طرح سہم چکا تھا۔

اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ اس کے خوف اور غصے کی عکاسی کر رہے تھے۔

وڈیرے نے دل ہی دل میں سوچا:

ایک طرف اس کے بھائی کے جسم کے ٹکڑوں کو جوڑ کر کفن دفن کے قابل بنایا جا رہا ہے تو دوسری طرف یہ حرام زادہ مجھے ذلیل کر رہا ہے۔

ان حرام خور جرنلوں اور کور کمانڈروں کو اپنی شکار گاہ میں شکار کھلانے سے مجھے کیا ملا۔

اب میں اس ملک میں نہیں رہوں گا۔ سب کچھ بیچ کر انگلینڈ چلا جاؤں گا۔

اُس نے چار و نا چار اپنی پگڑی اُتار کر بھاگ بھری کے قدموں میں رکھی اور کہا:

''بھاگ بھری مجھ سے جو بھی زیادتی ہوئی اس کی معافی دے دے''۔

بھاگ بھری جو ابھی بھی وڈیرے سے ڈر رہی تھی۔ اپنے بیٹے کے پیچھے پناہ لیتی ہوئی گویا ہوئی:

''ٹھیک ہے میرا ساون مجھے مل گیا، اب تم جاؤ''۔

وڈیرہ جاتے ہوئے خالد سے ہاتھ ملانے کے لئے آگے بڑھا۔

خالد نے اسے روکتے ہوئے کہا:

''تم کافر ہو، میں تم سے ہاتھ نہیں ملا سکتا۔ میری ماں نے تم کو معاف کر دیا سو میں نے بھی کر دیا، اب تم جا سکتے ہو''۔

وڈیرے نے حجرے سے نکل جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ اُس کے حجرے سے نکلتے ہی بھاگ بھری بے ہوش ہو کر گر گئی۔

خالد نے بوٹے سے بھاگ کر پانی لانے کو کہا۔ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے منہ پر مارنے سے کچھ دیر میں بھاگ بھری کو ہوش آ گیا۔

ہوش میں آتے ہی بھاگ بھری نے خالد کی طرف ناقابل یقین نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا:

''تجھ غریب میں اتنی شکتی کہاں سے آ گئی میرے لال؟''۔

خالد نے کہا:

''ماں! غریبوں کا رکھوالا اوپر والا ہوتا ہے، اور وہ ہر فرعون کے لئے ایک موسیٰ بھی پیدا کرتا ہے''۔

بھاگ بھری اپنی توانائی بحال ہونے کے بعد اُٹھ کر بیٹھ گئی اور پھر خالد کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی

ہوئی بولی:

تو نے اتنی مُشکل باتیں کرنا کہاں سے سیکھ لیں؟''۔

خالد نے کہا:

''سمجھ لو! اوپر والے نے سکھادی ہیں''۔

ماں کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے خالد پھر ماں سے گویا ہوا اور اس نے کہا:

''ماں میرا نام اب ساون نہیں ۔۔۔ اب میرا نام خالد ہے، خالِد خراسانی ۔۔۔ قاری صاحب نے میرا نام بچپن میں ہی بدل دیا تھا''۔ اس کی ماں نے حیرت سے کہا:

''جب میں تجھ کو جن رہی تھی تو بارش رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ہماری کٹیا میں جا بجا پانی ٹپک رہا تھا۔ اس لیے تیری دائی نے کہا تھا کہ اس بچے کا نام ساون رکھنا یہ ساون کا تحفہ ہے۔ میں نے تجھ کو نو مہینے اپنی کوکھ میں رکھا، تجھ کو مزدوری کر کے پالا تو کوئی اور بھلا تیرا نام کیسے رکھ سکتا ہے؟''۔

خالد نے آسان الفاظ منتخب کرنے کے لئے کچھ توقف کیا اور پھر کہا:

''ماں! ساون ہندوانہ نام ہے، میں مسلمان ہوگیا ہوں''۔

بھاگ بھری خالد کی بات سن کر بے اختیار ہنس پڑی، اس نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کرنے کے بعد کہا:

''لو، جی! اب ساون بھادوں کا بھی دین دھرم سے ناطہ ہوگیا ہے، کل کلاں کو بہار کا بھی کوئی دھرم ہو جائے گا"۔

جس نے تیرا نام بدلا ہے اس بے وقوف سے پوچھنا کہ، کیا ساون کسی خاص دین دھرم کے ماننے والوں پر برسے ہے؟''۔

بھاگ بھری یہ کہہ کر چپ ہوگئی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ کہنے لگی:

"سن میری زبان سے یہ خالد نہ نکلے ہے۔۔۔ اس نام کو لینے سے میرے حلق میں خرخراہٹ جیسی آواز نکلتی ہے۔ دنیا کچھ بھی کہے پر میں تجھ کو ساون ہی کہوں گی۔

خالد نے ماں کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا:

''اچھا ماں تم جو چاہو کہنا''۔

بھاگ بھری یہ سن کر کسی بچے کی طرح خوش ہوگئی۔

اس نے ہنستے ہوئے کہا:

''یہ جو اتنے روپے زمین پر بکھرے ہوئے ہیں میں ان کا کیا کروں گی؟''۔

خالد نے مسکرا کر کہا:

''ماں جو دل چاہے کرنا۔ اِس پیسے سے اپنے لئے ایک اچھا سا مکان خریدنا۔ اس میں بوٹا اور میں تمہارے ساتھ رہیں گے''۔

بھاگ بھری نے کہا:

''اچھا ایک بات اور بتا''

خالد نے ماں کی بات کاٹتے ہوئے کہا:

''نہیں اب اور کوئی بات نہیں۔ تم نے کھانا نہیں کھایا ہوگا، تم نہا کر نئے کپڑے بدل لو میں تمہارے ملئے کھانے کا انتظام کرتا ہوں''۔

خالد ماں کا کھانا لانے کے لئے بذات خود مدرسے کے طعام خانے گیا اور کھانا لے کر آ گیا۔ دوسرے کمرے میں پہلے سے بچھے ہوئے دستر خوان پر اس نے سلیقے سے کھانا لگا دیا۔ ماں کی پلیٹ میں سالن ڈال کر اس نے اپنے ہاتھ سے اسے کھانا کھلانا شروع کیا۔ بھاگ بھری نے لقمے کو چباتے ہوئے کہا:

''بس اتنا پیار کافی ہے۔ چل اب اپنی پلیٹ میں سالن نکال۔ تو خود بھی بہت بھوکا ہوگا''۔

بچھڑے ہوئے اس بیٹے کی محبت نے اس کی روح پر لگے سارے زخم بھر دیئے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد بھاگ بھری نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا:

''مجھے اب تک سمجھ نہیں آیا کہ اتنا بڑا وڈیرہ تیرے قدموں میں کیسے جھک گیا؟، ایک اچھوت غلام کے قدموں میں؟''

خالد نے کہا:

''ماں اب میں نہ اچھوت ہوں اور نہ ہی غلام بلکہ ایک کمانڈر ہوں، جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کا

راستہ اختیار کیا ہے۔ جہاں تک بات ہے وڈیرے کے جھکنے کی۔ تو سن، لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ میں نے ہی وڈیرے جعفر شاہ کو مارا ہے۔ میرا نشانہ حیدر شاہ تھا پر وہ اُس دن گاڑی میں نہیں تھا''۔

''ہائے یہ تو نے کیا کر ڈالا میرے بچے؟''۔

خالد کو سمجھ نہیں آیا کہ ایک دشمن کے قتل کرنے پر اس کی ماں کیوں اس قدر غمزدہ ہوگئی تھی۔

اُس نے ماں سے حیرت زدہ لہجہ میں دریافت کیا:

''ماں ایک ظالم دشمن کے مرنے پر تم کیوں بین کر رہی ہو۔۔ اُس نے ہمیں غلام بنا کر رکھا ہوا تھا۔ اگر میں گاؤں سے بھاگا نہ ہوتا تو آج بھی اُس کے مویشی چرا رہا ہوتا''۔

بھاگ بھری نے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:

''بدنصیب تو نے اپنے باپ کو مار ڈالا ہے''۔

خالد نے حیرت سے کہا:

''کیا بکتی ہو ماں۔۔۔ وہ ظالم و کافر میرا باپ؟''۔

بھاگ بھری نے فوراً کہا:

''ہاں وہ ظالم تھا اور تو اس کے ظلم کے نتیجے میں ہی پیدا ہوا تھا۔۔ میں اس کی ہوس کا شکار ہوگئی تھی لیکن جب تو میری گود میں آیا تو میں دُنیا کا ہر غم بھول گئی تھی''۔

یہ سنتے ہی اس کے سر میں طوفان سے اٹھنے لگے۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ دنیا کو جلا کر راکھ کر دے۔ ابھی تک تو یہی تھا کہ وہ ایک ہندو ماں کا بیٹا ہے اور اب اوپر سے یہ کہ وہ ایک حرام زادہ بھی ہے۔ اسے یکا یک اپنے آپ سے گھن آنے لگی تھی۔ ان خیالات کے جھکڑوں کی وجہ سے بچھڑی ہوئی ماں سے ملنے کی خوشی ایک دم دھندلا سی گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اس صدمے کا غصہ اپنی ماں پر نکالتا؛ وہ ماں سے کچھ کہے بغیر حجرے سے نکل گیا۔

وہ مدرسے کے میدان میں جا کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے چہرے پر وقت کے جبر نے دہری کالک مل دی ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ جدّی پشتی مسلمان نہیں اور دوسری یہ کہ وہ ایک حرام زادہ ہے۔

خیالات کی رو میں بہتے ہوئے اس کے ذہن میں یہ خیال اُبھرا:

''کیا ایک حرام زادے کو لشکر اسلام کا کمانڈر رہنا زیب دیتا ہے؟''۔

''کیا اُسے اپنے اس مقام اور عہدے سے دستبردار نہیں ہو جانا چاہیے؟'' '' کیا اسے غزاسانی کے لقب کو واپس نہیں کر دینا چاہیے؟''

مدرسے کے ایک اُستاد اپنی بڑھتی ہوئی توند سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے میدان کے چکر لگا رہے تھے۔انہوں نے خالد کو یوں اکیلے سوچوں میں غلطاں بیٹھے ہوئے دیکھا تو اُس کی جانب چلے آئے۔

انہوں نے خالد کے پاس آ کر کہا:

''بیٹا اس وقت تنہا بیٹھے کس سوچ میں گم ہو؟ تمہاری ماں اتنے برسوں بعد تم سے ملی ہے! جاؤ بیٹا ان کی خدمت کرو۔ماں کے پیروں تلے جنت ہوتی ہے''۔

خالد کو اُستاد کے ان حوصلہ افزا کلمات سے کچھ ڈھارس ملی۔اس نے سوچا کہ استاد کو مدرسے میں مفتی کا درجہ حاصل ہے کیوں نہ ان سے اس بابت فتویٰ لے لیا جائے۔

یہ سوچ کر خالد نے اُستاد سے کہا:

''ایک اہم مسئلہ درپیش ہے اور اس ضمن میں آپ کی رائے کی ضرورت ہے''۔

استاد نے خالد کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا:

''ہاں بیٹا ضرور۔۔۔کہو کیا مسئلہ ہے'

یہ کہہ کر اُستاد بے تکلفی سے خالد کے برابر ہی بیٹھ گئے۔

خالد نے اُستاد سے آنکھیں ملائے بغیر کہا:

"یہ مسئلہ میرے اور آپ کے درمیان ہی رہنا چاہیے"

خالد نے اُستاد سے یقین دہانی چاہی۔

اُستاد نے فوراً کہا:

''ہاں، ہاں بیٹا رازداری کی فکر نہ کرو۔۔۔ایک مسلمان کا رمز رکھنا دوسرے مسلمان پر فرض ہے''۔

اُستاد کی بات سن کر خالد کی ہمت بندھ گئی تھی۔

خالد نے اُستاد سے کہا:

''ماں نے آج ہی بتایا ہے کہ میں زنا بالجبر کے نتیجے میں پیدا ہوا ہوں۔ وڈیرے کے بھائی نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ میں ایک حرام زادہ ہوں۔ کیا میرے حرام زادہ ہونے سے میرے مسلمان ہونے پر کوئی فرق تو نہیں پڑے گا''۔

اُستاد نے شفقت بھرے لہجے میں کہا:

''اللہ کی لعنت ہو ظالموں پر۔۔۔ بیٹا اِس میں تمہارا قصور نہیں ہے۔۔۔ اور ویسے بھی اللہ کے دین میں داخل ہونے کا راستہ تو ہے پَر واپس جانے کا نہیں۔۔۔ تم مسلمان ہو اور رہو گے''۔

خالد نے تشکر بھری نگاہوں سے استاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''آپ کے فتویٰ نے میرا دل ہلکا کر دیا ہے'' میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ یہ کہہ کر خالد نے گرم جوشی سے استاد کو گلے لگایا۔

استاد زیر لب مسکراتے ہوئے اپنے حجرے کے بجائے ملا سواتی کے حجرے کی طرف چل دیئے۔ وہ یہ خبر جلد از جلد ان کو دینا چاہتے تھے۔ یہ استاد بھی دیگر اساتذہ کی طرح خالد سے حاسد تھے۔ تمام اساتذہ چھوٹے چھوٹے حجروں میں رہتے تھے۔ ان تمام اساتذہ کی نظر میں خالد کو اساتذہ کے حجرے سے بڑا حجرہ عنایت کر کے قاری صاحب نے اُن کی تضحیک کی تھی۔

اُستاد نے ملا سواتی کے حجرے پر جا کر دستک دی۔

ایک نو عمر طالب علم نے دروازہ کھولا۔

اُستاد اندر آئے تو ملا سواتی گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھے، وہ نو عمر طالب علم دروازہ بند کر کے آیا اور ان کی ٹانگیں دبانے لگ گیا۔

اُستاد نے ملا سواتی کی طرف دیکھ کر کہا:

''ایک بہت اہم خبر ہے آپ کے لئے''۔

ملا جی نے طالب علم کو پرے ہٹنے کا اشارہ کر کے کہا:

''تم جا کر ایک چینک میں چائے لے آؤ''۔

طالب علم کے چلے جانے کے بعد ملا سواتی نے کہا:

''سنایئے کیا خاص خبر ہے''۔

استاد نے سرگوشی والے انداز میں کہا:

''قاری صاحب کے نور العین اور ہمارے جہادی کمانڈر خالد خراسانی ولدالزنا ہیں''۔

یہ سنتے ہی ملا سواتی کچھ اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد انہوں نے کہا:

''کیا یہ اطلاع مصدقہ ہے''۔

اُستاد نے کہا:

''خالد نے خود اس بارے میں مجھ سے زبانی فتویٰ لیا ہے''۔

یہ کہنے کے بعد اُستاد نے مزید کہا کہ کچھ بھی ہو خالد کے ایمان سے اس بات کا کوئی تعلق نہیں۔

ملا سواتی نے جواب میں اپنے ماتھے پر خالد کے ہاتھوں کندہ ہوئی صلیب کو سہلاتے ہوئے کہا:

'' خالد کے ایمان کا کوئی تعلق ہو نہ ہو لیکن اس کی ماں پر تو زنا کی حد جاری ہو سکتی ہے''۔

اُستاد نے کہا:

''لیکن اس کے ساتھ تو جبر ہوا تھا''۔

ملا سواتی نے کہا:

''جب بھی کوئی عورت زنا کاری میں پکڑی جائے تو وہ یہی کہتی ہے۔ خالد کی ماں کو شرعی قوانین کے مطابق ثابت کرنا ہوگا کہ زنا اس کی رضامندی کے بغیر ہوا تھا، اور اُسے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کو چار عاقل و بالغ اور صالح گواہان پیش کرنا ہوں گے جنھوں نے جنسی عمل ایسے دیکھا ہو جیسے سوئی کے ناکہ سے دھاگہ گزرتا ہو''۔

اُستاد نے سر ہلا کر ملا سواتی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا:

''تو پھر مدرسے کی شرعی عدالت کو چاہیے کہ خالد کی ماں کو طلب کر کے اُس سے باز پرس کی جائے''۔

ملا سواتی نے جواب میں کہا:

''آپ اس بات کا انتظام مجھ پر چھوڑ رکھیں۔کل صبح خالد کی ماں کو عدالت میں حاضری کا پیغام مل جائے گا''۔

ان دونوں اساتذہ کی باتوں کے درمیان طالب علم چائے لے کر آ گیا۔ملا سواتی نے اپنے ہاتھ سے چائے استاد کے لئے پیالی میں انڈیلی،ان کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

خالد اپنی ماں کو پا کر بہت خوش تھا جب وہ اسے گلے سے لگاتی تھی تو اسے ایسا لگتا تھا کہ جیسے اسے ایک انجانی طاقت نے اپنے حفاظتی حصار میں لے لیا ہو۔

اس کے دل میں قتال اور جنگ و جدال کا خیال تک نہیں آ رہا تھا۔حالاں کہ ماں کے ملنے سے پہلے اگر وہ کچھ روز تک کسی کا خون نہ بہائے تو وہ بے چین ہو جاتا تھا۔وہ ماں کے زانو پر اپنا سر رکھے ہوئے لیٹا تھا۔

اس نے سوچا:

''شاید محبت جنگ کی ضد ہے!جہاں الفت و محبت ہو وہاں جنگ جنم نہیں لیتی''

اس نے بوٹے سلمان خان کو بازار سے گرم گرم حلوہ پوری لینے بھیج دیا تھا۔بوٹا کچھ ہی دیر میں تازہ ناشتہ لے آیا۔بھاگ بھری نے زندگی میں پہلی بار حلوہ پوری کا ناشتہ کیا۔اسے یہ اتنا مزیدار لگا کہ خالد کو بوٹے کے لئے دوبارہ ناشتہ منگوانا پڑا۔بوٹا دوبارہ ناشتہ لینے چلا گیا۔اس کے جانے کے بعد کسی نے حجرے کے دروازے پر دستک دی۔خالد نے دروازے پر جا کر دیکھا۔وہاں مدرسے کا ایک طالب علم کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔خالد اس سے لفافہ لے کر اندر آ گیا۔اس نے لفافے سے پیغام نکال کر پڑھا۔

مدرسے کی شرعی عدالت کا پیغام تھا۔اس کی ماں کو بعد نماز عصر شرعی عدالت میں پیش ہونے کی ہدایت کی گئی تھی۔وہ یہ پیغام پڑھ کر فکر مند ہو گیا۔اس نے اڑتی اڑتی افواہ سنی تھی کہ بہت سے لوگوں کو اعتراض ہے کہ شاید ماں ہندو ہے تو وہ مدرسے میں کیسے رُک سکتی ہے!یہ مدرسے کی عظمت کے خلاف ہے کہ ایک ہندو عورت یہاں رہے۔

بھاگ بھری نے خالد کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر پوچھا:

''بیٹا خیر کی خبر ہے؟''۔

خالد نے کہا:

''ہاں ماں کچھ ایسا ہے کہ تم نہ سمجھ سکو گی!''

بھاگ بھری نے کہا:

''بیٹا تو مجھ کو بتا تو سہی میں سمجھنے کی کوشش تو کر سکتی ہوں''۔

خالد نے کہا:

''ماں میں جہادِ اسلام کا اہم رہنما ہوں''۔

بھاگ بھری نے پوچھا:

''بیٹا یہ جہاد ہوتا کیا ہے''۔

خالد نے ماں کو سمجھاتے ہوئے کہا:

''اللہ کے دشمنوں سے لڑنا اور ان کو قتل کرنا جہاد کہلاتا ہے''۔

بھاگ بھری نے خالد سے پوچھا:

''کیا اللہ کا بھی کوئی دشمن ہو سکتا ہے؟۔ اللہ نہ ہو گیا گاؤں کا وڈیرہ ہو گیا جس کے دشمن ہوتے تھے اور وہ ان کو اپنے بندوں کے ہاتھوں قتل کراتا تھا''۔

خالد نے ماں سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا اور بات کا موضوع بدلتے ہوئے کہا:

''دیکھو ماں شاید مجھے طعنہ ملنے والا ہے کہ تم ہندو ہو۔ اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو میری عزت ہو گی۔ کیا تم اپنے بیٹے کی خاطر مسلمان نہیں ہو سکتی؟''۔

بھاگ بھری نے کہا:

''میں تو اپنے بیٹے کے لئے جان بھی دے سکتی ہوں۔۔۔ دیکھ بیٹا میں مسلمان تو ہو جاؤں گی پر اپنا دھرم نہ چھوڑوں گی''۔

خالد نے کہا:

''بس ماں تم مسلمان ہو جاؤ۔ پھر جو دل چاہے کرنا''۔

میں نہیں چاہتا کہ مدرسے کی عدالت کہے کہ ایک اچھوت عورت میرے حجرے میں نہیں رہ سکتی''۔

خالد ماں کی طرف پیار سے دیکھ کر دوبارہ یوں گویا ہوا:

''اچھاماں !۔جو میں کہوں تم وہ دہراؤ۔اس طرح تم مسلمان ہو جاؤ گی''۔

یہ کہنے کے بعد خالد نے ماں سے کلمہ طیبہ کو آہستہ آہستہ دہرانے کو کہا۔اُس نے بہت مشکل سے عربی کے کلمات ادا کئے۔اس عمل کے مکمل ہونے کے بعد خالد نے ماں کو گلے لگا کر دین اسلام میں داخل ہونے کی مبارک باد دی۔

بھاگ بھری نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا:

''میں نے تیری بات مانی ہے اب تجھے بھی میری ایک بات ماننا ہو گی''۔

خالد نے حیرانی سے پوچھا:

''کونسی بات ماں؟''۔

ماں نے مسکراتے ہوئے کہا:''اب تجھے بیاہ کر لینا چاہیے تا کہ میں تیرے بچوں کے ساتھ کھیل سکوں''۔

خالد نے ہنستے ہوئے کہا:''جیسے تیری مرضی ماں تو جس سے بھی کہے گی میں بیاہ کرلوں گا''۔

ماں کے اسلام قبول کرنے کے بعد خالد کے دل کو مدرسے کی شرعی عدالت سے کوئی دھڑکا نہ رہا۔

(۳۹)

چینی اور امریکی سیارچے تبت کے ہمالائی پہاڑی سلسلوں میں ہونے والی تبدیلیوں پر نظر رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہاں سے موصول ہونے والی تصاویر میں دھند اور گہرے بادلوں کی وجہ سے ماہرین صورت حال کا صحیح تجزیہ کرنے سے معذور تھے۔ امریکی حکومت نے ایک نیا منصوبہ ترتیب دیا تھا، جس کے مطابق ڈرونز کو ایٹمی حملے کے وقوع پر نیچی پرواز پر بھیجنا تھا تا کہ صورتحال کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ سائنسدانوں کا اندازہ تھا کہ ان علاقوں میں موجود جھیلیں جلد ہی گلیشیرز کے پگھل جانے سے ابل جائیں گی، جس سے قیامت خیز سیلاب تباہی مچا سکتا ہے۔ علاقے کے تمام ممالک کو خبردار کیا گیا تھا کہ وہ دریائی راستوں پر رہنے والے شہریوں کو دریاؤں کے کنارے سے منتقل کر دیں۔ انڈیا، پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال، بھوٹان اور چین کے ذرائع ابلاغ اپنی معمول کی نشریات روک کر لوگوں کو خطرے سے آگاہ کر رہے تھے۔

حکومتوں نے ہنگامی بنیادوں طور پر آبی راستوں پر حفاظتی پشتوں کو مضبوط بنانا شروع کر دیا تھا۔ لوگ جنگ کے خوف کے بعد ایک نئے خوف کا شکار ہو گئے تھے۔

(۴۰)

خالد نے حسب معمول عصر کی نماز دارالعلوم کی مسجد میں باجماعت ادا کی۔ نماز کے بعد وہ اُستاد سے شرعی عدالت کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔

اُس نے استاد سے مصافحہ کرنے کے بعد دریافت کیا:

''جناب! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اچانک یہ شرعی عدالت کس سلسلے میں ہے؟ اور مقدمہ کیا ہے؟''۔

اُستاد نے جو کافی عجلت میں تھے ذرا بے رخی کے ساتھ یوں جواب دیا:

''آپ اپنی مادر گرامی کے ساتھ حضرت معاویہ ہال میں پہنچیں۔ تفصیل آپ کو عدالت میں ہی ملے گی''۔

یہ کہہ کر استاد تیزی سے مسجد سے نکل گئے۔ خالد بھی سرعت سے اپنے حجرے کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے وہاں پہنچتے ہی ماں کو تیار ہونے کے لئے کہا۔ بھاگ بھری نے نئے کپڑے پہنے جو خالد قریبی بازار سے اس کے لئے لایا تھا۔ اسے یہ شلوار قمیض پہن کر بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔

خالد نے ماں کو دیکھ کر کہا:

''چلو ماں! جلدی کرو دیر ہو رہی ہے''۔

بھاگ بھری فوراً دروازے کی طرف چل پڑی۔

خالد نے ماں کو یوں ننگے پاؤں جاتا دیکھا تو چیخ کر بولا:

''ماں یہ گاؤں نہیں کہ ننگے پاؤں چلے جا رہی ہو! چپلیں تو پہنو اور ہاں یہ مدرسہ ہے یہاں تم یوں ننگے سر باہر نہیں جا سکتی''۔

یہ کہہ کر اس نے ماں کے سر کو چادر سے ڈھانپ دیا۔

بھاگ بھری نے طوعاً و کرہاً چپلیں پہنیں۔ اُس کو چپل پہننے سے سخت کوفت ہوتی تھی۔ وہ خالد کے پیچھے چل پڑی۔ یہ لوگ کچھ دیر چل کر حضرت معاویہ ہال تک پہنچے۔ ہال کے باہر جوتوں کا انبار ظاہر کر رہا تھا کہ وہاں کافی افراد پہلے ہی سے موجود تھے۔

خالد اور بھاگ بھری جوتے اُتار کر ہال میں داخل ہوئے۔ ہال طلباء اور اساتذہ سے بھرا ہوا تھا۔ ہال کے آخری سرے پر دیوار کے ساتھ بچھے ہوئے افغانی قالین پر تین افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ درمیانی نشست پر ملا سواتی براجمان تھے۔ یہ شرعی عدالت کے قاضی تھے، جبکہ اُنکے دائیں اور بائیں بیٹھے ہوئے اساتذہ ان کے مشیر کی حیثیت سے وہاں موجود تھے۔

قاضی عدالت کے ایک مشیر نے خالد کو مخاطب کر کے کہا:

''آپ کی والدہ ہمارے دائیں جانب بیٹھ جائے اور آپ طلباء کے درمیان، یہ مقدمہ آپ سے متعلق نہیں تاہم آپ کو ضرورت پڑنے پر بولنے کا موقع دیا جائے گا''۔

خالد اگلی صف میں طلباء کے درمیان بیٹھ گیا۔ بھاگ بھری سہمی ہوئی آگے بڑھی اور قاضی صاحب کے دائیں جانب بیٹھ گئی۔

قاضی صاحب کے ایک مشیر عالمِ دین نے سورۃ المائدہ کی ایک آیت کی تلاوت کر کے کاروائی کا آغاز کیا اس آیت کا ترجمہ تھا کہ:

''اللہ انصاف کو پسند کرتا ہے''۔

قاضی شرع ملا سواتی نے عدالت کی کاروائی کا آغاز اِن الفاظ سے کیا:

''عدالت کو معلوم ہوا کہ ہمارے مجاہد ساتھی جناب "خالد خراسانی" ولد الزنا ہیں۔ شرعی عدالت کا یہ فرض ہے وہ غور کرے کہ کیوں نہ اُن کی والدہ ماجدہ پر شرعی حد جاری کی جائے تاکہ فرضِ اسلامی سے سبک دوش ہو کر اللہ کی رضا حاصل کی جا سکے''۔

اب میں جناب خالد خراسانی کی والدہ محترمہ سے اس ضمن میں کچھ سوالات کرنا چاہوں گا۔ عدالت کی تعارفی کارروائی کے یہ الفاظ سن کر خالد کے رگ و پے میں غصے سے خون کھولنے لگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ملا سواتی اپنی جنسی ہوس میں ناکامی کا بدلہ اتنے برسوں بعد اس طرح سے لے گا۔

تعارفی کلمات کے بعد قاضی شرع نے کہا:

''اب میں جناب خالد خراسانی کی والدہ سے کچھ سوالات کرنا چاہوں گا۔ اُن سے گزارش ہے کہ وہ عدالت کے روبرو کھڑی ہو جائیں''۔

بھاگ بھری اپنی جگہ پر بیٹھی رہی اُس کو قاضی کی اتنی مشکل گفتگو سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ایک عالم دین نے اُس کو مقامی زبان میں کھڑے ہونے کو کہا۔ وہ اُن کی بات سن کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ قاضی شرع نے مقامی زبان بولنے والے عالم دین سے عدالت کی کارروائی کو ترجمہ کرنے کی درخواست کی جو انہوں نے قبول کر لی۔

قاضی شرع نے بھاگ بھری سے پوچھا:

''ملزمہ آپ کا نام کیا ہے؟''۔

بھاگ بھری نے جواب میں کہا:

''کیا میں نے کسی کی بھینس چرائی ہے جو میں ملزمہ ٹھہری''۔

سب شرکا بھاگ بھری کا جواب سن کر ہنس پڑے۔

قاضی شرع نے رعب دار آواز میں کہا:

''صرف سوال کا جواب دیا جائے۔ آپ کا نام کیا ہے؟''۔

اُس نے جواب میں کہا:

''بھاگ بھری''۔

کیا فضول سا نام ہے۔۔ کفر کی بُو آتی ہے اس نام سے! کیا مطلب ہے اِس نام کا۔ یہ سوال ترجمان کی طرف دیکھتے ہوئے کیا گیا تھا۔

ترجمان نے کہا:

''جناب قاضی! بھاگ بھری کا مطلب ہے خوش بخت۔ اس علاقے میں یہ نام عام ہے''۔

قاضی صاحب نے بھاگ بھری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''مسماۃ بھاگ بھری آپ پر الزام ہے کہ آپ نے خالد کو زنا کے نتیجے میں پیدا کیا ہے؟''

بھاگ بھری نے جواب میں کہا:

''مولبی صاحب کو شاید معلوم نہیں کہ عورت مرد کے بنا بچہ پیدا نہیں کر سکتی''۔

خالد شرم اور بے عزتی کے مارے سر نہیں اٹھا پا رہا تھا۔

ملا سواتی ایک تیر سے دو شکار کر رہا تھا۔ وہ خالد کو بھی بے عزت کر رہا تھا اور اس کی ماں کو بھی۔

قاضی صاحب نے بھاگ بھری کا جواب سن کر کہا:

''تم عدالت کی توہین کر رہی ہو'' تم کو آخری موقع ہے جواب دینے کا۔ کیا تم نے شادی کیے بغیر اپنے بچے کو جنا تھا؟''۔

اس دفعہ قاضی صاحب نے اپنا سوال قدرے آسان زبان میں کیا تھا۔

بھاگ بھری نے نہایت غصے میں کہا:

''تم کو شرم نہیں آتی۔ تم ایک عورت پر اتنے لوگوں کے سامنے جھوٹا الزام لگا رہے ہو؟''۔

ملا سواتی نے ایک گرج دار لہجے میں کہا:

''مسماۃ بھاگ بھری، شرع بے شرم ہوتی ہے، آپ عدالت کو کھل کر بتائیں کہ آپ کے ساتھ کیا ہوا تھا''۔

بھاگ بھری نے کچھ اس طرح دو بدو جواب دیا:

''کیا تم اپنی بیٹی سے اس طرح بھری محفل میں یہ کہو گے کہ وہ اپنے اوپر ہونے والی زیادتی کی داستان سب کو سنائے۔ تم کو بھگوان نے علم تو دے دیا ہے پر تم سے شرم و حیا چھین لی ہے''۔

قاضی صاحب نے غصے سے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا:

''صرف سوال کا جواب دو۔ بتاؤ کیا ہوا تھا تمہارے ساتھ''۔

اب حالد کی برداشت جواب دے چکی تھی۔

اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا:

''مجھے کچھ کہنا ہے''۔

قاضی صاحب نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے کہا:

''اس وقت تم کو بولنے کی اجازت نہیں''۔

خالد لاچاری کے عالم میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

قاضی صاحب نے بھاگ بھری کو مخاطب کر کے کہا:

''مسماۃ بھاگ بھری آپ اپنی داستان بیان کریں ورنہ فیصلہ آپ کے خلاف بھی ہو سکتا ہے''۔

بھاگ بھری نے بھرآئی ہوئی آواز میں کہا:

''وڈیرے نے مجھے کام کے بہانے اصطبل میں بلایا تھا۔ اُس وقت وہاں کوئی اور نہیں تھا۔ اُس نے میرے سے زیادتی کی۔ وہ بہت طاقتور تھا اور میں بہت کمزور، وہ جیت گیا اور میں ہار گئی۔ اب تم بتاؤ اس میں میرا کیا قصور تھا''۔

قاضی صاحب نے یہ بات سن کر کہا:

''تم کو اپنی بات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے چار گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ ورنہ تمہاری بات سچ نہیں مانی جائے گی''۔

بھاگ بھری نے قاضی صاحب کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا:

''تمہارے خیال میں عورت کو ہر وقت چار گواہ ساتھ میں رکھنا چاہیے تاکہ جہاں ضرورت ہو پیش کئے جاسکیں''۔

قاضی صاحب نے جواب میں کہا:

''خاتون آپ صرف زنا کی ہی مرتکب نہیں ہوئی ہیں بلکہ آپ کو مذہب کا مذاق اڑانے کی سزا بھی ملنا چاہیے۔ میں بطور قاضی شرع حکم جاری کرتا ہوں کہ مسماۃ بھاگ بھری کو اس وقت تک سنگسار کیا جائے کہ جب تک اُس کی جان نہ نکل جائے۔ سنگساری کے عمل سے پہلے ان کو سو کوڑے مذہب کا مذاق اڑانے کے جرم میں مارے جائیں''۔

قاضی صاحب کا فیصلہ سن کر خالد اٹھ کھڑا ہوا۔

قریب موجود دو کلاشنکوف بردار محافظوں نے خالد کو زبردستی بٹھانے کی کوشش کی۔ قاضی صاحب نے محافظوں اور خالد میں ہونے والی کشمکش کو دیکھ کر کہا:

''اب جناب خالد خراسانی کو بولنے کی اجازت ہے''۔

خالد نے کچھ دیر خاموش رہ کر اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کی اور پھر اس طرح گویا ہوا:

''جناب قاضی صاحب! میری والدہ محترمہ ہندو تھیں انہوں نے آج ہی بعد نماز ظہر میرے ہاتھ پر دین حق قبول کیا ہے''۔

یہ جملہ سنتے ہی حاضرین میں جیسے کہ بجلی دوڑ گئی تھی۔ سب نے ایک آواز ہو کر "اسلام زندہ باد" کے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔

قاضی صاحب نے سب کو اشارے سے خاموش ہونے کو کہا اور پھر کہنے لگے:

''یہ بات تو عدالت کو معلوم ہی نہیں تھی کہ آپ کی والدہ گرامی مسلمان نہیں تھیں، عدالت یہ مقدمہ واپس لیتے ہوئے انہیں باعزت بری کرتی ہے''۔

یہ کہہ کر قاضی صاحب نے حیران و پریشان کھڑی بھاگ بھری کی طرف دیکھ کر کہا:

''محترمہ! آپ کو عدالت باعزت بری کرتی ہے آپ مسلمان ہونے کے ناطے ہماری بہن کی طرح ہیں''۔

بھاگ بھری نے جواب میں کہا:

''باعزت بری؟ میں کہتی ہوں کہ میری عزت داغ دار کرنے والا وڈیرہ تم لوگوں سے لاکھ درجہ بہتر تھا۔ کم از کم اس نے میری عزت سے اکیلے میں کھلواڑ کیا تھا، جبکہ تم لوگوں نے تو سینکڑوں لوگوں میں میری عزت تار تار کر ڈالی ہے۔ تم مذہب کے نام پر مجھے بہن کہنے کی کوشش نہ کرو، تمہاری زبان غلیظ اور تمہاری آنکھیں ہوس ناک ہیں، میں تمہارا مذہب تم کو واپس کرتی ہوں، میں اپنے دھرم میں ہی بھلی ہوں، تمہارا اسلام تم کو مبارک ہو''۔

بھاگ بھری کی اس بات نے سب پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔ ہال میں ایک سناٹا چھا گیا تھا، قاضی صاحب کی کھنکھار سے سناٹا ٹوٹا۔ کھنکھارنے کے بعد انہوں نے کہا:

''بھاگ بھری تم ارتداد کی مرتکب ہو رہی ہو۔ ذرا سوچ سمجھ کر قدم اٹھاؤ۔ اسلام میں آنے کا رستہ ہے لیکن جانے کا نہیں۔ تم مُرتدہ ہو چکی ہو۔ اگر تم نے تین دن کے اندر اندر اپنا فیصلہ نہ بدلا تو تم کو موت کی سزا

دے دی جائے گی''۔

بھاگ بھری نے غصے میں کہا: ''مولبی صاحب! آپ کے پاس موت کی دھمکیوں کے سوا بھی کچھ ہے یا نہیں؟''۔

قاضی عدالت نے انتہائی غصے سے جواب میں محافظین کو اشارہ کر کے کہا:

''لے جاؤ! اس بدنصیب کو۔ اسے تین دن تک ایک کمرے میں قید رکھو۔ اگر یہ اپنا فیصلہ نہ بدلے تو سزائے موت پر عمل درآمد کیا جائے''۔

ملا سواتی کا حکم سنتے ہی ایک محافظ آگے بڑھا اور وہ بھاگ بھری کو دھکیل کر ہال سے لے جانے کی کوشش کرنے لگا، خالد مجمع کو چیرتا پھاڑتا ہوا اپنی ماں کی جانب بڑھا تو اُس کو دوسرے محافظ نے اور لوگوں کی مدد سے قابو کر لیا۔

ایک اُستاد نے خالد کے قریب آ کر کہا:

''تم پر کوئی الزام نہیں لیکن تم فی الحال حفاظتی حراست میں رہو گے''۔

خالد نے کہا:

''یہ سب کچھ قاری صاحب کی مرضی کے برخلاف ہو رہا ہے۔ اُن کو اس بات کا علم بھی نہیں۔ میری قاری صاحب سے بات کروائی جائے''۔

اُستاد نے خالد کو جواب دیتے ہوئے کہا:

''بیٹا، ملا سواتی کو قاری صاحب کی عدم موجودگی میں تمام فیصلے کرنے کا پورا اختیار ہے''۔

یہ کہہ کر اُستاد ہال سے باہر نکل گئے۔ اتنے سالوں کے بعد ملا سواتی خالد سے اپنا بدلہ لینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ خالد اور اُس کی ماں کو الگ الگ کمروں میں قید کر دیا گیا تھا۔

(۴۱)

ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور چین کے کچھ علاقوں میں بہنے والے دریاؤں میں تلاطم برپا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ دوسرے دریاؤں کی طرح سندھو دریا نے بھی اپنا غیض و غضب دکھانا شروع کر دیا تھا۔ مٹی کی بھرائی سے تعمیر کیے جانے والا دُنیا کا سب سے بڑا ڈیم تاریخ کے سب سے بڑے ریلے سے نبرد آزما ہونے والا تھا۔ سیاچن گلیشیر سے نکل کر آنے والا دریائے نوبرا، اور شیوک میں گولہ بارود کی ایک بڑی تعداد بہتے ہوئے دریائے سندھ میں داخل ہو گئی تھی۔ اس صدیوں پرانے دریا کے پانی میں جا بجا توپوں کے گولے اور میزائل بہتے ہوئے تربیلا ڈیم کی جانب بڑھ رہے تھے۔ یہ بہتے ہوئے ہتھیار آخر کار پانی کی سرکش لہروں کے ساتھ ڈیم کی سرنگ میں داخل ہو کر دیوہیکل ٹربائینوں سے ٹکرانے لگے۔

اِس بہہ کر آنے والے گولہ بارود کے زوردار دھماکوں نے دیکھتے ہی دیکھتے بجلی پیدا کرنے کے سارے نظام کو تباہ کر ڈالا۔ ملک کی چالیس فیصد بجلی کی پیداوار یکا یک ختم ہو گئی تھی، پاکستان کے ایک بڑے حصے پر ظلمت نے ضیاء کی جگہ لے لی تھی۔ ڈیم سے ملحقہ اسٹاف کالونی پہلے ہی خالی کرائی جا چکی تھی۔ ڈیم کے اُوپر پاکستان آرمی کے ہیلی کاپٹر پرواز کر کے سیلاب کا جائزہ لے رہے تھے۔ ڈیم کے پشتوں پر پانی کا دباؤ ہر گزرنے والے سیکنڈ کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔

آخر کار ڈیم کے پشتوں نے سندھو دریا کے غیض و غضب کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ ڈیم آہستہ آہستہ زمین بوس ہونا شروع ہو گیا تھا، دریائے سندھ نے اپنا رُخ موڑ کر دوبارہ پہلے والے راستے سے بہنا شروع کر دیا تھا۔

اسی صورتحال کا سامنا منگلا ڈیم کو بھی تھا، کشمیر سے آنے والے دریائے جہلم نے شاید اپنی تاریخ میں اتنا پانی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ دریائی سیلاب ہندوستانی کشمیر میں ڈیمز اور پلوں کو تاراج کرتا ہوا منگلا ڈیم سے جا ٹکرایا تھا۔ ڈیم کی تعمیرات دریا کی سرکشی کے آگے مٹی کے گھروندوں کی طرح ڈھے گئی تھیں۔

(۴۲)

خالد کو ایک محافظ نے بہت عزت و احترام کے ساتھ حجرے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا:

''آپ ہمارے لئے عظیم اور مشعل راہ ہیں، لیکن ہمیں پہلا درس امیر کی اطاعت کرنے کا دیا گیا ہے۔ آپ ناراحت نہ ہوں، اس حکم میں یقیناً کوئی حکمت ہوگی''۔

یہ کہہ کر محافظ نے خالد کو اس کے حجرے میں دھکیل کر دروازے کے باہر سے مقفل کر دیا۔ اس غیر متوقع صورت حال نے اُسے بدحواس کر دیا تھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، اس نے سر نہوڑا کر اپنے گھٹنوں میں دے دیا گویا کہ اُس نے اپنی شکست تسلیم کر لی ہو! وہ گھٹنوں میں سر دیئے اِس صورتحال غور کر رہا تھا کہ کرُتے کی جیب میں موجود موبائل فون سے ہلکی سی بیپ سنائی دی جو اس بات کی علامت تھی کہ فون کی بیٹری ختم ہونے کے قریب ہے۔ موبائل فون کی آواز نے اُس میں زندگی کی ایک لہر دوڑا دی۔ شاید اس کی قسمت اچھی تھی یا محافظوں پر اُس کے منصب کا رعب کہ انہوں نے اُس کی تلاشی نہیں لی تھی۔ وہ اِس فون کے ذریعے قاری صاحب سے یا دوسرے جہادی ساتھیوں سے مدد مانگ سکتا تھا، اس نے فون کو جیب سے نکال کر فوراً بند کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ محافظ کھانا دینے ضرور آئیں گے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان کا دھیان موبائل فون کی طرف جائے۔

اس کی توقع کے عین مطابق عشاء کی نماز کے بعد دو مسلح محافظ اس کے لئے کھانا لے آئے۔

خالد نے ایک محافظ سے کہا:

''اُسامہ تم کو معلوم ہے کہ مجھے کسی قصور کے بغیر قید کرنے کا حکم صادر کیا گیا ہے''

اُسامہ نے کہا:

''جی! آپ نے بجا فرمایا ہے۔ اسی لئے ہم سب آپ کی دل سے عزت کرتے ہیں، ملا سواتی قاری

صاحب کی عدم موجودگی میں ہمارے امیر ہیں، ان کا حکم بجالانا ہماری شرعی ذمہ داری ہے، انہوں نے خاص تاکید کی ہے آپ سے فی الحال کوئی بات چیت نہ کی جائے"۔

یہ کہہ کر دونوں محافظ کھانا رکھ کر چلے گئے۔

خالد نے دل میں سوچا:

"اے میرے اللہ! میں نے اپنا ایک ایک پل تیرے دین کی سربلندی میں گزارا ہے، مجھے یہ کیسی سزا ملی ہے کہ میں اپنے حجرے میں ہی قیدی بنا دیا گیا ہوں۔

اے مجاہدین پر اپنا فضل کرنے والے! میں اپنی ماں کے ساتھ چار دن بھی خوشی کے نہیں گزار پایا ہوں۔

یا اللہ! میری مدد کر اور لوگوں کے دلوں کو میرے حق نرم کر دے!۔

اے میرے اللہ! میری ماں کو توفیق دے کہ وہ دین حق پر دوبارہ لوٹ آئے"۔

یہ دعا مانگتے ہوئے اُس کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی۔ وہ دُعا مانگ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور عشاء کی نماز کے لئے وضو کرنے غسل خانے کی طرف چلا گیا۔ وضو کرنے سے اسے ایک طمانیت کا احساس ہوا۔ اُس نے بڑے اطمینان سے یہ سوچ کر نماز کی نیت باندھی کہ اللہ نے اُسے بڑے سے بڑے امتحان میں کامیاب کیا ہے تو وہ اب بھی غیب سے کوئی نہ کوئی امداد ضرور بھیجے گا۔

نماز پڑھنے سے اس کی طبیعت میں ٹھہراؤ آ گیا۔ اُس نے اپنے موبائل کو چارجر سے منسلک کیا اور مختلف نمبرز کو ملانے کی کوشش کرنے لگا، عجیب بات تھی کہ موبائل کا کنکشن کسی بھی فون سے نہیں مل رہا تھا، آخر کار اُس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں، اس نے نیند کے غلبے کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

صبح فجر کے وقت اس کی آنکھ کھلی، اس نے اپنے معمول کے مطابق وضو کر کے نماز کی نیت باندھ لی۔ جب وہ نماز پڑھ رہا تھا تو اسے حجرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی، وہ بدستور نیت باندھے نماز پڑھتا رہا۔ اس نے سلام پھیرنے کے بعد دیکھا کہ محافظین ایک ٹرے میں ناشتہ رکھ کر جا چکے تھے۔ جنریٹر چلنے کی مانوس آواز سے معلوم ہوتا تھا بجلی جا چکی ہے، مدرسے کا دیو ہیکل امریکن جنریٹر بجلی جانے پر خود بخود چل پڑتا تھا، مدرسے میں کسی کو بجلی نہ ہونے پر زحمت نہ اٹھانا پڑتی تھی۔ ناشتہ کرتے ہوئے اس نے موبائل فون پر مقامی ریڈیو سننے کی کوشش کی۔ مختلف اسٹیشن بدلنے پر اسے مقامی خبریں سننے میں کامیابی ہوگئی۔ ریڈیو سے بار بار دریا کے

کنارے پر رہنے والوں کو کناروں سے دور منتقل ہونے کی ہدایت دی جا رہی تھی۔ سیلابی ریلا ملک کے بالائی حصے کو اپنی لپیٹ میں لینے کے بعد نچلے علاقوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مدرسہ دریا سے کافی دور اور اُونچائی پر واقع تھا۔ یہ سوچ کر اس نے خبروں پر مزید کوئی دھیان نہ دیا، فون پر گھنٹی بجنے سے ریڈیو خود بخود بند ہو گیا۔ اس نے فون پر حسب معمول سلام کرنے میں پہل کرنے کے بعد ہیلو کہا، دوسری طرف سے قاری صاحب کی مانوس آواز تھی۔ اس سے پہلے کہ خالد انہیں صورتحال سے آگاہ کرتا وہ یوں گویا ہوئے:

''بیٹا مجھے معلوم ہے کہ تم اس وقت بد بخت ملا سواتی کی قید میں ہو۔ اُس نے مجھ سے دھوکہ کیا ہے اور میری بیعت سے مکر گیا ہے، غور سے سنو!۔۔۔ ملا عمیر ایران سے مل گیا ہے۔ اس نے جہاد کا رستہ ترک کر دیا ہے۔ اس لئے میں نے اُس کی بیعت سے ہاتھ اٹھا کر خلیفہ بغدادی کی بیعت کر لی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے کہ:

''جب تم خراسان کی طرف سے کالے جھنڈے والوں کا ظہور دیکھو تو اُن کی طرف لپک جاؤ چاہے تمہیں برف سے ہی کیوں نہ گزرنا پڑے''۔

میرے بیٹے اب ہماری جنگ پہلے منافقوں سے ہوگی اس کے بعد ہم کفار سے نمٹیں گے۔ اللہ کو منظور ہوا تو ملا سواتی کا سر تمہارے ہاتھوں ہی سے کٹے گا۔ بیٹا! ہم یہ سمجھتے رہے تھے کہ پاکستان کی آرمی غزوۂ ہند میں مجاہدوں کی پشت پناہی کرے گی، لیکن افسوس! انہوں نے ہمارے سروں پر ڈالرز کے انبار اکھٹے کرنے کے سوا کچھ نہ کیا۔ اب غزوۂ ہند خلیفہ مسلمین کی رہبری میں برپا ہوگا۔ تم کو کچھ مجاہدین آزاد کرانے کے لئے آنے والے ہیں۔ تم فوری طور پر ان کے ساتھ اسلام آباد کے نواح، ٹیکسلا کی طرف پہنچنا۔ باقی تفصیلات تم کو وہاں پر ملیں گی، افغانستان ہم سب کی منزل ہوگی۔ میرے بیٹے تم کو خراسانی کا لقب یوں ہی نہیں دیا گیا۔ تم ہند سے لیکر خراسان تک کالے جھنڈوں کو لہراؤ گے۔

خالد نے جواب میں نہایت عقیدت سے کہا:

''امیر کا حکم سر آنکھوں پر''۔

قاری صاحب نے اللہ نگہبان کہہ کر فون بند کر دیا۔

(۴۳)

خالد کو حجرے میں قید ہوئے تیسرا دن مکمل ہونے کو تھا۔ اسے اپنی ماں کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اسے ماں کی خدمت کرنے کو چار دن ہی مل پائے تھے کہ اُسے پریشانیوں نے گھیر لیا تھا۔ اُسے سلمان خان کا بھی کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ کس حال میں ہوگا۔ اُسے بوٹے سلمان خان کو سکول میں داخل کروانے کا وعدہ یاد آ رہا تھا۔ اس کے جسم میں پھر وہی بے چینی جنم لے رہی تھی جو صرف خون بہانے سے ہی ختم ہوتی تھی چاہے خون اِس کا اپنا ہی کیوں نہ ہو۔ فجر کی اذان نے اس کے خیالات کی رو کو مزید بھٹکنے سے روک دیا۔ وہ وضو کر کے مصلّے پر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے نماز کے بعد اپنے قلبی سکون اور ماں کی حفاظت کے لئے گڑگڑا کر دعا مانگی۔ نماز پڑھنے سے بھی اس کی اندرونی بے قراری میں کوئی کمی نہیں آ رہی تھی۔ قاری صاحب کی جانب سے آنے والی مجاہدین کی کمک کا دور دور تک کوئی نشان نہ تھا۔ اُس نے سوچا کہ پہلے اپنی بے قراری کا علاج کیا جائے تا کہ ذہن سوچنے کے قابل ہو سکے۔ یہ سوچنے کے بعد اس نے کتابوں کی الماری میں سے اپنا روسی خنجر نکالا تا کہ وہ اپنے جسم پر زخم لگا کر اپنے گرم لہو کو چہرے پر مل کر طمانیت کا احساس حاصل کر سکے۔ اس نے خنجر نکالنے کے لئے کتابوں کی الماری کا پٹ کھولا ہی تھا کہ اسے حجرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ کاندھے پر کلاشنکوفیں لٹکائے ہوئے محافظین حجرے کے اندر آ چکے تھے۔ اس بار اِن کے ساتھ ملا سواتی بھی تھے۔

ملا سواتی نے خالد کی طرف سرد نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا:

”جناب کمانڈر صاحب! (یہ کہتے ہوئے اُن کے لہجے میں طنز نمایاں تھا) شرعی عدالت نے فقہ اسلامی کے مطابق آپ کی والدہ گرامی کو تین دن کی مہلت دی تھی کہ وہ دین حق کی جانب پلٹ آئیں لیکن افسوس صد افسوس، اُن کے حواس اور اُن کی روح پر شیطانِ ملعون غلبہ پا چکا ہے، اب اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ قانون اسلامی کا نفاذ کر کے ان پر غالب شیطان کو شکست سے ہم کنار کر دیا جائے“۔

خالد کو ملا سواتی کی بات سمجھ میں آچکی تھی کہ اس کی ماں کا محضر نامہ تیار ہو چکا ہے اور محضر نامہ پر ملا سواتی کی ہی مہر ثبت ہے۔ اس کی آنکھوں میں ملا سواتی کو دیکھ کر خون اتر آیا تھا اور اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ ایک تربیت یافتہ کمانڈو کی طرح اس کا ذھن بحران میں زیادہ تیزی سے کام کرتا تھا، اس نے تحمل کے ساتھ صورتحال کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

ملا سواتی نے خالد کو خاموش دیکھ کر کہا:

''جب سرزمین عرب پر اسلام کا سورج طلوع ہوا تو بہت سے خانوادے ایسے تھے کہ جن میں کچھ افراد مسلم اور کچھ مشرک و کافر ہوا کرتے تھے، بعض جنگوں میں مسلم مجاہد کے سامنے کافر بھائی اور مسلمان چچا کے سامنے کافر بھتیجا ہوا کرتا تھا۔ کچھ ہی دیر میں آپ کی مادر گرامی کو ارتداد کے جرم میں موت کی سزا دی جاتی ہے ۔آپ اپنے ہاتھوں سے اِس مرتدہ ماں پر گولی چلا کر دیگر مجاہدین کو دکھا دیں کہ آپ کا ہاتھ اِس مرحلے پر نہیں کانپے گا۔ آپ دنیا کو دکھا دیں کہ دین حق کے سامنے دنیاوی رشتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی''۔

خالد صورت حال کو اچھی طرح سے بھانپ گیا تھا۔

اس نے ملا سواتی سے نظریں ملاتے ہوئے کہا:

''دین حق پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔ جیسے آپ کا حکم''۔

یہ کہہ کر وہ سوچنے لگا کہ اس نے ناحق ماں کو اسلام قبول کرنے کے لئے دباؤ ڈال دیا تھا حالاں کہ اگر وہ ہندو رہتی تب بھی اُس کے ماں ہونے کے رُتبے میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

ملا سواتی کو خالد سے مثبت جواب کی امید نہ تھی۔

اس نے خالد کا جواب سننے کے بعد کہا:

''اللہ آپ پر اپنی رحمت کرے کمانڈر صاحب، آئیں میدان کی طرف تشریف لے چلیں جہاں موت کی سزا پر عمل درآمد ہونا ہے۔ وہاں پر طلباء و مجاہدین حد جاری ہونے کے منتظر ہیں''۔

خالد نے سوچا کہ شاید قاری صاحب کے حمایتی مجاہدین موقع پر اس کی کمک کریں گے۔ بہر حال وہ اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے ملا سواتی اور محافظوں کے پیچھے چل پڑا۔

مدرسے کا میدان طلباء کے ہجوم سے بھرا ہوا تھا۔ یہ ہجوم منظم انداز سے ایک دائرہ بنائے ہوئے تھا۔ ملا

سواتی کو محافظین کے ساتھ آتا ہوا دیکھ کر طلباء کا یہ ہجوم کائی کی طرح پھٹ گیا۔ خالد ملا سواتی کے پیچھے چلتے ہوئے ہجوم کے بیچ سے گزر کر اندرونی حلقے میں داخل ہو گیا۔ ندامت کے مارے اس سے نگاہیں نہیں اٹھائی جا رہی تھیں۔ اُس کو اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ اُس نے ماں کو اسلام کی بنیادی تعلیم دینے کے بجائے رشتہ داری کی بنیاد پر اسلام قبول کرنے کے لئے دباؤ ڈالا تھا۔ اب اُسے احساس ہوا تھا کہ اُس کی ماں نے اسلام دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ اُس نے ہمت کر کے سر اوپر کر کے اطراف کا جائزہ لیا۔ تماشائیوں کے حلقے کے بیچ درخت کے تنے سے اس کی ماں کے ہاتھوں کو باندھا گیا تھا۔ اس کی آواز کو دبانے کے لیے اُس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔

اس نے دل ہی دل میں کہا:

''قاری صاحب آپ کے مجاہدین کی کمک تو نہیں پہنچ سکی لیکن اس دور کا خالد بن ولید آپ کو مایوس نہیں کرے گا''۔

اسی اثناء میں ملا سواتی اس کے قریب آئے انہوں نے خالد کے کندھے پر ہاتھ رکھا، خالد کو اُن کے ہاتھ کے لمس سے شدید کراہیت کا احساس ہوا، لیکن اس نے ان کے ہاتھ کو اپنے کندھے سے جھٹکنے سے پرہیز کیا۔

وہ اس کے کندھے کو دباتے ہوئے یوں گویا ہوئے:

''بیٹا! آج تم تاریخ اسلام کا ایک درخشندہ ستارہ بننے جا رہے ہو، آج کا دن اسلام کا، خون کے رشتے پر غالب آنے کا دن ہے''۔

یہ کہنے کے بعد انہوں نے ایک نو ملی میٹر کے بور کا امریکن پستول اس کو دیتے ہوئے کہا:

''یہ لو اس میں صرف ایک گولی ہے۔ مجاہدوں سے سنا ہے کہ تمہارا نشانہ کبھی خطا نہیں گیا! اس گولی کو اس مرتدہ کی عین پیشانی پر مارنا''۔

یہ کہہ کر انہوں نے خالد کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا:

''بالکل پیشانی پر، جیسے برسوں پہلے تم نے میری پیشانی پر تاک کر نشانہ مارا تھا''۔

خالد نے اُن کی بات سن کر ایک لمحے کے لئے تھوک نگلا اور جواب میں با آواز بلند کہا:

''میں اس مرتدہ پر کلاشنکوف کا پورا برسٹ خالی کرنا چاہوں گا''۔

خالد کی پر جوش آواز سن کر اُس کے آس پاس موجود طلباء نے "اسلام زندہ باد" اور " کمانڈر خالد زندہ باد" کے نعرے لگانا شروع کر دیے، جذبات سے مغلوب کئی محافظوں نے ملا سُواتی کے حکم کا انتظار کئے بغیر اپنی کلاشنکوفیں اُس کے قدموں پر رکھ دیں۔ ماحول اور صورت حال اچانک خالد کے حق میں پلٹ چکی تھی۔

خالد کے ہاتھ میں کلاشنکوف آچکی تھی۔ اس کی عقابی نظروں نے اپنے نشانوں کو تاڑ لیا تھا۔

اس نے کلاشنکوف اٹھا کر اپنی ماں کی طرف تانتے ہوئے زوردار آواز میں کہا:

''اسلام زندہ باد''۔

سب تماش بین طالب علموں اور اساتذہ نے جواب میں اسی نعرے کو گرمجوشی سے دہرایا۔

اس نعرے کے بعد خالد نے زوردار آواز میں کہا:

''اللہ اکبر''

سب نے اس نعرے کو بھی فلک شگاف آواز میں دہرایا، اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ سب سے پہلا فائر ملا سواتی پر ہی کرے گا۔ ابھی وہ نعروں کی گونج میں اپنے منصوبے پر نظر ثانی کر ہی رہا تھا کہ ایک زوردار دھماکے کی آواز آئی، مدرسے کی چار دیواری اچانک ڈھ گئی تھی اور پانی کا ایک اونچا ریلا بہت تیزی سے آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہجوم اس اچانک افتاد سے بوکھلا گیا تھا۔ پانی کی رفتار اتنی تیز تھی کہ کسی کو بھی بچنے کو موقع نہ مل پایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر کوئی سرکش لہروں میں غوطے کھانے لگا۔ خالد ایک زبردست پیراک تھا۔ اس کا بچپن وڈیرے کے مویشیوں کو نہر میں نہلانے میں گزرا تھا۔ وہ فوراً پانی کے اندر غوطہ لگا کر اُس درخت کے پاس بڑھا جس سے اُس کی ماں کو باندھا گیا تھا۔ وہ کچھ جدوجہد کے بعد ماں کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ بھاگ بھری بھی بہت اچھی پیراک تھی، اس نے نیچے غوطہ لگا کر خالد کی شلوار کے پائچوں میں گرہ لگا دی۔ اس عمل سے اُس کی شلوار میں ہوا بھر گئی، اب خالد کے لئے تیرنا اور بھی آسان ہو گیا تھا۔ اِن دونوں نے مدرسے کی رہائشی عمارت کی طرف تیرنا شروع کر دیا۔ پانی کی اونچائی بڑھتی جا رہی تھی، اب پانی دوسری منزل کی چھت کو چھونے کو تھا، بھاگ بھری خالد کے پیچھے پیچھے تیر رہی تھی۔ ماں اور بیٹا چھت کا کنارہ پکڑ کر اس پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ خالد نے چھت سے آس پاس کا جائزہ لیا، شہر کی بیشتر عمارتیں زیرِ آب آچکی

تھیں۔ اکثر عمارتیں پانی کے دباؤ کی وجہ سے ڈھتی جا رہی تھیں۔ مدرسہ اونچائی پر تعمیر کیا گیا تھا اس لئے وہاں تک پانی بعد میں پہنچا تھا۔ خالد کو خطرہ تھا کہ پانی کچھ دیر میں اور چڑھ جائے گا کیونکہ سطح آب مسلسل بلند ہو رہی تھی۔ اسے چھت پر موجود تعمیری لکڑیوں کا ڈھیر دیکھ کر خیال آیا کہ کیوں نہ اُن کی مدد سے تیر کر محفوظ مقام پر پہنچا جائے۔ اُس نے ماں کو چھت پر کھڑے رہنے کو کہا اور پانی میں غوطہ لگا کر ایک طرف کو نکل گیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں وہی رسی تھی جس سے بھاگ بھری کو درخت سے باندھا گیا تھا۔ وہ درخت سے بندھی رسی کھول کر لے آیا تھا۔ اس نے ماں کے ساتھ مل کر مضبوط تختوں کو لکڑیوں کے ڈھیر سے نکال کر مظبوطی سے باندھ دیا۔ پانی اس کی توقع کے عین مطابق دوسری منزل کی چھت تک پہنچنا شروع ہو گیا تھا۔ اُس نے ایک بار پھر پانی کے بہاؤ کا جائزہ لیا، ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے دریا کا رخ بدل گیا ہو۔ اب پانی میں انسان اور جانور بہتے نظر آ رہے تھے۔ کچھ جانور مر چکے تھے اور کچھ تیر کر جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ خالد کی نظریں بے تابی سے بوٹے سلمان خان کو تلاش کر رہی تھی۔ وہ اس کی زندگی کی طرف سے بالکل ناامید ہو چکا تھا۔

دارالعلوم کا ایک رہائشی حصہ پانی کے دباؤ کی تاب نہ لا کر ڈھ گیا تھا۔ خالد نے ماں کے ساتھ اپنی بنائی ہوئی کشتی کے ذریعے پانی میں اترنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے رسّی سے بندھے ہوئے تختوں کو پانی میں اتار کر ماں کو اس پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ بہت مہارت کے ساتھ تختوں کے درمیانی حصے پر ایسے سوار ہو گئی کہ گویا وہ کسی گھوڑے پر بیٹھی ہو۔ ماں کے سوار ہونے کے بعد خالد کافی دیر تک تختوں کو ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے اپنی ٹانگوں کے ذریعے اپنی اس چھوٹی سی ناؤ کو بہاؤ کے بیچ لانے کی کوشش کرنے لگا۔ کافی تگ و دو کے بعد وہ مرکزی دھارے تک پہنچ گیا۔ اب ان کی یہ ناؤ مدرسہ کی حدود سے نکل گئی تھی۔ اس دوران خالد کو کئی طلباء اور اساتذہ کی لاشیں پانی میں تیرتی نظر آئیں۔ پانی میں جا بجا نوٹ تیر رہے تھے جو یقیناً خالد کے حجرے سے پانی کے ریلے میں شامل ہوئے تھے۔ یہ نوٹ وڈیرے نے بھاگ بھری سے زندگی بھر مفت مزدوری لینے پر تاوان کے طور پر ادا کیے تھے۔ ماں بیٹے کی یہ سواری سست روی سے بہہ رہی تھی۔ خالد اپنی اس ناؤ کو مناسب رخ پر رکھنے اور درختوں کی شاخوں سے بچانے کے لئے اپنے پیروں کو پتواروں کے طور پر چلا کر صحیح رخ پر رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پانی پر بہتے ہوئے جانوروں اور انسانوں پر نظر ڈالتے ہوئے بھاگ بھری نے اشارہ کرتے ہوئے حیرت ناک لہجے میں کہا:

''بیٹا! دیکھ تو ذرا! یہ تو مجھے تیرا مولبی لگے ہے''۔

خالد نے دُور تک مٹیالے پانی پر نظریں دوڑائیں تو ایک عجیب منظر دیکھا! ملاّ سواتی نے ایک تیرتے ہوئے گدھے کی دم پکڑی ہوئی تھی جو اسے تیرنے میں خاصہ مدد دیے ہوئے تھی۔

اس نے یہ منظر دیکھ کر ماں سے کہا:

''ماں! زیادہ وقت نہیں گزرا ہے۔ بس کچھ دیر پہلے ہی کی بات ہے کہ تمہاری زندگی کی ڈور ملاّ سواتی کے ہاتھ میں تھی اور اب اس کی زندگی کی ڈور گدھے کی دم سے اُلجھی ہے''۔

بھاگ بھری نے خالد کی بات سن کر کہا:

''میں تو بھگوان سے کہتی ہوں کہ اس گدھے کو اتنی شکتی دے کہ وہ اس مولبی کو کھینچ کر خشکی تک پہنچا دے''۔

خالد نے ماں کی بات کے جواب میں کہا:

''یہ منافق اور قاری صاحب کا غدار تمہاری جان لینا چاہتا تھا اور تم ہو کہ اس کی زندگی کی دعا مانگ رہی ہو''!۔

بھاگ بھری نے جواباً کہا:

''مجھے تیری مشکل باتیں سمجھ نہیں آتی ہیں۔ یہ مولبی جیسا بھی ہو انسان تو ہے''۔

خالد نے کہا:

''ماں مجھے تیری جان کی فکر نہ ہوتی تو ابھی تیرتا ہوا جاتا اور گدھے کی دم اُس کے ہاتھ سے چھڑا کر اُس کو ابھی ڈبو کر آتا۔ خیر تم فکر نہ کرو گدھا اِس خنزیر کا ساتھ زیادہ دیر تک نہیں دے پائے گا''۔

خالد اور اس کی ماں کا سارا دن لکڑی کے تختوں کے سہارے بہتے ہوئے گزر چکا تھا۔ اب دن چھپنے کو تھا، بھاگ بھری کی ہمت جواب دے رہی تھی۔

کچھ دیر گزرنے کے بعد گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرے کی وجہ سے بہاؤ کی سمت کا اندازہ کرنا ناممکن

تھا۔ بھاگ بھری کو جب بھی نیند کا غلبہ ہوتا تھا تو وہ سجدے کی حالت میں اپنا سر تختوں پر رکھ دیتی تھی۔ ایسا کرنے سے اس کے ناک میں تختوں سے ٹکرانے والا سیلابی پانی بھر جاتا تھا۔ خالد کی جنگی تربیت اُس کے کام آ رہی تھی۔ وہ اپنے تمام حواسوں کے ساتھ کسی بھی انہونی سے نمٹنے کے لئے تیار تھا۔ رات تھی کہ کٹ نہیں رہی تھی۔ پانی میں ساتھ ساتھ بہنے والے جانور اور حشرات الارض عجیب و غریب آوازیں نکال رہے تھے جن کی وجہ سے رات اور بھی ڈراؤنی ہوتی جا رہی تھی۔

بھاگ بھری کے پیروں کو اچانک زمین سے ٹکرانے کا احساس ہوا، خالد نے بھی یہی محسوس کر کے کہا:

''ماں ہم کنارے پر آ گئے ہیں، تختوں سے اُتر آؤ''۔

یہ دونوں تختوں سے اتر آئے لیکن انہوں نے اپنی زندگی کو سہارا دینے والے ان تختوں کو پانی میں نہیں بہنے دیا بلکہ کھینچتے ہوئے خشکی تک لے آئے۔ یہ دونوں پیروں سے اندھیرے میں زمیں کو ٹٹولتے ہوئے چند قدم اونچائی کی طرف چلے اور ستانے کے لئے زمین پر لیٹ گئے۔ ان دونوں کو لیٹتے ہی نیند نے آلیا۔

دوسرا حصہ

ایٹمی حملوں کے بعد

(۱)

انسانوں کے تخلیق کردہ خوفناک ایٹمی ہتھیار نے تعمیر اور تخریب کے عظیم دیوتا "شیو جی" کے گھر "کیلاش" کو بھسم کر ڈالا تھا۔ وہاں پر ازل سے موجود پتھر پگھل کر پانی ہو گئے تھے۔ ہمالیہ کی عظیم بلندیوں میں آسمانوں کو چھوتی ہوئی مخصوص شکل کی اس چوٹی کو شیو جی کا لنگم کہا جاتا تھا۔ یہ لنگم بادلوں کی اوٹ میں "منا سرور" کی جھیل نما یونی میں پنہا ہو کر زندگیوں کو تخلیق کر رہا تھا۔

دیویوں اور دیوتاؤں کے عظیم مسکن کی تباہی سے ہمالیہ کے پتھروں سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹ پڑے تھے۔ آنسوؤں کی اِن آبشاروں نے ہمالیہ کے دامن میں سجی پر سکون جھیلوں میں طلاطم بپا کر کے پانی کو جھیلوں سے چھلک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اِن جھیلوں سے نکلنے والے دریاؤں کے کنارے بے معنی ہو کر رہ گے تھے۔ گلیشیر ز سے نکلنے والی چھوٹی چھوٹی نالیاں، نالوں کا اور ان سے نکلنے والے دریا سمندر کا روپ دھارتے جا رہے تھے۔

اُدھر راجدھانی دلّی میں حزبِ مخالف کے نیتا "مکر جی" کو دلّی کی جانب بڑھتے ہوئے سیلاب کی بہت فکر تھی۔ اپوزیشن کا رہنما بننے کے بعد ان کی اگلی منزل دلّی کا تخت تھی۔ آخری خبریں آنے تک الہ باد سے آگے گنگا اور جمنا ایک دوسرے سے مل کر بہہ رہے تھے۔

نیتا جی کے دفتر میں بجلی جا چکی تھی۔ انکا نوجوان مددگار "ارون" اپنے موبائل پر ریڈیو کا چینل تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا تا کہ سیلاب سے باخبر رہا جا سکے لیکن اُس کے موبائل کے سیٹیلائٹ کا رابطہ ختم ہو چکا تھا۔

سائرن کی کان پھاڑ دینے والی آوازیں اُس کی مایوسی میں اور اضافہ کر رہی تھیں۔

قریبی مسجدوں والے شاید جنریٹر کے ذریع لاؤڈ اسپیکر استعمال کر کے کچھ اس طرح کے اعلانات کر

رہے تھے:

''الہ آباد کوڈبونے کے بعد سیلاب تیزی سے دلّی کی طرف بڑھ چکا ہے''۔

''آگرہ زیرِآب آچکا ہے اور دلّی کے کئی علاقوں میں بھی پانی آگیا ہے''۔

''سری نگر ڈوب گیا ہے''۔

''سب لوگ کھانے پینے کے سامان سمیت چھتوں پر پناہ لے لیں''۔

''اپنے گناہوں کی توبہ کرلو شاید یہ آخری موقع ہو''۔

نیتا جی مسجد سے نشر ہونے والے پے درپے اعلانات سے گھبرا گئے تھے.

انہوں نے گھبراہٹ میں ارون سے کہا:

"تم دفتر میں جتنا بھی کھانے پینے کا سامان ہے ایک تھیلے میں ڈال کر چھت پر چلو؛ میں ضروری کاغذات لے کر اوپر آتا ہوں"

ارون نے جلدی جلدی دفتر کے کچن میں موجود چائے بسکٹ، ڈبل روٹی اور منرل واٹر کی بوتلیں سمیٹیں اور چھت پر چلا گیا۔

نیتا جی نے دفتر کی فائلوں کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ انہیں ایک خفیہ معاہدے کی تلاش تھی، جسکے مطابق حکومت میں شامل ناراض پارٹیوں سے مل کر مرکزی حکومت کو گرانا تھا۔ مستقبل میں بننے والی حکومتوں کی سربراہی نیتا جی کو ملنا تھی اور وزارتیں چھوٹی پارٹیوں میں تقسیم ہونا تھیں۔ یہ معاہدہ اتنا خفیہ تھا کہ نیتا جی کے دست راست "ارون" کو بھی اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے مکر جی نے تمام کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ اب کھلی کھڑکیوں سے مسجد سے ہونے والے اعلانات کے شور نے نیتا جی کے اعصاب پر اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔

انہوں نے ایک اعلان کے جواب میں خود کلامی کے انداز میں زور سے چیختے ہوئے کہا:

"ذرا مجھے دلّی کا تخت سنبھالنے دو، سب سے پہلے ہندوستان کی مسجدوں سے اِن کان پھاڑنے والے لاؤڈ اسپیکروں کو اتروادوں گا''۔

لاؤڈ اسپیکر صرف انکی دھمکی سے ہی خاموش ہو گیا تھا۔ شاید مسجد والوں کے جنریٹر میں تیل نہیں رہا تھا۔

نیتا جی اپنے کرتے کی جیب مین پڑے ہوئے موبائل کی گھنٹی بجنے سے چونک اُٹھے۔موبائل سروس کا رابطہ بحال ہوگیا تھا۔انہوں نے بے تابی سے کرتے کی جیب سے موبائل نکال کر اپنے کان سے لگایا۔

دوسری طرف سے آواز آئی:

''نمسکار! شری مکرُ جی، میں شمالی کمانڈ کا میجر ورمابات کر رہا ہوں، آپ سے درخواست ہے کہ آپ فوراً اپنے دفتر کی چھت پر پہنچیں، ہمارا ہیلی کاپٹر آپ کی مدد کو آرہا ہے''۔

نیتا جی نے فون کو کرُتے کی جیب میں رکھتے ہوئے سوچا کہ:

''اب فائیل تلاش کرنے کا شاید کوئی فائدہ نہیں ہے''۔

اس سے پہلے کہ کچھ اور سوچتے؛ پانی کا ایک ریلہ کھڑکیوں کے راستے دفتر میں گھس آیا۔نیتا جی دیکھتے ہی دیکھتے کمر تک پانی میں ڈوب گئے۔انہوں نے معاہدے کے کاغذات ڈھونڈنے کے ارادے کو ترک کر کے زینے کی جانب دوڑ لگادی۔وہ اوپر کی منزل پر پہنچتے ہی ہانپ کر چھت پر لیٹ گئے۔ان کا سانس تیزی سے زینے چڑھنے کی مشقت وجہ سے بری طرح اکھڑ چکا تھا۔ان کا سکریٹری ارون دوڑ کر تیزی سے ان کی طرف لپکا تا کہ ان کو سہارا دے کر بٹھا سکے۔

نیتا جی نے اکھڑتے ہوئے سانس کے ساتھ اسے کہا:

''بیٹا! کچھ انتظار کرو۔۔۔۔ذرا میرا سانس بحال ہونے دو، میں خود اٹھ کر بیٹھ جاؤں گا''۔

ارون نے سعادت مندی سے کہا:

''بہت بہتر جناب۔۔۔میں آپ کے لئے پانی لے کر آتا ہوں''۔

یہ کہہ کر ارون نے ایک منرل واٹر کی بوتل لا کر دی۔اس دوران نیتا جی اپنے حواس بحال کر کے بیٹھنے کے قابل ہو چکے تھے۔

انہوں نے نہایت مایوسی سے ارون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''بیٹا! ہمارا دلی ڈوب رہا ہے ہمارے خواب بکھر گئے ہیں۔دفتر کی نچلی منزل پانی میں ڈوب رہی ہے''۔

ارون نے خوفزدہ لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا:

''آپ نے بجا فرمایا ہے۔ آفس کی چھت سے تا حد نظر پانی ہی پانی نظر آ رہا ہے۔ سب لوگ چھتوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔۔۔ پانی چڑھتا ہی جا رہا ہے، اگر پانی دفتر کی چھت تک آ گیا تو ہمیں ڈوبنے سے کوئی نہیں بچا سکے گا''۔

نیتا جی نے ارون کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا:

''بیٹا! فکر نہ کرو ایک فوجی ہیلی کاپٹر ہماری مدد کو آنے والا ہے۔ تم ذرا پانی کی ٹینکی پر چڑھ کر پارٹی کے جھنڈوں میں سے ایک جھنڈا اُتار لاؤ تا کہ اس کو لہرا کر آنے والے ہیلی کاپٹر کو اس کی طرف متوجہ کر سکو''۔

ارون ان کی بات پر اثبات میں سر ہلائے ہوئے پانی کی ٹینکی پر چڑھ گیا۔ اس نے ٹینکی پر سے دیکھا کہ برابر والے گھر کے سارے افراد چھت پر موجود تھے۔

چھت پر موجود ایک عورت نے ارون کو دیکھ کر کہا:

''اے بیٹا! ہم کو پانی کے ریلے نے کچھ بھی چھت پر لانے کی مہلت نہ دی۔ کچھ پانی اور کھانے کا سامان مل جائے تو ہم پر بڑی کرپا ہو گی''۔

ارون نے چھت پر کھڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے بچوں کی طرف ترس کھا کر دیکھتے ہوئے کہا:

''ہمارے پاس کچھ سامان ہے، میں ابھی آپ کو دیتا ہوں''۔

یہ کہنے کے بعد ارون پارٹی کا ایک جھنڈا اُتار کر نیچے لے آیا۔

اس نے جھنڈا دیوار سے ٹکا کر رکھنے کے بعد نیتا جی سے اجازت لینے کے لہجے میں کہا:

''برابر والے گھر کی چھت پر بچے بھوکے، پیاسے ہیں، کیا ہم اپنے سامان میں سے کچھ ان لوگوں کو دان کر دیں؟''۔

نیتا جی نے کہا:

''ضرور دو بیٹا، دان کرنے سے مصیبت ٹلتی ہے۔ "ویسے بھی ہماری مدد کو ہیلی کاپٹر آنے والا ہے۔ تم کچھ پانی کی بوتلوں کے سوا سب سامان اُن کو دے دو''۔

ارون نے یہ بات سنتے ہی سامان کے تھیلے سے دو پانی کی بوتلیں نکال کر ایک طرف رکھیں اور باقی سامان لے کر وہ پانی کی ٹینکی پر چڑھ گیا۔ ٹینکی پر کھڑے ہو کر اس نے سارا سامان برابر والے گھر کی چھت پر

پھینک دیا، کھانے پینے کا سامان پا کر سارے پریوار کے چہرے خوشی سے کھل اُٹھے۔

نیتا جی اپنی توانائی بحال ہونے کے بعد باہر کا جائزہ لینے کے لیے چھت کے کنارے آ کھڑے ہوئے۔انہوں نے دیکھا کہ گلی ایک نہر کی شکل کی اختیار کر چکی تھی۔آوارہ کتے سیلابی پانی میں ڈبکیاں کھاتے ہوئے جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔مختلف قسم کا گھریلو سامان پانی میں بہہ رہا تھا۔

نیتا جی نے یہ منظر دیکھ کر سوچا:

''اگر ہیلی کاپٹر کو آنے میں دیر ہو گئی تو شاید ہمیں اِن کتوں کی طرح ڈوب کر ہی مدد کرنا ہوگا'' انہیں اس بہتے پانی کو دیکھ کر خوف آنے لگا تو وہ وہاں سے ہٹ کر ارون کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

نیتا جی نے اسے موبائیل پر گیم کھیلتے ہوئے دیکھ کر کہا:

''بیٹا یہ سمے پرارتھنا کرنے کا ہے، کھیلنے کا نہیں''۔ارون نے نیتا جی کی نصیحت کو سُن کر موبائیل اپنے کرُتے کی جیب میں ڈال لیا۔نیتا جی نے اردن کو نصیحت کرنے کے بعد ''رام رام'' کا جاپ کرنا شروع کر دیا۔

پانی کی سطح بلند ہونے کے ساتھ ساتھ نیتا جی کی اُمید دم توڑتے جا رہی تھی۔آس پاس کے گھروں سے لوگوں کے رونے اور فریاد کرنے بلند ہوتی آوازیں ماحول کو اور بھی افسردہ بنا رہی تھیں۔خوف کے اس ماحول میں ایک گڑگڑاہٹ کا اور اضافہ ہو گیا۔ایک ہیلی کاپٹر پارٹی کے دفتر کی طرف پرواز کر رہا تھا۔

نیتا جی نے بے تاب ہو کر ارون سے کہا:

''بیٹا! جھنڈا لہرانا شروع کرو۔ہیلی کاپٹر کو دفتر کی چھت پہچاننے میں آسانی ہو جائے گی''۔ارون کے وجود میں ہیلی کاپٹر کی آواز سن کر ایک نئی توانائی آ گئی تھی۔اس نے چھت کے اوپر بنی ہوئی کنکریٹ کی ٹنکی پر چڑھ کر جھنڈے کو بے تابی سے لہرانا شروع کر دیا۔

ہیلی کاپٹر پارٹی دفتر کے اوپر ایک چکر لگانے کے بعد فضا میں ایک جگہ پر ساکت ہو گیا۔کچھ ہی دیر میں ایک فوجی جوان رسی کے ذریعے بڑی مہارت سے پارٹی کے دفتر کی چھت پر اتر گیا، چھت پر اترتے ہی اس نے ہیلی کاپٹر کی طرف مخصوص اشارہ کیا۔اس کے اشارہ کے جواب میں ایک اور رسی ہیلی کاپٹر سے نیچے آنے لگی۔اس رسی سے مختلف اقسام کی بیلٹیں منسلک تھیں۔فوجی جوان نے نیتا جی کے بھاری بھرکم وجود کو ایک بیلٹ

میں مضبوطی سے جکڑ دیا۔اس عمل سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ہیلی کاپٹر کی طرف مخصوص اشارہ کیا اس کے نتیجہ میں نیتا جی آہستہ آہستہ ہوا میں بلند ہونے لگے۔نیتا جی کے قدرے بلند ہونے کے بعد فوجی جوان نے ارون کو اسی رسی سے منسلک ایک بیلٹ میں باندھ دیا۔اب ہیلی کاپٹر نے ان دونوں کو اوپر کھینچنا شروع کر دیا۔ ہیلی کاپٹر کافی بلندی پر ایستادہ تھا۔ یہ دونوں بھی آہستہ آہستہ بلندی کی منازل طے کر رہے تھے۔ارون کو یکا یک اپنے چہرے پر پانی کے چھینٹے پڑتے ہوئے محسوس ہوئے جن سے ناگوار بو آ رہی تھی۔

ارون نے دل میں سوچا:

''سورج چمک رہا ہے یہ بارش کے چھینٹے تو ہو نہیں سکتے، اف اتنی بد بو۔شاید نیتا جی کا پیشاب خطا ہو گیا ہے''۔

ہیلی کاپٹر کے قریب پہنچنے پر کچھ فوجی جوانوں نے ان دونوں کو اندر کھینچ لیا۔نیتا جی ہیلی کاپٹر میں بے سدھ ہو کر لیٹ گئے۔ایک فوجی جوان نے ان کو سہارا دے کر بٹھانے کے بعد پانی پینے کو دیا۔نیتا جی نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ کئی اور، وزراء بھی وہاں موجود تھے۔یہ سب لوگ اتنے سہمے ہوئے تھے کہ ایک دوسرے کو نمسکار کہنا تک بھول گئے تھے۔کچھ دیر میں نیچے رہ جانے والا فوجی جوان بھی مستعدی سے ہیلی کاپٹر میں سوار ہو گیا۔اس کے کامیاب مشن کے بعد فوجی جوان کے خیریت سے واپس ہیلی کاپٹر میں آنے پر سب فوجیوں نے خوشی کا نعرہ لگایا۔ہیلی کاپٹر نے ایک جھٹکا لے کر پرواز شروع کر دی۔

لوہے کی یہ اڑتی ہوئی مشین کان پھاڑ دینے والا شور مچا رہی تھی۔فوجی جوانوں کے کانوں پر مخصوص ہیڈ فون لگے ہوئے تھے۔وہ ان کے ذریعے آپس میں بات چیت بھی کر سکتے تھے لیکن وہاں پر بیٹھے ہوئے وزراء اور اہم شخصیات اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر بیٹھنے پر مجبور تھے۔فوجی جوانوں نے ان سب کو حفاظتی نقطۂ نظر سے بیلٹ سے باندھ دیا تھا۔نیتا جی کو معلوم نہ تھا کہ ان کی منزل کہاں ہے، لیکن ان کو یہ یقین تھا وہ کہ ڈوب کر مرنے کی موت سے بچ گئے تھے۔

(۲)

ہیلی کاپٹر دو گھنٹے سے زیادہ پرواز کرنے کے بعد دہرادون کی ملٹری بیس پر اتر گیا۔ ہیلی کاپٹر کا انجن بند ہوتے ہی نیتا جی نے سکون کا سانس لیا۔

ایک فوجی افسر نے ہیلی کاپٹر کا پنکھا رک جانے کے بعد مودبانہ انداز میں سب کو مخاطب کر کے کہا:

''میں آپ کو ہندوستان آرمی کی طرف سے دہرادون بیس پر خوش آمدید کہتا ہوں۔ ہماری کور کو کابینہ کو محفوظ مقام پر منتقل کرنے کی ذمہ داری دی گئی تھی۔ ہم نے اکثر وزراء کو دلّی سے بحفاظت نکال لیا ہے، پانچ وزراء ابھی تک لاپتہ ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہم اُن کی بھی دلّی سے نکلنے میں مدد کر پائیں گے۔ صدر جمہوریہ کے حکم سے ہم نے ہندوستان کی راجدھانی کو وقتی طور پر یہاں منتقل کر دیا

ہے۔ آپ سب سے گزارش ہے کہ باری باری نیچے اُتر آئیں''۔

نیتا جی دیگر وزراء کے ساتھ ہیلی کاپٹر سے نیچے اتر آئے۔ ہیلی کاپٹر سے تھوڑی دور ایک وین موجود تھی۔ یہ تمام لوگ ایک فوجی افسر کی رہنمائی میں وین میں سوار ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں وین ایک بلڈنگ کے سامنے آ کر رک گئی۔ اس بلڈنگ کے دروازے پر ملٹری پولیس کے جوان چاق و چوبند کھڑے تھے۔ آرمی افسر کے پیچھے تمام وزراء اس عمارت میں داخل ہو گئے۔

عمارت میں داخل ہوتے ہی وزیر اعظم کے اسٹاف آفیسر نے سب کا استقبال کرتے ہوئے کہا:

''آپ سب کے لئے سامنے والے ہال میں دُھلے ہوئے کپڑے موجود ہیں۔ وہاں پر بہت سے غسل خانے ہیں آپ چاہیں تو اشنان کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس تیار ہونے کو ایک گھنٹہ ہے۔ ٹھیک چھ بجے بّری فوج کے سربراہ وزیر اعظم اور کابینہ کو سیلاب کی صورتحال سے آگاہ کریں گے۔ اس بریفنگ کے بعد کابینہ کا ہنگامی اجلاس ہوگا۔ کچھ وزراء پہلے ہی تیار ہو کر میٹنگ کے کمرے میں پہنچ چکے ہیں۔ آپ سب کو چھے بجنے

سے دس منٹ پہلے میرا اسسٹنٹ لینے آجائے گا۔" یہ کہہ کر اسٹاف آفیسر وہاں سے چلے گئے۔

کانفرنس کے وسیع وعریض ہال کے ایک کونے میں لمبی سی میز پر کابینہ کے اراکین اور نیتا جی بیٹھے ہوئے تھے۔ برابر میں ایک میز پر وزیر اعظم ہندوستان اور صدر جمہوریہ براجمان تھے۔ ایک دوسری میز پر سکریٹری ڈیفنس، آرمی، ایئرفورس اور نیوی کے سربراہان بیٹھے ہوئے تھے۔

ایک افسر نے آگے بڑھ کر آرمی کے سربراہ کو سیلاب کی صورتحال سے متعلق پریزنٹیشن دینے کی دعوت دی۔

آرمی کے سربراہ نے ٹوپی سر سے اُتار کر میز پر رکھی اور سکرین کے پاس آکر تصویر کی مدد سے اپنی بریفنگ کو اس طرح شروع کیا:

"جناب صدر جمہوریہ، وزیر اعظم، ارکان کابینہ، اپوزیشن لیڈر اور عزیز کولیگز! ہندوستان، پاکستان، بھوٹان، نیپال، بنگلہ دیش، برما اور چین کا ایک حصہ جدید انسانی تاریخ کے سب سے بڑے سیلاب کا سامنا کر رہے ہیں۔ میں آپ کو یہاں پر پہاڑی علاقوں کی کچھ تصاویر دکھانا چاہوں گا"۔

یہ کہنے کے بعد آرمی کے سربراہ کے اشارہ پر ایک آفیسر نے اسکرین پر کچھ سلائیڈز دکھائیں جن میں پہاڑی علاقوں میں دریا پر بنے ہوئے پل اور بند مخدوش حالت میں نظر آرہے تھے۔

آرمی چیف نے نقشے کی مدد سے واضح کیا کہ:

"گنگا اور جمنا دریا ایک ہو چکے ہیں۔ ان پر بنے ہوئے تمام پل اور بیراج بہہ چکے ہیں۔ دریاؤں سے نکلنے والی نہریں پانی کے دباؤ کو برداشت نہ کرنے کی وجہ سے اپنا وجود کھو چکی ہیں۔ ریلوے لائنیں بہہ جانے سے ریلوے کا سفر ناممکن ہوگیا ہے۔ سڑکیں بہہ چکی ہیں اور دریاؤں کے اُوپر کوئی پل سلامت نہیں بچا ہے۔ راوی، ستلج اور بیاس ایک دوسرے سے ملنے والے ہیں جس سے تباہی اور بڑھے گی۔ برہم پترا کی براہی نے آسام، بنگال اور اُڑیسہ کو ڈبو دیا ہے۔ جو لوگ دریاؤں کے پانیوں پر کشتیوں یا اور دیگر تیرنے والے اجسام پر پناہ لئے ہوئے ہیں وہ بہاؤ کے ساتھ پاکستان میں داخل ہو رہے ہیں۔ سرکش سیلابوں نے سرحدوں کو مٹا دیا ہے۔ نیوی نے محدود پیمانے پر امداد کا آپریشن شروع کر دیا ہے۔ ایئرفورس اپنے اکثر اڈوں کے زیر آب آنے کی وجہ سے بھرپور آپریشن نہیں کرسکتی، صرف پہاڑی علاقوں کے رن ویز سے امدادی پروازیں کی جاسکتی

تھیں جو کہ جاری ہے۔اب ہندوستان کے پاس بین الاقوامی امداد کی اپیل کرنے کے سوا کوئی رستہ نہیں بچا ہے۔مختصر الفاظ میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ پانچ سو سالوں کا بنا ہوا انفراسٹرکچر تباہ ہو چکا ہے۔مواصلاتی نظام کی تباہی سے فوجوں کے بریگیڈز اور رجمنٹس کے درمیان رابطہ ختم ہو گیا ہے۔سول سروس کے افسران بھی ایک دوسرے سے رابطہ کرنے سے قاصر ہیں"۔

آرمی چیف نے ایک وقفے کے بعد مزید کہا:

"ہم جناب وزیر اعظم کے حکم اور ہدایات کے منتظر ہیں۔ہمیں جو حکم ملے گا ہم بجالائیں گے"۔

یہ کہہ کر آرمی چیف باوقار انداز میں چلتے ہوئے اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

وزیر اعظم نے اُن کو جواب میں کہا:

"کابینہ کے اجلاس میں امداد کے متعلق روڈ میپ کا تعین کر کے آپ سے پیشہ وارانہ رائے لینے کے بعد ہم سب اپنی قوم کو بچانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے"۔

افواج کے سربراہان نے ایک ساتھ سر ہلا کر حکم بجالانے کا اشارہ دیا اور ٹوپی پہن کر سلیوٹ کرتے ہوئے کانفرنس ہال باہر چلے گئے۔افسران کے باہر جاتے ہی کچھ دوسرا اسٹاف اندر آ گیا۔ان کو ہونے والی کابینہ میٹنگ کے اجلاس کی روداد قلمبند کرنی تھی۔

ابھی کابینہ کی میٹنگ کی کاروائی رسمی طور پر شروع بھی نہ ہوئی تھی کی ایک منسٹر اٹھ کر اپوزیشن کے رہنما "مکرجی" کے پاس جا دھمکے۔انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پلک جھپکتے میں ان کو گریبان سے گھسیٹ کر زمین پر گرانے کے بعد لاتوں کی بوچھاڑ کر دی۔وزیر اعظم کے اسٹاف اور کچھ دوسرے ارکان کابینہ نے بمشکل نیتا جی کی جان بخشی کروائی۔

ایک وزیر نے کھڑے ہو کر کہنا شروع کر دیا:

"ان کی مکارانہ سیاست اور لوگوں کو ورغلا کر سڑکوں پر لا کر ایٹمی میزائل نصب کروانے کو آج سارا برصغیر بھگت رہا ہے۔میں ان سے کہتا ہوں کہ جاؤ اب گنگا کے پانی کو روک کر دکھاؤ کیوں کہ یہ پانی ہمارے سارے مندر ڈھاتا جا رہا ہے۔نیتا جی، اس سیلابی پانی نے تاج محل کو بھی ڈھا دیا ہے۔اب آپ کو تاج محل کو ڈھانے کے لئے لوگوں کو ورغلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔اب گنگا میا کا غصہ مندروں، مسجدوں،

گرجوں اور ہم سب پر برابر اُتر رہا ہے۔ تم بڑے پروفیسر بنے پھرتے تھے پر رتی برابر عقل نہ تھی، سبق حاصل نہ کیا کہ ایک دفع سیاست میں مذہب کے استعمال نے ہندوستان کو توڑ ڈالا تھا اور تم نے پھر اسی سیاست کا استعمال اپنے آپ کو دلّی تک پہنچانے کے لئے شروع کر دیا"۔

وزیراعظم نے ہاتھ سے اپنے وزیر کو بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود کھڑے ہو کر بولنا شروع کیا کہ:

"میرے بھائیو یہ گزرے سے پر بات کرنے کا موقع نہیں۔ آج کی میٹنگ کے ایجنڈے کا صرف ایک ہی نکتہ ہے وہ یہ کہ امدادی صورتحال سے کیسے نمٹا جائے اور عالمی برادری سے امداد کی اپیل کی جائے یا نہیں۔ وقت ہمارے ہاتھ سے پھسلے جا رہا ہے۔ مجھے آرمی چیف کے ساتھ ہیلی کاپٹر سے مختلف مقامات کا فضائی جائزہ لینا ہے، آیئے صرف امداد کے موضوع پر ہی بات کریں"۔

وزیراعظم کی تجویز پر ماحول کچھ بہتر ہو گیا تو میٹنگ کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔

(۳)

پاکستان کا دارالحکومت اسلام آباد ہندوستانی راجدھانی دلّی کے مقابلے میں خوش قسمت واقع ہوا تھا۔ اسلام آباد دریاؤں سے دُور پہاڑی علاقے پر آباد تھا اس لئے سیلاب کی تباہی سے بچ گیا تھا۔ تمام سرکاری ملازمین اسی شہر میں رہتے تھے لیکن اس بات کا کوئی زیادہ فائدہ نہ تھا کیونکہ ملک کے سیلابی علاقوں سے مواصلات کے تمام رابطے کٹ چکے تھے۔ ٹیلی فون کام نہیں کر رہے تھے، شہر سے بجلی غائب تھی۔ بپھرے ہوئے دریاؤں نے راستوں کو ادھیڑ ڈالا تھا۔ آرمی کے قائم کردہ ہنگامی وائرلیس سسٹم اور امریکن حکومت کے فراہم کردہ سیٹلائیٹ فون ہی رابطے کا واحد ذریعہ تھے۔ حکومت ہند و پاکستان نے ایک تاریخی اعلان کے ذریعے دونوں ملکوں کے شہریوں کو ایک دوسرے ملک میں آنے جانے کے لئے پاسپورٹ اور ویزے سے مستثنیٰ قرار دیا تھا۔ اس سہولت سے فی الحال کوئی زیادہ فائدہ ہونا ممکن نہیں تھا۔ زیادہ تر ہندوستانی شہری پاکستان کی طرف بہتے پانی میں لاشوں کی صورت میں داخل ہو رہے تھے جنہیں پاسپورٹ اور ویزے کی ویسے بھی ضرورت نہ تھی۔ ان بہتی لاشوں کے درمیان چند ہی خوش قسمت ایسے ہوتے تھے کہ جو جان بچانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ سیلاب سے متاثر ہونے والے ممالک کے لیۓ تن تنہا اس آفت سے نبٹنا ممکن نہ تھا۔ اُن کے پاس عالمی برادری کو مدد کے لئے پکارنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اقوام متحدہ ایک بڑے پیمانے پر امدادی مہم شروع کرنے کے لئے تیار تھی لیکن عالمی طاقتوں نے انڈیا اور پاکستان پر ایٹمی ہتھیار بنانے کی صلاحیتیں ختم کرنے اور ایٹمی وار ہیڈز کو تلف کرنے کی پیشگی شرط عائد کر دی تھی۔ تباہی کے دھانے پر کھڑے ان دونوں ممالک کے پاس ایٹمی صلاحیتوں سے دستبرداری کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔

ایٹمی ہتھیاروں سے دستبرداری کے معاہدے کے بعد اقوام متحدہ کی امدادی تنظیمیں امداد کی منصوبہ بندی کرنے لگیں، لیکن اس وقت تک یہ خطہ ایک بہت بڑی بربادی سے گزر چکا تھا۔ قوام متحدہ نے ہندوستان اور

پاکستان سے کسی بھی جہاز کی پرواز پر پابندی عائد کردی تھی۔ یہ پابندی ایٹمی تنصیبات کو ناکارہ اور ہتھیاروں کو تلف کرنے کو بعد ہی اٹھنا تھی۔ ہتھیاروں کی تلفی کے معاہدے پر دستخط ہوتے ہی عالمی ایجنسی برائے ایٹمی تحفظ کے اہلکار سارے ہندوستان و پاکستان میں ایٹمی ہتھیاروں کو ناکارہ بنانے اور ایٹمی ایندھن کی منتقلی میں مصروف ہو گئے تھے جبکہ اقوام متحدہ ابھی تک امدادی کاموں کی منصوبہ بندی میں ہی مصروف تھی۔ امدادی کاموں میں سب سے بڑا رخنہ یہ تھا کہ کم وبیش تمام بڑی بندرگاہوں کی آبی گذرگاہیں سیلابی ریلوں کی وجہ سے ریت سے اٹ گئی تھیں، پہلے سے لنگر انداز جہاز گودیوں میں پھنس گئے تھے۔ جہازوں کا کھلے سمندر سے بندرگاہوں میں آنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس صورتحال میں امدادی کام صرف اور صرف ہیلی کاپٹرز کے ذریعے ہی ممکن تھا۔ میدانی علاقوں کے ایئر پورٹ بھی زیر آب آچکے تھے اس لئے جہازوں کو محدود پیمانے پر ہی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ مغربی ممالک کے عوام اقوام متحدہ کے قائم کردہ امدادی فنڈ میں دل کھول کر چندہ دے رہے تھے، لیکن ان ممالک کی سڑکیں ایٹمی ہتھیاروں کے خلاف مظاہروں سے بھر گئی تھیں۔ دنیا بھر میں اچانک ایٹمی ہتھیاروں اور ایٹمی توانائی کے خلاف عالمی تحریک جنم لے چکی تھی۔ روس، امریکہ اور فرانس کے عوام ایٹمی تنصیبات کو ختم کرنے کی مانگ پر ڈٹ گئے تھے۔

(۴)

یونیورسٹی کے کامن ہال میں البرٹ ہندوستان کے اجڑنے کی کہانی یہاں تک سنانے کے بعد رک گیا،
اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھرنے کے بعد کہا:

''آج مجھ میں اس سے آگے کی داستان سنانے کی ہمت نہیں ہے''۔

پروفیسر صاحب نے یہ سن کر البرٹ کی طرف ایسے دیکھا کہ جیسے انہیں اس پر ترس آ رہا ہو۔
انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا:

''ٹھیک ہے البرٹ آج کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ اب اگر کسی کے ذہن میں سوالات ہوں تو پوچھے جاسکتے ہیں''۔

یہ سنتے ہی البرٹ سمیت کئی طالب علموں نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔
پروفیسر صاحب نے البرٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''پوچھو البرٹ۔۔۔۔تمہارا ہاتھ سب سے پہلے بلند ہوا تھا''۔

البرٹ نے اپنے لمبے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سوال کیا کہ:

''سیاسی تاریخ کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ پاکستان قومی تشخص کو اجاگر کرنے اور اسے قائم کرنے میں ناکام ہوگیا تھا۔ اس بات کی کیا وجوہات ہیں؟''۔

پروفیسر صاحب نے سوچتے ہوئے جواب دیا:

''اچھا سوال ہے؛ پاکستان کی بنیاد اِس خیال پر رکھی گئی تھی کہ ہندو اور مسلمان ایک ساتھ نہیں رہ سکتے! گو کہ پھر بھی پاکستان سے زیادہ مسلمان انڈیا میں ہندو اکثریت کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد وہاں کے دانشوروں نے پاکستان کی جڑیں سلطنت دہلی اور مغلیہ ادوار سے وابستہ کیں، جبکہ ریاست

پاکستان نے اس نظریہ کو اپنایا کہ پاکستان کی بنیاد دراصل ایک عربی حملہ آور محمد بن قاسم کے ہندوستان پر حملہ کے دن ہی پڑ گئی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ حملہ آور اموی امپریلزم کا ایک نمائندہ تھا۔ وہ کوئی اسلام کو پھیلانے والا مبلغ نہیں تھا۔ پاکستان ایک ایسا خوش نصیب ملک تھا کہ جس کے حصے میں مہر گڑھ، انڈس ویلی، ہڑپہ اور ٹیکسلا جیسے آثار قدیمہ آئے تھے، مگر افسوس کہ پاکستان نے اپنی زمین سے نمو پا کر سارے ایشیاء میں پھیلنے والی تہذیب سے کوئی رشتہ نہ جوڑا تھا۔ یہ پاکستان کی ریاست کے مستقبل کی سمت متعین کرنے والوں کی ایک بھیانک غلطی تھی جسکی وجہ سے پاکستان اپنا قومی تشخص قائم کرنے میں ناکام ہو گیا تھا''۔

پروفیسر صاحب نے اب فلپ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا:

''ہاں فلپ اب تمہارا نمبر ہے۔۔۔ پوچھو۔ تمہارے ذہن میں یقیناً کوئی اچھوتا سوال کلبلا رہا ہوگا''۔

فلپ نے سوال کیا کہ:

''افغانستان کی نیم خواندہ قبائلی معاشرے میں انتہا پسندی کا پنپنا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن پاکستان میں نیم خواندہ دیہی معاشرے کے ساتھ بڑے شہروں میں شہری طرز زندگی بھی تھا۔ تو پھر وہاں پر مذہبی انتہا پسندی کو مقبولیت کیوں حاصل ہوئی؟''۔

پروفیسر صاحب نے جواب میں کہا:

''بھئی! مختصر جواب ذرا مشکل ہوگا۔ پھر بھی کوشش کرتا ہوں۔ پاکستان کی بنیاد ہی مذہب پر ڈالی گئی تھی یہاں تک کہ آئین پاکستان کی بنیادی شق یہ تھی کہ کوئی قانون ہزاروں سال پرانی آسمانی کتاب کے احکامات کے منافی نہ ہوگا۔ اب اگر مذہب کو قانون بنا دیا جائے تو مذہب کی علماء جو بھی تشریح کریں گے عوام ان کی بات کو ہی قانون تسلیم کریں گے۔ لہذا کبھی پاکستان میں نظام مصطفیٰ کی تحریک چلی تو کبھی جہادی تحریکوں نے سر اٹھایا۔ ویسے بھی مسلمانوں کو یہ باور کروایا گیا تھا کہ اسلام دنیا کا سب سے بہتر مذہب ہے اور اسلام کو غالب ہو کر تمام دنیا پر حکمرانی کرنا ہے۔ البتہ ہم برطانوی لوگ بھی ایک حد تک مذہبی انتہا پسندی کے پھیلاوے کے ذمہ دار ہیں۔ برٹش سرکار نے عیسائی تبلیغی جماعتوں کو غریب اور نچلی ذات کے ہندوؤں کو عیسائی بنانے کی کھلی چھوٹ دیدی تھی۔ جس کے ردعمل میں ہندوؤں نے آریہ سماج کی تحریک کے ذریع اپنے مذہب کا دفاع کیا اور عیسائی یا مسلمان بن جانے والے ہندوؤں کو واپس ہندو مذہب اختیار کرنے کی تبلیغ کی

بنیاد ڈالی، اس سے پہلے شواہد نہیں ملتے کہ ہندوؤں نے غیر ہندوؤں کو ہندو بنانے کی کوشش کی ہو۔اس کے رد عمل میں مسلمانوں نے انجمن حمایت اسلام جیسی تنظیموں کے ذریعے آریہ سماج جیسے کام کرنے کی کوشش کی''۔

پروفیسر صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے مزید کہا کہ:

''پاکستان کے بڑے شہر قبائلی ثقافت کی عکاسی تو نہیں کرتے تھے لیکن پاکستان میں نظام عدل کی ناکامی کی وجہ سے عوام انتہا پسندوں کے سرسری سماعت پر فوری سزا دینے کے نظام سے متاثر ہو چکے تھے۔ قبائلی انداز کے سزائیں دینے کی ثقافت کو اسلام کا لبادہ اڑھا دیا گیا تھا۔

البتہ میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ سوویت افواج کی افغانستان میں مداخلت، واشنگٹن ولندن کی افغانستان اور عراق پر فوج کشی نے انتہا پسندی کے نظریہ کو سید قطب، مودودی اور حسن البناء کی کتابوں سے نکال کر نوجوانوں کے دلوں میں عملی طور پر راسخ کر دیا تھا۔

مختصراً یہ کہ پاکستان تیزی سے مہذب دور سے ایک تاریک دور میں داخل ہو گیا تھا''۔

جمیلہ بار بار اپنا ہاتھ ہلا کر سوال پوچھنے کے لئے بے تابی کا اظہار کر رہی تھی۔

پروفیسر صاحب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''جمیلہ تم خاصی بے تاب لگتی ہو! کیا سوال ہے تمہارا؟''۔

جمیلہ نے سوال کرتے ہوئے کہا:

''پاکستان میں کرشماتی لیڈرز کیوں نہیں پیدا ہو پائے؟''۔

پروفیسر نے جمیلہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا:

''شاباش! مختصر لیکن ایک اہم سوال کیا ہے۔ لیڈر شپ کی اہلیت رکھنے والے افراد ہر قوم میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ نظام تعلیم اور ریاستی ادارے ایسے اہل افراد کی اہلیت کو اجاگر کرنے میں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ پاکستان میں اکثر ابھرتے ہوئے لیڈرز کو مروا دیا جاتا تھا یا کردار کشی کے ذریعے اُن کو سیاسی موت سے ہمکنار کر دیا جاتا تھا۔ دراصل پاکستان کی سول اور ملٹری نوکر شاہی ذہین رہنماؤں کو اپنے اداروں کے لئے خطرہ سمجھتی تھی۔ جن قوموں میں رہبری کی اہلیت رکھنے والے افراد کو تربیت سے نکھار کر آگے نہیں لایا جاتا، ایسی اقوام کا مقدر پسماندگی ہی ہوتا ہے۔''

سوزان نے ہاتھ کھڑا کیا تو پروفیسر صاحب نے کہا:

بس یہ آج کا آخری سوال۔ کہو سوزان کیا پوچھنا ہے؟۔

سوازن نے دریافت کیا کہ:

''کیا سول اور ملٹری تعلقات میں توازن نہ ہونے کا اس المیہ سے کوئی تعلق تھا؟''۔

پروفیسر صاحب نے جواب میں کہا:

بالکل تھا! پاکستان میں تو سول اور ملٹری تعلقات میں کبھی بھی توازن نہیں رہا تھا۔۔۔ وہاں تو فوج کی ہی بالا دستی ہوتی تھی لیکن جنگی کشیدگی کے دنوں میں ہندوستانی سیاستدانوں کو فوج نے ایٹمی ہتھیار لانچنگ پوزیشن پر نہ لانے کا مشورہ دیا تھا۔ ان کے اِس مشورے کو اس وقت کے ہندوستانی سیاستدانوں نے اپنے سیاسی مفادات کی خاطر رد کر دیا تھا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سول ملٹری تعلقات میں اگر خلیج نہ ہوتی تو یہ عظیم تہذیب تباہی سے بچ سکتی تھی۔

یہ کہنے کے بعد پروفیسر صاحب نے کہا:

"عزیز طالب علموں! آج کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ کل آپ سب کو عجائب گھر کے اس حصّے کو دیکھنا ہے جس میں افغانستان اور پاکستان کی پشتون ثقافت اور وہاں بسنے والے قبائل کے بارے میں معلومات حاصل ہوں گی''۔

یہ کہہ پروفیسر صاحب اپنا چرمی بیگ ہاتھ میں تھامے کامن روم سے نکل گئے۔

(۵)

رات بھر سیلاب کے تھپیڑوں پر سوار رہنے کے بعد بھاگ بھری زمین پر بے سدھ سوگئی تھی۔ سورج کی پہلی کرن نے اس کے چہرے کو
گدگدایا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ خالد زمین پر لیٹا ابھی تک گہری نیند سو رہا تھا۔ روشنی ہونے کی وجہ سے وہ دیکھ سکتی تھی کہ وہ لوگ ایک پہاڑی کی ڈھلان پر تھے، نیچے تا حدِ نظر پانی ہی پانی تھا۔ پانی کے کنارے جانوروں اور انسانی لاشوں سے اٹے ہوئے تھے۔ بھاگ بھری سے یہ منظر نہ دیکھا گیا تو اس نے خالد کا کندھا ہلا کر اسے جگانے کی کوشش کی۔ وہ فوراً ہی ہڑابڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اُس نے اپنے گردو پیش کا جائزہ لینے کے بعد کہا:

''اندھیری رات میں اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ ہم کس سمت کو بہہ رہے تھے۔ چلو ماں! خشکی کی طرف چلو، کنارے پر موجود لاشوں کے یہ انبار جلد سڑنا شروع ہو جائیں گے۔ ذرا ٹھہرو!'' ''میں جلدی سے فجر کی نماز پڑھ لوں۔ سوتے رہنے کی وجہ سے قضا ہو گئی ہے''۔

یہ کہنے کے بعد اس نے کنارے پر پانی میں تیرتی مری ہوئی بھینس کو پرے دھکیلا تا کہ اس کی پہنچ پانی تک ہو جائے۔ بھینس کو پرے دھکیل کر اس نے وضو کیا اور سورج کی طرف دیکھ کر اندازے سے قبلے کا تعین کر کے نماز کی نیت باندھ لی۔

اسے نماز سے فارغ ہوتا دیکھ کر بھاگ بھری نے کہا:

''تیرا خیال صحیح ہے، ہمیں خشکی کی طرف چلنا چاہئے، چل! بیٹا تیری ماں کے پیروں کو چلنے کی عادت ہے''۔

خالد نے اندازے سے ایک سمت کا تعین کرنے کے بعد چڑھائی کی سمت چلنا شروع کر دیا۔ یہ رستہ

پتھریلا تھا لیکن کہیں کہیں جنگلی درخت اور جھاڑیاں نظر آجاتی تھیں۔ بھاگ بھری ننگے پاؤں چل رہی تھی اس کو جا بجا زمین پر موجود نوکدار کنکروں سے بچ کر چلنا پڑ رہا تھا، اسلئے اس کے چلنے کی رفتار کافی سُست تھی ۔اچانک اس کی نظر جنگلی بیروں کی جھاڑی پر پڑی۔

اس نے وہیں رک کر خالد کو پکارا:

''پتر ساون! ذرا ادھر آ''۔

خالد ماں کی آواز سن کر آیا اور اس نے جھنجھلا کر کہا:

''ماں کتنی دفعہ تم کو کہا ہے کہ میرا نام خالد ہے، خالد خراسانی تم مجھ کو ساون نہ پکارا کرو''۔

بھاگ بھری نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا:

''اچھا پتر! کوشش کروں گی پر یہ مشکل نام ...خا...خا۔خر۔خر...خراسانی میرے منہ سے نکلتا نہیں ہے ۔تیرے مولبی صاحب کو کوئی آسان نام رکھنے کو نہیں ملا تھا؟''۔

خالد نے بات کو وہیں ختم کرتے ہوئے کہا:

اچھا! کہو کیا کہنا چاہتی تھیں تم؟''

بھاگ بھری نے کہا:

''پتر! اپنا بنیان اتار کر دے''۔

خالد نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پہلے اپنا کُرتا اتارا اور پھر نیچے پہنا ہوا بنیان اُتار کر ماں کو دے دیا۔

بھاگ بھری نے بنیان کو بیری کی جھاڑی کے پاس بچھاتے ہوئے کہا:

''کیا معلوم! کھانے کو روٹی کب نصیب ہو۔چل! میرے ساتھ بیر تڑوا۔ان جنگلی بیروں کو کھانے سے جسم میں طاقت آتی ہے اور پیاس بجھتی ہے۔یہاں دُور دُور تک کوئی آبادی نہیں ہے''۔

خالد نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا:

ماں! تمھیں یہ بات اتنے یقین سے کیسے معلوم؟''۔

بھاگ بھری نے بڑے یقین سے کہا:

"دیکھ بیٹا! یہ جھڑ بیری کے پیڑ بکریوں کا من بھاتا کھاجا ہیں۔ دیکھ ذرا! اس جھاڑی کو، کیسے بیروں سے لدی ہوئی ہے!۔ دوسری بات یہ کہ سارے رستے میں بکری کی مینگنیوں کے بھی کوئی نشان نہیں ملے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں آس پاس کوئی آبادی نہیں ہے"۔

خالد نے ماں کی ذہانت سے مرعوب ہوکر پکے پکے بیر زمین پر بچھے ہوئے بنیان پر جمع کرنا شروع کردئے۔

ماں اور بیٹا سارا دن چلتے رہے۔ اگر بھاگ بھری نے رستے کے لئے بیر نہ جمع کئے ہوتے تو ان کا بھوک و پیاس سے برا حال ہو جاتا۔ پیاس تو ان دونوں کو اِس وقت بھی ستا رہی تھی لیکن وقفے وقفے سے کھٹے میٹھے بیروں کی جگالی کرنے سے بھوک پیاس وقتی طور پر دب جاتی تھی۔ جب چلتے چلتے سارا دن گزر گیا تو اِن دونوں کو بھوک نے ستانا شروع کردیا۔

خالد نے ماں کو مخاطب کرتے ہوئے ایک طرف اشارہ کرکے کہا:

"یہ جگہ ہموار ہے، یہاں رات گزارتے ہیں، صبح اٹھ کر کسی بستی کو تلاش کریں گے۔ تاکہ کھانے کو کچھ مل سکے۔

ماں نے خالد کی بات پر اثبات میں سر ہلا کر زمین سے پتھر اور لکڑیوں کے خشک ٹکڑے ہٹانا شروع کر دئے۔ زمین کو صاف کرنے کے بعد وہ وہاں پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔

بھاگ بھری نے خالد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"تو کھڑے کھڑے کیا سوچ رہا ہے؟۔ چل ذرا! استا لے، تھکے ہوئے انسان کا دماغ اچھی طرح سوچنے کے قابل نہیں ہوتا"۔

خالد ماں کے کہنے پر بیٹھ گیا مگر وہ مسلسل کسی سوچ میں گم تھا۔

ماں نے دوبارہ اس سے پوچھا:

"پُتر! کسی سوچ میں گم ہے؟"۔

خالد نے جواب میں کہا کہ:

"ماں! تم نہیں سمجھ پاؤ گی۔۔۔ مجھ پر غزوہ ہند کی کمان کی ذمہ داری ہے۔ مجھے قاری صاحب نے بتایا

تھا کہ حضرت ابو ہریرہ کو آنحضرت نے خود غزوۂ ہند کے برپا ہونے کی بشارت دی تھی۔ غزوۂ ہند ایک حقیقت ہے۔ اس سرزمین پر ہر طرف کالے جھنڈے لہرائیں گے۔ میں یہ کالے جھنڈے ہر سو لہراتے ہوئے دیکھ رہا ہوں''۔

بھاگ بھری نے بیٹے کی بات سن کر کہا:

''ہزاروں لاشوں کو پانی میں بہتے ہوئے دیکھ کر تو یقین آتا ہے کہ بستی بستی اور گھر گھر سوگ کے سیاہ جھنڈے لہرائیں گے اور ماتم ہوگا''۔

خالد نے جھنجھلاتے ہوئے کہا:

''ماں میں اُن کالے جھنڈوں کی بات کر رہا ہوں جو ہم مجاہدین اللہ کی توفیق سے سندھ سے لے کر ہند تک لہرئیں گے''۔

بھاگ بھری نے ترکی بہ ترکی جواب میں کہا:

''یہ تمہارے اللہ کو کالے رنگ کے ہی جھنڈے کیوں پسند ہیں؟، یہ تو سوگ کا اور غم کا رنگ ہے''۔

خالد نے جواب میں کہا:

''ماں! تم نہیں سمجھو گی۔۔۔ خدا کے حکم پر کوئی دلیل نہیں ہوتی بس مجاہدین کو غلبہ کی بشارت سنائی گئی ہے''۔

بھاگ بھری نے بلا سوچے جواب میں کہا:

''میں تو ایک بات سمجھتی ہوں کہ صبح سے جنگلی بیر کھا کر پیٹ بھرا ہے۔۔ خالی پیٹ انسان دنیا میں کچھ نہیں کرسکتا''۔

خالد کو ماں کی یہ بات خاصی بری لگی۔

اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے ماں کو سینہ ٹھوکتے ہوئے یوں جواب دیا:

ماں! تیرے اس بیٹے نے کئی کئی روز ایک سوکھی روٹی کھا کر جنگ لڑی ہے۔

میں بھوک سے ڈرنے والا نہیں''۔

بھاگ بھری نے حیرانی سے سوالیہ انداز میں کہا:

''مجھے سمجھ نہیں آتا کہ تو لڑنے پر اتنے فخر کیوں کرتا ہے؟''۔

خالد نے سمجھانے والے انداز میں ماں کو کہا:

''ماں! اللہ نے اپنی راہ میں لڑنے والوں کو فضیلت دی ہے''۔

بھاگ بھری نے سوالیہ انداز میں کہا:

''تمہارا اللہ نہ ہوا کسی ملک کا راجا ہوگیا! جو ہر طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا ہو''۔

''ماں! یہ کافر ہندو خدا کے دشمن ہی ہیں''۔

بھاگ بھری نے سوال کیا:

''پتر! ذرا سوچ کر بتا!، میں ہندو ہوں اور تو نے سارا بچپن ایک ہندو بچے کی طرح میرے ساتھ گزارا تھا، ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر بتا نا کہ ہم نے کب اللہ سے دشمنی کی تھی؟۔ ہم سے دشمنی تو اللہ کا نام لینے والوں نے کر رکھی تھی۔ اور سن! بھلا انسان کی کیا مجال کہ اس کی پہنچ بھگوان تک ہو سکے اور وہ اس کا کچھ بگاڑ سکے''۔

خالد نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا:

''ماں! تم تعلیم نہ پا سکیں اس لئے تم کو یہ باتیں سمجھ نہیں آسکیں گی''۔

بھاگ بھری نے کہا:

''اچھا ان مشکل باتوں کو چھوڑ!، میں ابھی آتی ہوں''۔

یہ کہہ کر وہ اپنی حاجت دُور کرنے پہاڑی کی چوٹی کی طرف چلی گئی۔

کچھ دیر کے بعد وہ دور سے چلاتی ہوئی آئی:

''روشنی نظر آرہی ہے۔۔۔۔روشنی نظر آرہی ہے''۔

''پتر! ذرا ادھر آ دیکھ تو نیچے پہاڑی کے دامن میں کچھ روشنیاں ہیں۔ جیسے کچھ گھروں میں دیئے جل رہے ہوں''۔

خالد دوڑ کر چوٹی پر پہنچ گیا۔ وہاں جا کر اس نے دیکھا تو دل میں کہا:

''ماں واقعی سچ کہ رہی ہے، نیچے پہاڑی کے دامن میں کوئی بستی ہے''۔

خالد نے خوشی سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

دیکھ ماں! کبھی کبھی تاریکی بھی انسان کو رستہ سجھا دیتی ہے۔ اِس گھپ اندھیرے نے ان ننھے ننھے ٹمٹماتے چراغوں کو ہمارا رہنما بنا دیا ورنہ نجانے ہم کب تک بھٹکتے رہتے"۔

بھاگ بھری کہا:

"چل! اب آرام کر لے، صبح سویرے ان روشنیوں کی سمت چلیں گے"۔

ماں کی بات سن کر خالد اس کے ہمراہ ہموار سطح کی طرف چل دیا جو ماں نے سونے کیلئے صاف کی تھی۔

(۶)

دیکھنے میں پاکستان کا دارالحکومت اسلام آباد صحیح وسالم تھا لیکن بجلی نہ ہونے سے شہریوں کے گھروں میں پانی نہیں آسکتا تھا۔ موبائل فون کا نظام ختم ہو چکا تھا۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی نشریات ممکن نہ رہی تھیں دارالحکومت کا رابطہ ملک کے دیگر حصوں سے بمشکل محدود پیمانے پر کبھی کبھی فوجی ٹرانسمیٹرز کے ذریعے ہوتا تھا۔ اسلام آباد کے پیٹرول پمپز پر عام افراد کو ایندھن کی فروخت پر پابندی لگا دی گئی تھی، کیونکہ سڑکیں ٹوٹ جانے اور ریل کی پٹریاں بہہ جانے سے کراچی کی بندرگاہ سے ایندھن کی ترسیل ممکن نہ رہی تھی۔ دارالحکومت میں بائی سائیکل کی دکانوں سے دیکھتے ہی دیکھتے سارا اسٹاک ختم ہو گیا تھا۔ اب شہر میں گھوڑا گاڑی، گدھا گاڑی، بیل گاڑی اور بائی سائیکل ہی نقل وحمل کا ذریعہ تھا۔ صرف حکومتی اداروں سے وابستہ افراد ہی موٹر گاڑیاں استعمال کر سکتے تھے۔

شہر سے اشیاء خورد ونوش بہت تیزی سے غائب ہو رہی تھیں۔ دکانداروں نے قیمتیں بڑھا دی تھیں پھر بھی گاہکوں کی تعداد میں کوئی کمی واقع نہیں ہو رہی تھی۔ مالدار لوگوں نے منہ مانگے دام دے کر کھانے کی اشیاء کو ذخیرہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ملک کے دیگر حصّوں سے اشیائے صرف کی سپلائی بند ہو جانے کی وجہ سے دکانوں کے شیلف تیزی سے خالی ہونا شروع ہو گئے تھے۔ روُپے کی قدر تیزی سے گرنے کی وجہ سے روٹی عام آدمی کی پہنچ سے دوُر ہوتے جا رہی تھی۔ شہر میں درجہ حرارت کے بڑھنے اور بجلی کے نہ ہونے سے بوڑھوں اور بچوں کی اموات میں اتنی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا، لوگوں نے مرُدوں کو اجتماعی قبروں میں دفن کرنا شروع کر دیا تھا۔

(۷)

دارالحکومت اسلام آباد میں ملک پر ٹوٹ پڑنے والی اس غیر متوقع افتاد سے نمٹنے کے لئے ایک اہم اجلاس طلب کرلیا گیا تھا۔ اس اجلاس میں امدادی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جانا تھا۔

چیف سیکریٹری نے میٹنگ کا آغاز ان الفاظ سے کہا:

''عزیز افسران!، وطنِ عزیز پر آفت کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ ہمیں موجودہ صورتحال سے متعلق کچھ تصاویر ائرفورس کے تعاون سے اور کچھ امریکن سفارت خانہ کے ذریعے سے موصول ہوئی ہیں۔ میں یہ تصاویر آپ تمام ساتھیوں کو دکھانا چاہوں گا تا کہ آپ کو تازہ ترین صورتحال سے آگاہی حاصل ہو سکے''۔

یہ کہنے کے بعد چیف سیکریٹری نے سلائیڈز کی مدد سے تصاویر دکھانا شروع کر دیں۔ کچھ تصاویر پہاڑی علاقوں میں دریاؤں کی سرکشی کو واضح کر رہی تھیں۔ دریا پہاڑی دروں میں اوپر تک چڑھ آیا تھا۔ چیف سیکریٹری نے یہ تصاویر دکھانے کے بعد کہا:

''شمالی علاقوں کی تاریخ میں دریا کبھی اتنا بلند نہیں دیکھا گیا ہے۔ اب دیگر تصاویر مختلف ڈیمز اور بیراجوں کی ہیں جو کہ پانی کا دباؤ نہ سہنے کی وجہ سے تباہ ہو چکے ہیں''۔

یہ کہہ کر چیف صاحب نے ہر تصویر کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔

ان تفصیلات کو بتانے کے بعد انہوں نے کہا:

''اور اب ایک آخری تصویر جو دیکھنے میں شاید اتنی ہولناک نہ ہو۔ یہ فضائی تصویر دریائے سندھ پر چشمہ سے تقریباً تیس کلومیٹر دور چشمہ بیراج سے نکلنے والی ایک نہر پر بنے ہوئے ''چشمہ نیوکلئیر پلانٹ'' کی ہے۔ یہ کہنے کے بعد چیف صاحب نے تباہ ہو جانے والے پلانٹ کی کچھ اور تصاویر دکھانے کے بعد کہا کہ:

''چینی انجینئرز کے خواب وخیال میں بھی نہ ہوگا کہ دریائے سندھ اتنا سرکش بھی ہو سکتا ہے۔ خوفناک

خبر یہ ہے کہ تابکار ایٹمی مواد اس تباہ شدہ پلانٹ سے مسلسل بہہ رہا ہے۔ پانی اور فضا میں تابکاری کا درجہ بڑھتے جا رہا ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی کی نشریات بند ہو جانے کی وجہ سے ہم علاقے کے لوگوں کو خبردار کرنے میں ناکام ہیں۔ ہمیں کسی نہ کسی طرح لوگوں کو مطلع کرنا ہے کہ وہ یہ علاقہ فوری طور پر چھوڑ دیں۔ اگر وہاں پر رہنے والے لوگوں نے نقل مکانی نہیں کی تو وہاں کے افراد کی ایک بڑی تعداد تھائیرائیڈ کینسر میں مبتلا ہو سکتی ہے۔ جہاں جہاں یہ آلودہ پانی جائے گا وہاں اگنے والی فصلوں میں ایٹمی آئسوٹوپ منتقل ہو جائیں گے، یہاں تک کہ مویشیوں کا دودھ تک پینے کے قابل نہ رہے گا۔ ہمیں اِس پلانٹ سے کم از کم پانچ سو کلو میٹر تک کے رقبے سے لوگوں کو نکلنے پر آمادہ کرنا ہوگا۔''

میٹنگ میں شریک تمام سیکریٹریز کو تباہی کی یہ تصاویر دیکھ کر سانپ سونگھ گیا تھا۔

چیف سیکریٹری نے خاموش توڑتے ہوئے کہا:

''اب آپ حضرات اپنی گزارشات پیش کر سکتے ہیں۔ آج سیکریٹری دفاع اور ڈائریکٹر ڈیزاسٹر مینجمنٹ کی گزارشات نہایت اہم ہیں تاہم سیکریٹری مواصلات کو بھی چیلنج درپیش ہے۔ ہم ایک زندہ قوم ہیں اور ہم کو ایک زندہ قوم رہنے کے لئے ایک بڑی جدوجہد سے گزرنا ہوگا''۔

مندرجہ بالا کلمات گوش گذار کرنے کے بعد چیف سیکریٹری خاموش ہو کر دیگر سیکریٹریز کی طرف دیکھنے لگے۔ سیکریٹری دفاع نے اپنی جیب سے ایک یو ایس بی اسٹک نکال کر اپنے ایک ماتحت کو دی۔ اس نے کمپیوٹر میں اسٹک کو لگانے کے بعد کچھ تصاویر کی سلائیڈز دکھائیں۔ ان تصاویر میں دکھایا گیا تھا کہ فوجی جوان ایک گھر کی چھت پر محصور کسی خاندان کو محفوظ مقام پر منتقل کر رہے ہیں۔

اس تصویر کو دکھانے کے بعد وزیر دفاع نے کہا:

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اعلیٰ افسران اور ان کے اہل خانہ کو خصوصی طور سے پہلے بچایا جائے۔ اگر ہم افسران اور ان کے اہل خانہ کو نہ بچا پائے تو اِس مُلک کو تباہی سے کون بچائے گا؟''۔

سیکریٹری ویلفیئر نے کچھ کہنے کے لئے ہاتھ کھڑا کیا! سیکریٹری دفاع نے ان کی طرف ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا:

''فرمایئے! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''۔

سیکریٹری ویلفیئر نے کہا:

''آپ افسران کو بچانے میں وقت اور وسائل خرچ کرنے کے بجائے فوج کے گوداموں میں موجود ربڑ کی کشتیوں کو مختلف علاقوں میں ہیلی کاپٹروں سے پھینکوائیں، آپ سن لیں کہ یہ ملک عوام نے بنایا تھا، وہی بچا سکتے ہیں۔ آپ یہ بات بھی نہ بھولیں کہ جس خوفناک تباہی سے یہ خطہ دوچار ہے وہ ایک افسر کی ہٹ دھرمی اور اس کے غیر قانونی اقدام کا ہی نتیجہ ہے''۔

چیف سیکریٹری نے سیکریٹری ویلفیئر کی گفتگو میں دخل اندازی کرتے ہوئے کہا:

''یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔۔۔۔ان حالات میں ہم اپنے حساس اداروں پر انگلی نہیں اٹھا سکتے۔ ان اداروں کے دم سے ہی یہ وطن قائم و دائم ہے''۔

سیکریٹری ویلفیئر نے جواب میں کہا:

''قائم ہے؟''۔

جناب! وطن ٹوٹ چکا ہے۔ ایک علاقے کا دوسرے علاقے سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ رہی بات انگلی اٹھانے کی۔۔۔تو ہم انگلی کیوں نہیں اٹھا سکتے ہیں؟ اس لئے کہ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں ہیں؟ کم آن!۔ بہت ہوگیا۔ بس بہت ہوگیا۔ ہمارے بہت سے لائق ساتھی۔۔۔جن میں سے کئی نے تو دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں سے پی ایچ ڈی کیا ہے وہ میٹرک اور انٹر پاس فوجی افسران کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے پر مجبور کردئے جاتے تھے۔ ان کے دماغوں پر پہرے لگا دیئے جاتے تھے کہ وہ نہ تو ایک حد سے آگے سوچ سکیں اور نہ ہی اپنی زبان کھول سکیں۔ فوجیوں کے احساسِ برتری اور غیر متوازن اختیارات نے سول سروس کو ایک اعلیٰ درجے کے

کلرکوں کے کلب میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ اگر فوجی اور سول سروسز میں توازن ہوتا تو یہ عذاب شاید کبھی نازل نہ ہوتا''۔

سیکریٹری ویلفیئر کی مختصر تقریر سن کر سیکریٹری دفاع خاموش ہوگئے۔

سیکریٹری ویلفیئر نے انہیں خاموش دیکھ کر مزید کہا کہ:

''آپ فوجی ہیلی کاپٹرز کو چشمہ کے علاقوں میں پرواز کروا کر ان کے ذریعے اعلانات کروائیں تاکہ

لوگ چشمہ اور میانوالی کے علاقوں سے نکلنا شروع ہو جائیں۔ حالانکہ سچ تو یہ ہے یہ غالباً سیلاب کا سارا پانی ہی تابکاری سے آلودہ ہے"۔

سیکریٹری دفاع نے بالآخر اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا:

"آپ کی تجویز اپنی جگہ۔۔۔۔ شاید آپ کو اندازہ نہیں کہ ہیلی کاپٹر کی آواز اتنی بلند ہوتی ہے کہ ان سے ہونے والے اعلانات کو کوئی بھی سن نہیں پائے گا۔۔۔۔ مجھے معذرت سے کہنا پڑے گا کہ آپ کی تجویز قابل عمل نہیں"۔

سیکریٹری ویلفیئر نے فوراً ہی ان کو جواب دیتے ہوئے کہا:

"آپ انجینئرز سے کہیں کہ ہیلی کاپٹرز کو بہت بلندی پر ساکت رکھیں، اور ہیلی کاپٹر سے رسی کے ذریعے طاقتور لاؤڈ اسپیکرز کو نیچے لٹکائیں۔ آپ کو مسجدوں سے ہزاروں لاؤڈ اسپیکرز اور ایمپلی فائرز مل جائیں گے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ سول سروس میں آنے سے پہلے میں نے الیکٹریکل انجینئرنگ میں سارے صوبے میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی"۔

سیکریٹری ویلفیئر کی تجویز کو دیگر سیکریٹریز نے سراہا تو ان کی تجویز کو مجبوراً سیکریٹری دفاع منظور کرنے پر تیار ہو گئے۔ اس تجویز کی منظوری کے بعد چیف سکریڑی نے سیکریٹری مواصلات کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"سب سے زیادہ تباہی آپ کے محکمہ پر آئی۔۔۔۔ آپ یقیناً کچھ کہنا چاہیں گے"۔

سیکریٹری مواصلات نے مایوس لہجے میں کہا:

"تباہی شاید چھوٹا لفظ ہے! نہ سڑکیں ہیں، نہ پل، نہ ریلوے سلامت ہیں، نہ ہوائی اڈے اور نہ ٹیلی فونک رابطے۔ اقوام متحدہ کی طرف سے ایک تجویز آئی ہے۔ وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

کئی ساتھی افسران نے انہیں خاموش دیکھ کر دریافت کیا:

"کیا تجویز آئی ہے اقوام متحدہ کی طرف سے؟"۔

سیکریٹری مواصلات نے جواب میں کہا:

"اقوام متحدہ چھوٹے چھوٹے ریڈیو سیٹ فضا سے تمام ملک میں پھینکنا چاہتا ہے۔ ان ریڈیو کی بیڑی پانچ سے دس سال تک کارآمد ہوگی۔ اقوام متحدہ ہوا میں تیرتے ہوئے ڈرونز طیاروں کی مدد سے مقامی

زبانوں میں پروگرامز نشر کرنے میں مدد دے گی۔ تاکہ عوام کو ضروری ہدایات جاری کی جاسکیں اور ان سے رابطہ ممکن ہوسکے"۔

چیف سیکریٹری کا اسٹاف اس میٹنگ کی کاروائی کو لکھنے میں مشغول تھا۔ وہ چیف صاحب کے اشاروں سے سمجھ جاتے تھے کہ کس تجویز کو لکھنا ہے اور کس کو نہیں۔

چیف سیکریٹری نے ایک ذرا توقف کے بعد سیکریٹری اقتصادی امور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"آپ بالکل خاموش ہیں"۔

سیکریٹری اقتصادی امور نے اپنے خیالوں سے نکلتے ہوئے کہا:

"جی!۔۔۔۔جی۔۔۔۔میں بھی یقیناً کچھ کہنا چاہتا ہوں"۔

چیف صاحب نے کہا:

"جی فرمائیے!"۔

سیکریٹری خزانہ نے اپنا چشمہ ناک پر ٹکاتے ہوئے کہا:

"جناب! روپے کی قیمت بہت تیزی سے گر رہی ہے۔ خبریں یہ ہیں کہ بہت سے علاقوں میں لوگ روپے کے بجائے سونے چاندی اور دیگر قیمتی اشیاء کے عوض اجناس کا تبادلہ کر رہے ہیں ہمیں عالمی برادری سے اپیل کرنی چاہیے کہ پاکستان پر سے سفر کی پابندیاں ہٹالی جائیں تاکہ زرِ مبادلہ کی ترسیل میں آسانی ہوسکے"۔

چیف سیکریٹری نے سیکریٹری اقتصادی امور کی گذارشات سننے کے بعد کہا:

اب آخر میں ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی کے سربراہ اپنی رپوٹ پیش کریں گے۔ اس میٹنگ کے فوراً بعد مجھے وزیراعظم صاحب کو سفارشات پیش کرنا ہیں، وہ کل ہونے والی کابینہ میٹنگ میں اراکین کابینہ کو امدادی کاموں کی تفصیلات سے آگاہ کرسکیں۔ آپ سب سے کل دوبارہ ایک تفصیلی میٹنگ ہوگی، جس کا ایجنڈا آپ کو کچھ دیر میں مل جائے گا۔ آپ سب سے گذارش ہے کہ کم سے کم بجلی خرچ کریں۔ بہتر ہے کہ ایک کمرے میں چار سیکریٹریز بیٹھیں۔ اگر پٹرول کی مزید رسد نہ آسکی تو شاید ہم جنریٹر چلانے کے قابل بھی نہ رہیں۔ اب میں اس میٹنگ کا اختتام کرتا ہوں اور ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی کے ڈائریکٹر کو اپنی رپورٹ پیش کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اللہ پاکستان کی حفاظت کرے!، آمین!۔

(۸)

دہرادون ملٹری بیس میں ہونے والے ہندستانی کابینہ کے اجلاس میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ تمام وزراء اور حزب مخالف کے رہنما فوجی جوانوں کے ساتھ ہندوستان کی مختلف آفت زدہ ریاستوں کی امدادی مہم میں ہاتھ بٹائیں گے۔ اِن تمام سیاسی رہنماؤں کا کام ہوگا کہ وہ ہمت بندھانے والی تقاریر کر کے عوام کو اِس آفت سے لڑنے پر آمادہ کریں گے۔ نیتا مکرُجی کے حصّے میں ریاست بہار کا علاقہ آیا تھا، جہاں زیر آب علاقوں میں ان کو تقاریر کرنا تھیں۔ ان کو اپنی تقاریر کے ذریعے عوام کو تابکاری کے اثرات اور ان سے بچنے کے طریقے بھی بتانا تھے۔ اُن کو بتانا تھا کہ یہ سیلابی پانی عام سیلابی پانی نہیں ہے، یہ پانی تابکاری سے آلودہ ہے۔ نیتا جی کا خون اس خوف سے منجمد ہوئے جا رہا تھا کہ اُن کو تابکاری سے آلودہ پانی میں کئی روز سفر کرنا تھا۔ کل صبح انہیں فوجی جوانوں کی ایک پلٹن کے ساتھ ہیلی کاپٹر میں بہار کے دُور دراز علاقے میں پرواز کرنا تھی۔ ہیلی کاپٹر میں سوار ہونے کے خیال سے ہی ان کا مثانہ خوف کے مارے پیشاب سے بھر جاتا تھا۔

ریاست بہار کو کم وبیش ہر سال مؤن سون کی بارشوں کے دوران سیلابوں کا سامنا کرنا ہوتا تھا۔ کوشی دریا اپنے دیگر سات معاون دریاؤں کے ساتھ مل کر نیپال اور تبت کے پہاڑوں کی زرخیز مٹی سیلابی پانی میں بہا کر بہار کے میدانوں کی زرخیزی کو بڑھا دیتے تھے۔ اِن دریاؤں

سے آنے والا پانی اتنا ہوتا تھا کہ گنگا کے پیٹ میں نہیں سما پاتا تھا۔ تقریباً ہر سال میدانی علاقے کے لوگ بارش کے موسم میں سیلاب سے بچنے کے لئے کچھ نہ کچھ انتظام اپنے طور پر کر لیتے تھے۔ لیکن اِس بار علاقے کے سب لوگ حیرت میں مبتلا تھے کہ بارش کا ایک قطرہ بھی نہ برسا تھا اور کوشی دریا ایسے بپھرا تھا کہ پانی کے پہاڑ نے کوشی بیراج کو تنکے کی طرح بہا دیا تھا جبکہ مزخا بیراج مٹی کے گھروندے کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ آدھے سے زیادہ بہار دیکھتے ہی دیکھتے ڈوب گیا تھا۔

ضلع مظفر پور اور بھاگل پور بہار کے دیگر اضلاع کی طرح آفت کا شکار تھے۔ ہندوستانی فوج کے جوانوں نے اِن اضلاع میں اونچی جگہوں پر خشک اجناس اور پینے کے قابل پانی کا کچھ ذخیرہ کرنے میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔ ہندوستانی سرکار کو بڑا مسئلہ یہ درپیش تھا کہ اناج کی بیشتر ذخیرہ گاہیں پانی میں گھر گئی تھیں۔ وہاں سے اناج کو ہیلی کاپٹروں کے ذریعے منتقل کرنا اتنا آسان نہ تھا۔

صبح کے تین بجے ایک فوجی جوان نے نیتا جی کو جگاتے ہوئے کہا:

''اٹھ جائیں! صبح ہوگئی ہے۔۔۔ مشن کی تیاری کرنا ہے۔نیتا جی نے دیوار پر لگی گھڑی کی چمکتی ہوئی سوئیوں کو دیکھتے ہوئے کہا:

''ابھی تو رات کے تین بجے ہیں''۔

فوجی جوان نے جواب میں کہا:

''سر!۔۔۔فوجیوں کی صبح تین بجے شروع ہو جاتی ہے''۔

نیتا جی نے ناگواری سے کہا:

''اچھا! تم چلو میں ہال میں آتا ہوں''۔

یہ کہہ کر نیتا جی اپنے بستر سے اٹھ کر ہال میں چلے آئے وہاں فوجی جوان امدادی مشن کی تیاری میں مصروف تھے۔

ایک جوان نے نیتا جی کو ہال میں آتے ہوئے دیکھ کر انہیں کہا:

''نمسکار! نیتا جی!۔۔۔آپ فوراً نہا کر ہمارے ساتھ ناشتہ کرلیں۔ ہمارا مشن خاصا کٹھن ہے۔۔۔نہ جانے کب دوبارہ نہانا نصیب ہو۔

نیتا جی یہ سن کر سر ہلاتے ہوئے مشترکہ غسل خانوں کی طرف مڑ گئے۔انہوں نے جلدی جلدی غسل کیا اور میس کی طرف چل دیئے، جہاں سب کے لئے ناشتہ میز پر لگ چکا تھا۔

انگریزی طرز کا ناشتہ کرتے ہوئے وہ سوچنے لگے:

''رام نہ کرے کہ یہ اُن کی زندگی کا آخری ناشتہ ہو''۔

ایک فوجی جوان جو شاید ان پر نظر گاڑے ہوئے بیٹھا تھا، ان کو ناشتہ ختم کرتے ہوئے دیکھ کر بولا:

''نیتا جی! آپ میرے ساتھ چلیں آپ کو تیار کرانا ہے''۔

نیتا جی نے دل میں سوچا:

''کیا میری بارات جانی ہے جو مجھے دؤلہا کی طرح تیار کروانا ہے''۔

فوجی جوان نے ان کو خیالوں میں کھوئے ہوئے دیکھ کر کہا:

''نیتا جی جلدی کریں، فوج میں ہر کام وقت پر کرنا ہوتا ہے''۔

نیتا جی فوجی کی بات سن کر خیالوں سے نکل کر جوان کے پیچھے چل پڑے۔ وہ ان کو ایک مخصوص کمرے میں لے آیا جہاں سلیقے سے وردیاں اور دوسرا سامان دیواروں پر ٹنگا ہوا تھا۔ اس نے نیتا جی کے ناپ کے مطابق ایک واٹر پروف ڈانگری انہیں پہننے کو دی۔ انہوں نے ڈانگری پہنتے ہوئے کہا:

''بھیا! یہ تو خاصی گرم ہے''۔

فوجی جوان نے جواب میں کہا:

''جی! گرم تو ہے پر آپ کو اسے پہننے کی عادت ہو جائے گی تو گرم نہیں لگے گی۔ اگر آپ اس کو نہیں پہنیں گے تو آپ کے جسم کو سیلابی پانی چھو سکتا ہے۔ جس سے آپ کو جلدی کینسر ہونے کا فوری خطرہ ہے اور اگر یہ پانی حلق سے اتر جائے تو دیگر اقسام کے کینسر بھی پیدا ہو سکتے ہیں''

نیتا جی نے یہ سن کر دل میں سوچا:

''مجھے معلوم ہوتا کہ ایٹمی ہتھیار اتنے خطرناک ہیں تو میں کبھی بھی ان کو تیار حالت میں لانے کی مانگ نہ کرتا''۔

فوجی جوان کی باتیں سن کر خوف کے مارے اُن کو پیشاب آنے لگا۔

انہوں نے فوجی جوان سے پوچھا:

''بھیا! کیا میں ذرا پیشاب کر سکتا ہوں؟''۔

فوجی جوان نے جواب میں کہا:

جائیے! جلدی کریں!۔

نیتا جی آدھی کھلی ہوئی ڈانگری میں اٹکتے ہوئے پیشاب کرنے چلے گئے۔

پیشاب کرتے ہوئے وہ سوچنے لگے:

''اگر اس ٹوائلٹ میں کوئی کھڑکی ہوتی تو یہاں سے بھاگ نکلنا ہی بہتر تھا''۔

وہ پیشاب کر کے باہر آئے تو ایک جوان نے ان کے وجود کو ڈانگری میں فٹ کرنے میں اُن کی مدد کی۔
ایک اور فوجی جوان نے اُن کے بھاری بھرکم وجود پر لائف جیکٹ کستے ہوئے کہا:

''جناب! سیلابی ریلوں میں کشتیاں اکثر الٹ جاتی ہیں آپ اطمینان رکھیں۔ یہ جیکٹ آپ کو ڈوبنے نہیں دے گی۔'' فوجی کی بات سن کر نیتا جی کا حلق خوف کے مارے خشک ہو گیا تھا۔ سب فوجی جوان امدادی مشن کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ اُن سب نے قطار میں کھڑے ہو کر اپنے کمانڈر کے احکامات سنے، اور پھر ایک ایک کر کے ہیلی کاپٹر میں سوار ہو گئے۔ ایک فوجی نے نیتا جی کو ہیلی کاپٹر میں چڑھنے میں مدد دے کر ان کو بھی سوار کرا دیا۔

(۹)

خالد کی آنکھ صبح ہونے سے پہلے ہی کھل گئی تھی۔ جیسے ہی ہلکی ہلکی روشنی نمودار ہوئی اس نے اندازے سے کعبہ کے رُخ کا تعین کر کے نیت باندھ لی۔ نماز ختم کرنے کے بعد اس نے با آواز بلند یوں دعا مانگی:

''اے میرے اللہ! تو نے مجھ ناچیز کو اپنا دین اس سرزمین سندھ وہند پر نافذ کرنے کو منتخب کیا ہے، تو مجھے اس راہ پر ثابت قدم بھی رکھنا!

مجھے طاقت وہمت عطا کرنا!، یہاں تک کہ میں تیری خلافت کے جھنڈے اس خطے پر نہ لہرا دوں''۔

یہ دعا مانگ کر اس نے خشوع وخضوع سے اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرے۔ اب روشنی کافی پھیل چکی تھی۔ وہ پہاڑی کی چوٹی کی طرف چل پڑا تا کہ وہاں سے وادی کا جائزہ لے سکے۔ اس نے چوٹی پر پہنچ کر نیچے نظر دوڑائی تو اسے وادی کے اُس پار کچھ کچے گھر نظر آئے جن کی چمنیوں سے اٹھتا ہوا دھواں ظاہر کر رہا تھا کہ وہاں یقیناً کچھ لوگ ضرور رہتے ہیں۔ نیم پتھریلے علاقے میں پہاڑیوں کے بیچ میں پوشیدہ یہ چھوٹی سی سرسبز وادی ایک تپتے ہوئے ریگزار میں نخلستان کی مانند تھی۔ وہ پہاڑی کی چوٹی سے نیچے آیا تو بھاگ بھری جاگ چکی تھی۔

اس نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''ماں! مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں تم کو مسلمان نہ کر سکا پر کم از کم تم اپنے بھگوان سے ہی دُعا مانگ لیا کرو!''۔

بھاگ بھری نے جواب میں کہا:

''پانی میں بے گناہ لوگوں کی میں بہتی ہوئی لاشوں کو دیکھ کر میرا وشواس بھگوان سے اٹھ گیا ہے''۔

خالد نے ماں کی طرف بہت پُر اعتماد نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب میں کہا:

''تمہارا اعتبار تمہارے بھگوان سے اٹھ گیا ہے لیکن میرا یقین میرے اللہ پر اور راسخ ہو گیا ہے''۔

بھاگ بھری نے جھلاّئے ہوئے انداز میں کہا:

''پھر اتنے مُشکل الفاظ۔ یہ راسخ کیا ہوتا ہے؟''۔

خالد نے بھی جھنجھلاتے ہوئے جواب دیا:

''راسخ کا مطلب پکا! میرا عقیدہ اللہ پر اور پکا ہو گیا ہے''۔

بھاگ بھر خالد کی یہ بات سن کر خاموش ہو گئی تو خالد نے مزید کہا:

''ماں! اللہ کے ہر کام میں کوئی بھید اور مصلحت ہوتی ہے''۔

بھاگ بھری نے بلا سوچے سمجھے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

''بھلا! غریب لوگوں اور ان کے گھروں کے پانی میں ڈبونے میں کیا راز ہو سکتا ہے''۔

خالد نے ماں کو تسلّی دینے کے انداز میں کہا:

''ماں! ان انسانوں کو اللہ نے نہیں ڈبویا بلکہ یہ لوگ پہاڑوں میں ایٹمی بم گرنے سے پیدا ہونے والے سیلاب سے مرے ہیں''۔

بھاگ بھری نے حیرت سے کہا:

''کیا یہ خوفناک بم خود بخود گر گئے؟''۔

خالد نے جواب میں کہا:

''میں نے کب کہا ہے کہ بم خود بخود گر گئے؟۔۔۔لیکن جس نے بھی بم گرانے کا حکم دیا ہو گا اس کے دل میں اللہ نے ہی یہ خیال ڈالا ہو گا''۔

بھاگ بھری نے اپنی ہتھیلی خالد کی طرف کرتے ہوئے کہا:

''بس، بس، مجھے ایسے اللہ کی باتیں نہ بتاؤ جو تباہی کے خیالات دل میں ڈالتا ہو۔ تُو کوئی اور بات کر!''۔

بھاگ بھری نے یہ بات کہہ کر گفتگو کا موضوع تبدیل کر دیا۔

خالد نے ماں کا موڈ خراب ہوتا دیکھ کر بات بدلتے ہوئے کہا:

''اچھا! چھوڑ۔۔۔ اچھی خبر ہے۔ آبادی نظر آ گئی ہے تُو تیار ہو جا۔ ہم کو پہاڑی اتر کر وادی کے اُس پار جانا ہے''۔

یہ خبر سن کر بھاگ بھری کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

خالد نے ماں کو خوش دیکھ کر کہا:

''چلو ماں! بس، قدم بڑھاؤ بھوک بہت لگی ہے۔ ان جنگلی بیروں سے پیٹ کی آگ نہیں بجھتی''۔

دونوں ماں بیٹا پہاڑی کی چوٹی کی طرف چل پڑے۔ چوٹی سے نیچے اترنا نسبتاً آسان مرحلہ تھا۔ یہ لوگ کچھ دیر میں چٹانوں اور پتھروں کو سر کرتے ہوئے وادی میں کھجور کے باغات تک پہنچ گئے۔ جیسے ہی ان لوگوں نے باغ کے اندر داخل ہونے کی کوشش کی تو پالتو کتوں نے زور زور سے بھونک کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سن کر باغ کے کے اندر بنے ہوئے کچے گھر سے ایک آدمی باہر نکلا جس نے ہاتھ میں ایک لاٹھی پکڑی ہوئی تھی۔ اس آدمی نے خالد اور بھاگ بھری کو دیکھ کر کتوں کو ان کے نام سے پکارا تو انہوں نے بھونکنا بند کر کے دم ہلانا شروع کر دی۔

اس آدمی نے زوردار آواز میں کہا:

آؤ، آؤ۔۔۔ ست بسم اللہ، اس ویرانے میں کبھی کبھار ہی کوئی مہمان آتا ہے''۔

اجنبی کے منہ سے بسم اللہ سن کر خالد کے دل کو ڈھارس ہوئی اور وہ دونوں اجنبی کی طرف قدم بڑھانے لگے۔

ان کے قریب آنے پر اجنبی نے کہا:

''تم لوگ کیسے یہاں تک آن پہنچے، یہ سارا علاقہ سیلاب کے پانی سے گھر چکا ہے؟''۔

جواب کا انتظار کیے بغیر اُس نے مزید کہا:

''خیر! یہ سب بعد میں بتانا۔ تھکے ہوئے لگتے ہو، پہلے کچھ روٹی ٹکڑ کھالو!''۔

اس دوران اس اجنبی کے گھر کے دروازے پر ایک عورت اور ایک جوان لڑکی بھی آ کھڑی ہوئی۔

اجنبی نے عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''جا! روٹی کا انتظام کر! دیکھتی نہیں مہمان آئے ہیں''۔

وہ عورت یہ سنتے ہی گھر کے اندر چلی گئی گھر کے برآمدے میں پڑی ہوئی چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اجنبی نے خالد اور بھاگ بھری سے کہا:

''تم لوگ یہاں بیٹھو! میں تمہارے لئے پانی لاتا ہوں''

وہ کچھ ہی دیر میں پیتل کے دو بڑے گلاسوں میں پانی لے آیا۔ خالد اور بھاگ بھری نے ایک ہی سانس میں گلاسوں کو خالی کر ڈالا۔ اس دوران اس آدمی کی عورت روٹی لے آئی جس کے اوپر ساگ رکھا ہوا تھا۔ اس عورت کی نوجوان بیٹی نے اپنے دونوں ہاتھوں میں مٹی کے پیالے تھامے ہوئے تھے، جو دودھ سے بھرے ہوئے تھے۔ اجنبی نے عورت سے روٹی لے کر چارپائی پر بیچ میں رکھ دی، جہاں خالد اور بھاگ بھری آلتی پالتی مار کر بیٹھ چکے تھے۔ خالد میزبان کی طرف دیکھے بغیر کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ بھاگ بھری بھی اتنی ہی بھوکی تھی، پر اس نے نوالہ توڑ کر میزبان کی طرف یوں دیکھا کہ جیسے کھانا کھانے کی اجازت مانگ رہی ہو۔

میزبان نے اس کی نظروں کو پہچانتے ہوئے کہا:

''بہن! کس سوچ میں ہو؟ روٹی کھاؤ!''۔

بھاگ بھری نے روٹی کھانا شروع کر دی۔ جیسے ہی ان لوگوں نے روٹی ختم کی تو لڑکی نے دودھ کے پیالے ماں اور بیٹے کی طرف بڑھا دیئے۔

بھاگ بھری نے دودھ کا پیالہ ہاتھ میں تھام کر بہت شفقت سے لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیر کر دودھ کا گھونٹ بھرا، اور آدمی کی طرف دیکھ کر کہا:

''بھگوان تم سب کو خوش رکھے۔ تم کو کبھی سیلاب کا سامنا نہ ہو''۔

سیر ہو کر کھانا کھا کر ان لوگوں کے اوسان بحال ہوئے تو انہوں نے اپنے میزبان کو اپنے سیلاب سے بچنے کی کہانی سنائی۔

ماں بیٹے کی درد بھری داستان سن کر میزبان نے کہا:

''میرا نام اللہ وسایا ہے، یہ میری بیوی اور یہ میری بیٹی ہے۔ ایک بیٹا بھی پیدا ہوا تھا وہ اللہ کے حکم سے زندہ نہ بچ سکا۔ پھر اور کوئی اولاد نہ ہوئی۔ سامنے والا گھر میرے بھائی کا ہے اس کا ایک بیٹا ہے۔ شاید کسی پیر فقیر کی بددعا ہے۔ ہمارے خاندان میں زیادہ بچے پیدا نہیں ہوتے۔ میرا دادا بھی اکیلی ہی اولاد تھا۔ اسی نے

اس دور دراز علاقے میں یہ زمین آباد کی تھی۔ اس کو قبیلے سے باہر شادی کرنے کے جرم میں قوم سے نکال دیا گیا تھا۔

میزبان نے کنویں کی طرف اشارہ کر کے کہا:

''میرے باپ نے بتایا تھا کہ دادا نے یہ کنواں کئی مہینوں کی محنت سے اکیلے کھودا تھا۔ اسی کنویں کے پانی کی برکت سے ہماری زمین آباد ہوئی ہے۔ دیکھو اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ کھجور کی پیداوار بہت اچھی ہے، اونٹ ہیں، بکریاں ہیں اور کیا چاہئے جینے کے لئے۔

میں اپنی گھوڑی پر چاروں طرف کا جائزہ لے کر آ چکا ہوں، چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔ بس تم لوگ یہاں ہی رہنا۔ ویسے بھی ہم لوگ انسانوں کا منہ دیکھنے کو ترستے ہیں''۔

بھاگ بھری نے بہت احسان مندی سے اُس کی بات سن کر کہا:

''بھائی! تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔ ہمارے پاس تمہیں دینے کو کچھ نہیں، پر میں تمہارے ڈھور ڈنگروں کی دیکھ بھال کر سکتی ہوں''۔

میزبان نے جواب میں کہا:

''مہربانی کی کیا بات ہے، انسان ہی انسان کے کام آتا ہے''۔

بھاگ بھری نے اللہ وسایا کے اونٹوں کے گلّے کی طرف دیکھتے ہوئے تعریفی انداز میں کہا:

''تمہارے پاس کتنے سارے خوبصورت اونٹ ہیں''۔

اللہ وسایا نے بڑے فخر سے جواب میں کہا:

''جب میرے دادا نے کنواں کھودا تھا تو وہ شروع میں اپنے بازوؤں کی طاقت سے پانی کو کھینچتا تھا، کچھ فصلوں کے بعد اس نے اونٹوں کی ایک جوڑی خریدی تھی جس سے وہ کھیتوں کو جوتتا تھا اور کنویں سے پانی بھی کھینچتا تھا۔ یہ سارے اونٹ اُسی پہلی جوڑی کی نسل سے ہیں''۔ اس دوران یہ دونوں دودھ پی چکے تھے۔ انہوں نے دودھ کے خالی پیالے اللہ وسایا کی لڑکی کو تھما دیئے۔

اللہ وسایا نے کچھ سوچ کر خالد سے پوچھا:

''پتر! کچھ پڑھے لکھے بھی ہو''؟۔

خالد نے فخر سے یوں جواب دیا:

''جی اردو، عربی اور انگلش پڑھ لیتا ہوں۔ پشتو سندھی اور دری زبان کے علاوہ کشمیری زبان بھی آتی ہے، اللہ کے فضل سے دورہ حدیث بھی مکمل کیا ہے اور قران پاک تفسیر کے ساتھ پڑھا ہے''۔

اللہ وسایا خالد کی قابلیت سے بہت مرعوب ہو گیا تھا۔

اس نے تعریفی انداز میں بھاگ بھری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''بہن! تمہارا پتر تو کوئی بڑا مولبی لگتا ہے''۔

بھاگ بھری نے جواب میں کہا:

''اس نے جوانی مولبیوں میں گذاری ہے تو اس کو مولبی ہی بننا تھا''۔

اللہ وسایا نے اپنے برابر میں رکھے ہوئے ریڈیو کو اٹھا کر خالد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

''تم پڑھے لکھے ہو تو ذرا اس ریڈیو کو صحیح کر دو۔۔ نہ جانے اس میں کیا خرابی ہو گئی ہے۔۔ کل سے بالکل خاموش ہے، بیڑی بھی نئی ہے۔ اسی ریڈیو سے ہم کو سیلاب آنے کی خبریں مل رہی تھیں۔ میری تو عقل کام نہیں کرتی۔ ایک قطرہ بھی بارش کا نہیں برسا تو سیلاب کہاں
سے آ گیا''!۔

خالد نے ریڈیو کا معائنہ کرتے ہوئے کہا:

''چاچا! پہاڑوں پر ایٹم بم گرنے سے برف پگھلنے لگی ہے۔ اس وجہ سے سیلاب آ رہا ہے۔ یہ ریڈیو تو صحیح ہے، سگنل نہیں آ رہے''۔

اللہ وسایا نے کہا:

''جیسے رب کی مرضی۔۔ بس دعا کرو کہ پانی پہاڑی کی چوٹی تک نہ آئے اگر ایسا ہو گیا تو کوئی زندہ نہ بچ پائے گا''۔

خالد نے جواب میں کہا:

''چاچا! فکر نہ کرو، پانی ابھی کافی نیچے ہے''۔

اللہ وسایا کو خالد کی بات سن کر کچھ بے فکری ہوئی تو اس نے خالد سے کہا:

''میں اپنی دھوتی تجھے لا دیتا ہوں، کنویں پر جا کر نہا لے۔ تم لوگ تھکے ہوئے بھی ہو، کچھ آرام کرلو، دن ڈھلنے کے بعد پھر گپ شپ ہوگی۔ اسی بیچ میں اللہ وسایا کی بیوی دو بڑے گلاسوں میں لسّی لے کر آ گئی۔ خالد اور بھاگ بھری نے بہت احسان مندی سے لسّی کے گلاس تھام لئے۔ اللہ وسایا نے کہا:

''یہ بکری کے دودھ کی لسّی ہے۔۔۔ پیو! بہت مزہ آئے گا''۔

بھاگ بھری اور خالد نے یہ سن کر لسّی کا گلاس منہ کو لگا لیا۔

(۱۰)

اس بار ہیلی کاپٹر کا دروازہ بند تھا اس لئے نیتا جی کو کان پھاڑ دینے والے شور کا سامنا نہیں تھا۔ دوران پرواز انہیں احساس ہوا کہ ہیلی کاپٹر میں موجود زیادہ تر آفیسرز فوجی ڈاکٹرز ہیں۔ ہیلی کاپٹر میں لدے ہوئے سامان کا زیادہ تر حصہ دواؤں اور پینے کے پانی پر مشتمل تھا۔ کچھ دیر کی پرواز کے بعد نیتا جی کے دل سے پرواز کا خوف تو کم ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن نیچے پانی میں ڈوبے ہوئے شہر اور گاؤں دیکھ کر ان کے جسم میں خوف کی لہر سرایت کرتے جا رہی تھی۔ انہوں نے خوف کی وجہ سے اب کھڑکی سے باہر جھانکنا بند کر دیا تھا مگر خوف سے ان کا پِتہ پانی ہو چکا تھا۔ انہوں نے خوف سے چھٹکارا پانے کے لئے ماضی کے جھرونکوں میں جھانکنا شروع کر دیا۔

انہوں نے سوچا:

''ان فوجیوں نے مجھے ایک اُچھوت کی طرح کونے میں بٹھا رکھا ہے۔ ایک وقت تھا کہ جب وہ جلسے سے خطاب کرنے کے لئے نکلتے تھے تو ان کے آگے پیچھے مسلح محافظ ہوتے تھے۔ اُن کے منہ سے نکلنے والے الفاظ شہروں اور دیہاتوں میں آگ لگا دینے کی صلاحیت رکھتے
تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہو چکا تھا کہ اُن کی تقاریر کے بعد فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ پولیس کے بڑے بڑے افسران اِن کے پاؤں چھو کر ان سے ہاتھ ہلکا رکھنے کو کہتے تھے''۔

پیشاب کے ناقابل برداشت دباؤ کی وجہ سے وہ اپنے خیالوں کی دُنیا سے نکل آئے۔

انہوں نے برابر میں بیٹھے ہوئے فوجی جوان سے دریافت کیا:

''بھیا! کیا فوجی ہیلی کاپٹر میں بھی جہاز کی طرح ٹوائلٹ ہوتا ہے؟''۔

فوجی جوان نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔

نیتا جی نے اس کے کان میں ذرا زور سے پوچھا:

''بھیا! اگر کسی کو زور سے پیشاب لگے تو کیا پتلون میں ہی کرنا پڑتا ہے؟''۔

فوجی جوان نے جواب میں کہا:

ایمرجنسی میں کسی بوتل یا ڈبے میں پیشاب کیا جا سکتا ہے''۔

اب پیشاب کا دباؤ نیتا جی کے بس سے باہر ہوتا جا رہا تھا، انھوں نے دونوں ٹانگوں کو باہم بھینچتے ہوئے کہا:

''بھیا! کچھ مدد کرو، اب ہم سے اور برداشت نہیں ہو سکتا، ڈر ہے کہ کہیں پجامے میں ہی نہ نکل جائے''

فوجی جوان اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے ایک خالی بوتل نیتا جی کو لا کر دے دی۔

نیتا جی نے بوتل ہاتھ میں لے کر کہا:

''بھیا! اب ذرا یہ لائف جیکٹ اور ذرا یہ ڈانگری اتارنے میں میری مدد کر دو''۔

جوان نے منہ بناتے ہوئے ان کی لائف جیکٹ اتارنے کے بعد ان کی ڈانگری کی زپ کھولتے ہوئے کہا:

''امید ہے، کہ باقی کام آپ میری مدد کے بغیر کر لیں گے''۔

نیتا جی کچھ جواب دیئے بغیر کھڑکی کی طرف منہ کر کے خالی بوتل کو بھرنے میں مصروف ہو گئے۔ تقریباً دو گھنٹے کی مزید پرواز کے بعد ہیلی کاپٹر اتر پردیش کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے بہار میں داخل ہو چکا تھا۔ آہستہ آہستہ پرواز کی بلندی کم ہوتی جا رہی تھی۔ آخر کار ہیلی کاپٹر ایک دائرے میں چکر لگانے کے بعد اپنی مقررہ جگہ پر اُتر گیا۔ نیتا جی کو فوجی افسران نے ہیلی کاپٹر سے نیچے اترنے میں مدد دی۔

ہیلی پیڈ پر موجود دوسرے افسران سے نیتا جی کا تعارف اس طرح کرایا گیا:

نیتا جی بہت شعلہ بیان مقرر ہیں، یہ آپ کے ساتھ گاؤں گاؤں امدادی مشن پر جائیں گے اور اپنی تقریروں کے ذریعے بپھرے ہوئے لوگوں کو شانت کرنے میں آپ کی مدد کریں گے، اب نیتا جی آپ کے حوالے ہیں''۔

ہیلی پیڈ پر موجود افسر نیتا جی کو اپنی فوجی گاڑی میں بٹھا کر قریبی علاقے میں لے گئے، نیتا جی کو آرام کرنے کی مہلت دیئے بغیر ایک فوجی کشتی میں سوار کرا دیا گیا۔ اس کشتی میں فوجی جوان پہلے ہی سے موجود

تھے۔ کشتی میں گنجائش کے مطابق کچھ امدادی سامان موجود تھا۔ اِس امدادی کشتی کے انچارج فوجی افسر نے نیتا جی کو سب جوانوں سے متعارف کرانے کے بعد انہیں کہا:

''کشتی میں امداد کا سامان بہت کم ہے اور آفت زدگان کی تعداد بڑھتے ہی جا رہی ہے۔ آپ کو لاؤڈ سپیکر کے ذریعے جنتا کو سمجھانا ہو کہ وہ شانت رہیں۔ جلد ہی ہیلی کاپٹرز کے ذریعے امداد گرائی جائے گی۔ آپ کو عوام سے کہنا ہوگا کہ دنگا فساد نہ کریں، سرکار پوری کوشش کر رہی ہے کہ سب کو امداد مل سکے۔ اس کے علاوہ آپ کو اُن سے کہنا ہے کہ اِس مصیبت کی گھڑی میں ہم سب ایک ہیں۔ اِس قت کوئی ہندو، کوئی مسلمان اور کوئی عیسائی نہیں ہے۔ ہم سب برابر کے ہندوستانی ہیں یہ سیلاب اور پانی کا یہ عذاب کسی مذہب کو نہیں جانتا ہم سب کو اس مصیبت سے مل کر لڑنا ہے''۔ ''جے ہند!''۔

فوجی افسر کی بات سن کر نیتا جی سوچنے لگے:

''آج تک میں نے جتنی بھی تقریریں کی ہیں اُن سے نفرت ہی پھیلائی تھی۔ میں نے تو ہمیشہ اِس بات کا پرچار کیا تھا، کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کا ہے۔ مار دو مسلمانوں کو، یا اِن کو پاکستان بھیج دو، یا پھر مسلمانوں کو شدھی کر کے واپس ہندو دھرم میں لاؤ۔ اب وہ کس منہ سے ہندو اور مسلمان کو ایک قوم کہیں گے''۔

زوردار آواز سے کشتی کا انجن اسٹارٹ ہوا تو نیتا جی اپنے خیالوں سے نکل آئے۔

انہوں نے فوجی افسر کو جواب میں کہا:

''آپ چنتا نہ کریں، مجھے لاکھوں لوگوں کو اپنے بھاشن سے قابو میں رکھنے کا تجربہ ہے''۔

فوجی افسر نے نیتا جی کو سمجھانے والے انداز میں کہا:

بھوکا آدمی کانوں سے نہیں پیٹ سے سنتا ہے، امید ہے کہ آپ کامیاب ہوں گے''۔

یہ کہہ کر فوجی افسر نے کشتی کے ناخدا کو اشارے سے کشتی چلانے کو کہا۔ کشتی نہایت تیزی سے سیلابی دھارے کی طرف مڑ گئی۔

جوں جوں کشتی پانیوں میں آگے بڑھتے جا رہی تھی، عجیب عجیب سے منظر دیکھنے کو مل رہے تھے۔ گاؤں کے گاؤں ڈوب چکے تھے۔ لوگ پکے گھروں کی چھتوں پر بیٹھے ہوئے تھے، کچے گھر پانی کی طغیانی کے آگے

ہارمان کرڑھتے جا رہے تھے۔نیتاجی کشتی کے ایک کونے میں خوف سے سکڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔اُن کا گیلا پا جامہ انہیں اس بات کا احساس دلا رہا تھا کہ ان کا پیشاب خوف کے مارے خطا ہو چکا تھا۔انہیں اس بات کا شدید خوف تھا کہ تابکاری سے آلودہ پانی کا کوئی چھینٹا ان کے جسم پر نہ پڑ جائے۔یہ بات سوچ کر وہ کشتی میں کھڑے ہوگئے تا کہ اُن کی سوئی ہوئی ٹانگوں کا دورانِ خون بہتر ہو سکے۔اسی لمحے کشتی نے ایک تیز موڑ کاٹا تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے اور سیلابی دھارے میں گر گئے۔لائف جیکٹ نے ان کو ڈوبنے سے بچالیا تھا۔ وہ سرکش پانی کے بہاؤ میں تیزی سے بہہ رہے تھے۔ بدحواسی میں نہ جانے کتنا آلودہ پانی ان کے حلق کے اندر اتر چکا تھا۔تابکاری سے آلودہ پانی پی جانے کے خوف سے اُن پر بے ہوشی طاری ہوگی تھی۔وہ بے ہوشی کے عالم میں بہتے جا رہے تھے۔

(11)

پاکستانی دارالحکومت ''اسلام آباد'' کی دکانیں کھانے پینے کے سامان سے خالی ہو چکی تھیں۔ شہریوں کے بچے بھوک سے بلک رہے تھے۔ ایندھن کی سپلائی کے خاتمے اور بجلی کے نہ ہونے سے گھروں کو پانی کی فراہمی ممکن نہ رہی تھی۔ لوگ پیدل، بائیسکلوں، گدھا گاڑیوں اور بیل گاڑیوں کے ذریعے راول ڈیم سے پانی بھر کر لا رہے تھے۔ نقل و حمل کے لئے گدھوں اور گھوڑوں نے اچانک اہمیت حاصل کر لی تھی۔ شہریوں میں یہ افواہ پھیل گئی تھی کہ حکومت کے اعلیٰ افسران اور صاحبِ ثروت لوگوں نے ملی بھگت سے کھانے پینے کا سامان اپنے خاندانوں کے لئے ذخیرہ کر لیا ہے۔ شہر کے ساتھ چھاؤنیوں کے علاقوں میں بھی خورد و نوش کا سامان ختم ہو چکا تھا۔

مختلف افواہوں کے نتیجہ میں غصّے کے مارے بپھرے ہوئے شہریوں کے جتھے ایوان صدر کے باہر براجمان تھے۔ بھوک لوگوں کی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں کو نگل چکی تھی۔

ایوانِ صدر کے سامنے دھرنا دیئے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے زوردار آواز میں کہا:

'' ایوانِ صدر میں خوراک کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔۔ نعرے لگانے سے ہمارے بچوں کا پیٹ نہیں بھرے گا۔ جو کچھ بھی وہاں ہے سب عوام کا ہی ہے، بڑھے چلو، لوٹ لو، بڑھے چلو۔'' یہ خیالات لوگوں میں دیکھتے ہی دیکھتے پھیل گئے۔ عوام کے ریلے نے ایوانِ صدر کے مرکزی دروازے کو گرا دیا۔ بپھرے ہوئے لوگوں کے سیلاب کو دیکھ کر ایوانِ صدر کی حفاظت پر مامور عملہ اپنی وردیاں اتار کر عوام کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ لوگوں نے بے دردی سے ایوان صدر میں لوٹ مار شروع کر دی۔ جس کے ہاتھ میں جو لگا وہ اٹھا کر لے آیا۔ وہاں پر لوٹ مار کرنے کے بعد یہ سب لوگ جلوس کی شکل میں وزیر اعظم کے ایوان کی طرف چل پڑے۔ ایوانِ وزیر اعظم کو لوٹنے کے بعد لوگوں نے ٹولیوں کی شکل میں متمول آبادیوں کا رُخ کر لیا

شہر بُری طرح سے انارکی کی زد میں آچکا تھا۔ کچھ گھروں سے لوٹ مار کرنے والوں پر براہ راست فائرنگ کی گئی۔ جواب میں کاروائی لوٹ مار سے بڑھ کر قتل وغارت کی طرف مڑ گئی۔ شہر کی تاریخ میں کسی نے کبھی ایسی قتل وغارت گری نہیں دیکھی تھی، لوگ ایک ایک روٹی کی خاطر ایک دوسرے کو قتل کررہے تھے۔ شہر میں نہ پولیس تھی نہ فوج۔ سارے شہر پر وحشت کا راج تھا۔ دین، اسلام، قرآن، حدیث، رسم ورواج، سب کو بھوک نے مات دیدی تھی۔

برصغیر پاک وہند میں دریاؤں کے کنارے بسے ہوئے تمام شہر سیلابی پانی میں غرق ہوچکے تھے۔ راوی دریا لاہور کی نواحی بستی شاہدرہ کو ڈبونے کے بعد لاہور پر چڑھ آیا تھا۔ لاہور کے شہریوں کا عقیدہ تھا کہ لاہور شہر میں داتا دربار کی برکت سے کوئی خالی پیٹ نہیں سوتا۔ داتا جی کے مزار پر ہر وقت جاری لنگر ہر بھوکے انسان کے پیٹ کی آگ بجھا دیتا ہے۔ لیکن انسانی تاریخ کا یہ خوفناک سیلاب داتا دربار کو روندتا ہوا آگے بڑھ چکا تھا۔ گنج بخش کے لنگر خانے کی خالی دیگیں پانی پر بہتی ہوئی ایک انجانی منزل کی طرف رواں دواں تھیں۔ داتا کی نگری میں بھوک نے ڈیرہ ڈال لیا تھا۔ لوگ تابکاری کے خوف سے سیلابی پانی پینے سے کترا رہے تھے۔ بجلی اور گیس نہ ہونے کی وجہ سے پانی کو ابال کر پینا ناممکن تھا۔

پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی میں خوراک کی ترسیل ملک کے تمام صوبوں سے ہوتی تھی۔ اِس شہر کا زراعت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ دو کروڑ سے زیادہ شہریوں پر مشتمل شہر کا رابطہ ملک کے دوسرے حصوں سے کٹ جانے کی وجہ سے شہر میں پانی اور خوراک ناپید ہوگیا تھا۔ شہر میں خوراک کے حصول کے لئے بلوے شروع ہوگئے تھے۔ طاقتور کمزوروں کو قتل کرکے خوراک چھین رہے تھے۔ شہر میں فوج آچکی تھی جسے عوام کو کنٹرول کرنے کے لئے گولی چلانا پڑ رہی تھی۔ عام لوگوں میں افواہ پھیل چکی تھی کہ چھاؤنیوں میں خوراک کے بڑے ذخیرے موجود ہیں۔ ان افواہوں کی بنا پر کراچی کی مضافاتی بستیوں، ملیر اور کورنگی میں لوگوں نے چھاؤنیوں پر حملے کرکے انہیں لوٹنا شروع کردیا تھا۔ اِس لوٹ مار میں لوگوں نے خوراک کے ساتھ سرکاری اسلحہ بھی لوٹ لیا تھا۔

(۱۲)

مہمان داری دو چار دن کے لئے ہی ہوتی ہے۔ خالد اور بھاگ بھری کا اللہ وسایا کی دی ہوئی اس پناہ گاہ سے نکلنا فی الحال ممکن نہ تھا۔ ان کے اس مہربان میزبان نے ماں بیٹے کے لئے اپنی زمین پر ایک چھوٹی سی کٹیا بنا دی تھی۔ خالد نے وہاں رہنے کے بدلے میں کھیتی باڑی میں اللہ وسایا کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ بھاگ بھری اپنی اس چھوٹی سی کٹیا میں بہت ہی خوش تھی۔ یہ کٹیا کم و بیش ایسی ہی تھی جیسی وہ وڈیرے کے گاؤں میں چھوڑ کر آئی تھی، بس فرق یہ تھا کہ وہ یہاں کسی وڈیرے کی کنیز نہیں تھی، یہاں اس کو کسی ذلت آمیز سلوک کا سامنا نہ تھا۔ وہ یہاں ایک آزاد انسان کی طرح رہتی تھی۔

ماں بیٹے کو اللہ وسایا کی زمینوں پر رہتے ہوئے ایک برس سے زیادہ عرصہ بیت گیا تھا۔ کھجوروں کی پچھلی فصل علاقے کے سیلاب میں گھر جانے کی وجہ سے شہر نہیں جا سکی تھی۔ اللہ وسایا نے ساری کھجوروں کو خشک کر کے چھوہاروں میں تبدیل کر دیا تھا تاکہ وہ سیلاب اترنے کے بعد ان کو بیچ کر کچھ روپے کما سکے۔ اب کھجور کے درختوں پر پھر بور آنے لگا تھا۔ یہ پھولوں پر نر پھولوں کا بور چھڑکنے کا موسم تھا۔ اللہ وسایا کا بھائی اس کام میں ہاتھ بٹاتا تھا، مگر جب سے اس کی کمر میں درد بیٹھا تھا اُسے یہ کام اکیلے ہی کرنا پڑتا تھا۔ سارے باغ کے درختوں پر چڑھ کر بور چھڑکنا اس اکیلے کے لئے کوئی آسان کام نہ تھا۔ اللہ وسایا کو اس بات کی بہت خوشی تھی کہ اس کو اوپر والے نے خالد کی شکل میں ایک مددگار بھیج دیا تھا۔ بھاگ بھری اللہ وسایا کے سُدھائے ہوئے اونٹ کو رہٹ کے گرد ہنکا کر کنویں سے باغ کو سینچ لیتی تھی۔ عام حالات میں اونٹ کو گہرائی سے پانی نکالنے کے لئے کافی زور لگانا پڑتا تھا لیکن جب سے سیلاب آیا تھا کنویں کا پانی خاصہ اوپر آ گیا تھا۔

خالد آج پھر درختوں پر چڑھا کھجور کے نوخیز پھولوں پر بور چھڑک رہا تھا کہ اللہ وسایا نے دور سے آواز لگا کر اُسے کہا:

''بیٹا! اب نیچے اُتر آ، ذرا روٹی ٹکڑ کھا کر ستا لے، سورج ڈھلنے کے بعد پھر کام کریں گے''۔

خالد کو آواز دینے کے بعد اس نے قریب ہی موجود بھاگ بھری کو مخاطب کر کے کہا:

''بہن میں ایک بات کہوں؟''۔

بھاگ بھری نے تجسس سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''ہاں! بھائی کہو، بھلا! پوچھنے کی کیا ضرورت ہے''۔

اللہ وسایا نے کہا:

''خالد بہت محنتی جوان ہے۔ تم اس کا بیاہ کیوں نہیں کر دیتی؟۔ مجھے بہت خوشی ہوگی اسے اپنے داماد بنا کر''۔

بھاگ بھری نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے لہجے میں کہا:

''بھائی! تم نے تو میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔ میں یہ بات کہنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی''۔

اللہ وسایا نے جواب میں کہا:

''لو، بھلا!۔ دل کی بات کرنے میں کیا ہمت کرنا''۔

بھاگ بھری نے کہا:

''بھائی! ہمت کی بات تو تھی نا؟۔ دیکھو میں ایک ہندو، وہ بھی اچھوت ذات کی، اوپر سے پلو بھی خالی، کس منہ سے تمہاری بیٹی کا ہاتھ مانگنے کا سوچتی، اور ویسے بھی تمہارا کتنا بڑا احسان ہے کہ ہم بے آسرا لوگوں کو تم نے کتنی محبت سے سے پناہ دی ہے۔ کسی کی بیٹی کا ہاتھ اس خالی دامن کے ساتھ میں کیسے مانگ سکتی ہوں؟''۔

اللہ وسایا نے جواب میں کہا:

''دیکھ بھاگ بھری!۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ اتنے سارے اونٹ، بکریاں، کھجور کے درخت۔ خالد ایسے ہی محنت کرتا رہا تو میں ایک باغ اس کے نام کا بھی لگا دوں گا اور ویسے بھی میری ایک ہی بیٹی ہے۔ میرا سب کچھ اسی کا ہے۔ تو بس، خالد کو راضی کر لے۔

میں اُس کے اور اپنی بیٹی کے لئے بھی اچھا سا گھر بنا دوں گا''۔

بھاگ بھری نے اللہ وسایا سے جھجکتے ہوئے کہا:

''خالد نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں جس لڑکی سے بھی کہوں گی وہ اسی سے شادی کرے گا، تم بے فکر رہو میں اس کو منالوں گی''۔

اللہ وسایا نے پُر امید نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''بس، آج شام تم مجھے منہ میٹھا کرانے والی خبر سنانا۔۔ میں تمہارے لئے خاص اصلی گھی میں کھجور کا حلوہ تیار کرواؤں گا''۔

خالد کو کٹیا کی طرف آتا دیکھ کر بھاگ بھری نے کہا:

''خالد آرہا ہے میں ذرا اس کے لئے روٹی پانی کا بندوبست کردوں اور آج تو مجھے اس سے اُس کے بیاہ کے بارے میں بھی بات کرنا ہے''۔

یہ کہہ کر بھاگ بھری تیز تیز قدم اٹھاتی اپنی جھونپڑی کی طرف چل دی۔ جھونپڑی میں پہنچ کے اس نے رات کی باسی روٹی پر تازہ مکھن لگایا اور اس پر ساگ رکھ کر خالد کو کھانے کے لئے دیا اور ساتھ ہی تازہ لسی بنانے میں مصروف ہوگئی۔ جب خالد نے کھانا کھالیا تو بھاگ بھری نے اس کو لسّی کا گلاس تھمایا اور اُسے بہت پیار سے دیکھنے لگی۔

خالد نے ماں کی پیار بھری نظروں کو محسوس کیا تو کہا:

''کوئی خاص بات ہے ماں؟''۔

بھاگ بھری نے جواب میں کہا:

''ہاں! خاص بات تو ہے دیکھ تو اتنا تھک جاتا ہے۔ اب میں بڑھاپے میں تیرا اتنا خیال نہیں رکھ پاتی ہوں''

خالد نے جواب میں کہا:

''ماں میں بالکل نہیں تھکتا۔ ذرا اس وادی کو غور سے دیکھ! پہاڑیاں، کھجور کے باغات، اونٹوں اور بکریوں کے ریوڑ، بالکل ایسا ہی منظر مفتی صاحب مکہ اور مدینہ کا کھینچتے تھے۔ ماں کھجور کے باغ میں مزدوری کرنا سنتِ رسول اللہ ہے۔ میں بھلا! اتنے ثواب کے کام سے کیوں تھکوں گا''۔

''دیکھ میں نے تجھے کتنی دفعہ کہا ہے کہ مجھ سے اتنی مشکل باتیں نہ کیا کر، اب بھلا! میں کیا جانوں یہ سنت کیا ہوتی ہے''۔

خالد نے ہنستے ہوئے جواب میں کہا:

''ماں جو کام بھی اللہ کے رسول نے کیا ہو وہ سنت کہلاتا ہے اور ہر ایسے کام کو کرنا جو اللہ کے رسول نے کیا ہو، ثواب کا کام ہے''۔

بھاگ بھری نے خالد کا جواب سن کر ایک لمحہ کے لئے سوچا اور پھر دریافت کیا:

''کیا رسول اللہ کی کوئی جورو بھی تھی یا انہوں نے جیون اکیلے ہی بتایا تھا؟''۔

خالد نے کہا: ''ماں! ایک چھوڑ، اللہ کے رسول کی تو کئی بیویاں تھیں''۔

بھاگ بھری نے خالد کے جواب میں کہا:

''اور تو کیسا مسلمان ہے؟ تیری تو ایک بھی جورو نہیں! کیا بڑھاپے میں شادی کرے گا؟''۔

خالد ماں کی یہ بات سن کر خاموش ہو گیا۔

بھاگ بھری نے خالد کو خاموش دیکھ کر کہا:

''دیکھ! تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں جس لڑکی کو بھی تیرے لئے پسند کروں گی تو اس سے بیاہ کر لے گا''۔

خالد نے جواب میں کہا:

''ہاں میں اپنے وعدے کو بھولا نہیں ہوں''۔

بھاگ بھری نے فوراً جواب میں کہا: ''بس مجھے اللہ وسایا کی بیٹی پسند ہے اور اللہ وسایا بھی تجھے بہت پسند کرتا ہے۔ اسے بس تیری ہاں کا انتظار ہے''۔

خالد نے جواب میں کہا: ''دیکھو ماں! ہم سیلاب میں گھرے ہوئے ہیں جیب بھی خالی ہے۔ اور پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ غزوۂ ہند شروع ہو چکا ہے، مجھے قاری صاحب نے اِس تاریخی غزوہ کی کمان سونپی ہے۔ اصل جہاد کا وقت تو اب آنے کو ہے اور تم مجھے بیاہ رچانے کو کہہ رہی ہو''۔

بھاگ بھری نے خالد کی باتیں سن کر جھنجھلا کر کہا:

''سن پتر! مجھ کونہیں معلوم یہ غزوہ کیا ہے۔بس، مجھ کو تیرا گھر بسانا ہے۔بات ختم۔تو بس شادی کر لے ۔بیاہ کے بعد تو جو چاہے کرنا میں تجھے نہیں روکوں گی۔پھر یہ بات بھی ہے کہ تمہارے اللہ کے رسول نے بھی تو شادی کی تھی''۔

خالد نے ماں کی ضد کے ہاتھوں ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا:

''اچھاماں! جیسے تمہاری مرضی''۔

بھاگ بھری خالد سے رضامندی کے الفاظ سنتے ہی اللہ وسایا کے گھر کی جانب دوڑ پڑی. وہ یہ خوش خبری اسے جلد از جلد سنانا چاہتی تھی۔

(۱۳)

نیتا جی کو معلوم نہ تھا کہ وہ بے ہوشی کے عالم میں کتنی دیر سیلابی پانی کے بہاؤ کے رحم و کرم پر بہتے رہے تھے۔ جب ان کو ہوش آیا تو وہ پانی کے کنارے خشکی پر پڑے ہوئے تھے۔ ان کی لائف جیکٹ، واٹر پروف ڈانگری اور یہاں تک کے ان کا کُرتا بھی کوئی اُن کے بدن سے اُتار کر لے جا چکا تھا۔ سیلابی پانی نے نیتا مکرجی کو بنگال کے کسی دور دراز علاقے میں لا پھینکا تھا۔ قدرت کا نظام بھی کیسا ہے! نیتا جی کے پردادا بنگال سے یو پی میں آ کر آباد ہوئے تھے اور اب حالات نے اُن کو واپس بنگال کی زمین پر لا پٹخا تھا۔

گھنٹوں تابکار پانی میں رہنے کی وجہ سے نیتا جی کی جلد پر تابکاری کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے، اُن کی جلد پر بہت سے چھوٹے بڑے سُرخ نشانات اُبھر آئے تھے۔ ان سرخ نشانوں میں شدید کھجلی ہو رہی تھی۔ نیتا جی اِن نشانوں کو جتنا کھجاتے تھے ان کے جسم میں خارش اتنی ہی بڑھتی جاتی تھی۔ کچھ ہی دنوں میں یہ سرخ نشانات زخموں کی شکل اختیار کر گئے۔ جلدی بیماری کے ساتھ وہ خوراک نہ ملنے سے سخت نقاہت کا شکار تھے۔ ایک آدمی نے اُن کے پاس کھانے کا ایک ڈبا پھینکا تھا جو اُن کی پچھلے تین دنوں کی خوراک تھی، اُن کے جسم پر پھیلے ہوئے زخموں سے آنے والی بدبو کی وجہ سے کوئی اُن کے قریب آنے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ ویسے بھی قحط کی اِس صورت حال میں سب کو اپنی پڑی ہوئی تھی۔ نیتا جی کا گلا بھی اندرونی سوزش کی وجہ سے پھول گیا تھا۔ وہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ ہندوستان کے مشہور نیتا اور اپوزیشن لیڈر رہیں۔

کچھ روز پہلے ہیلی کاپٹر چھوٹے چھوٹے ریڈیو پھینک رہا تھا تا کہ حکومت کا عوام سے کسی طرح رابطہ ممکن ہو سکے۔ ہیلی کاپٹر سے پھینکا گیا ایک ریڈیو نیتا جی کے پاس آ گرا۔ نیتا جی اپنی بھوک اور پیاس سے ہونے والی نقاہت کو بھول کر اِس ریڈیو کو اٹھانے کے لئے تیزی سے بھاگے۔ وہ سمجھے تھے کہ ہیلی کاپٹر نے کوئی خوراک کا ڈبا پھینکا ہے۔ انہوں نے ریڈیو کا بٹن تلاش کر کے اُسے جلدی سے آن کیا، خبروں کی بھوک ان کی جسمانی

بھوک پر غالب آ چکی تھی۔

ریڈیو سے یہ بلیٹن نشر ہو رہا تھا:

''پہاڑی علاقوں کے سوا بنگال، آسام اور اڑیسہ کا سارا میدانی علاقہ ڈوب چکا ہے۔ انڈیا، پاکستان اور بنگلہ دیش ایک جیسی تباہی سے دوچار ہیں۔ نیپال اور بھوٹان میں دریاؤں پر بنے تمام پل تباہ ہونے سے لوگ اپنے اپنے علاقوں تک محدود ہو گئے ہیں۔ دنیا کا سب سے بڑا ریل کا نظام تباہ ہو گیا ہے۔ سیلابی ریلوں میں دن بہ دن اضافہ ہوتے جا رہا ہے۔ فی الحال سیلاب کی شدت ختم ہونے کے کوئی آثار نہیں۔ جنتا سے گذارش ہے کہ وہ سیلابی پانی کو ابال کر استعمال کریں۔ ریڈیو سے بار بار ان علاقوں کی نشاندہی بھی ہو رہی تھی کہ جہاں ہیلی کاپٹرز سے امداد گرائی جانے والی تھی''۔

یہ اعلانات سُن کر نیتا جی کو چکر آ گئے اور وہ نقاہت سے بے ہوش کر گر پڑے۔

(۱۴)

خالد کی شادی کو سال سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اس نے ماں کا دل رکھنے کو شادی کر لی تھی لیکن وہ اس بندھن سے خوش نہ تھا۔ اس کا دل جدال و قتال میں اٹکا رہتا تھا۔ اس کی بیوی اس کی ماں سے بھی زیادہ دہقانی طبیعت کی تھی۔ وہ اس کی کسی بھی بات کو سمجھ نہیں پاتی تھی۔ وہ اس بات میں ہی خوش تھی کہ وہ خالد کے لئے روٹی پکاتی ہے اور کبھی کبھی وہ اس کے ساتھ سو جاتی ہے۔ البتہ اسے اب ماں بننے کی خوشی ملنے والی تھی۔ پچھلے ماہ اللہ وسایا کے بھائی کے یہاں ایک بیٹا پیدا ہوا تھا۔ اس کے پیدا ہونے کی خوشی تو سب کو بہت تھی لیکن اس کا ماتھا عام بچوں کے مقابلے میں بہت بڑا اور آنکھیں عجیب سی تھیں۔ اس کے کان بھی انسانی کانوں جیسے نہ تھے۔

سب کو امید تھی کہ شاید وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کی صورت عام انسانوں کی طرح ہو جائے گی۔

خالد نے اللہ وسایا کی زمین کے ایک حصے پر کھجور کے تنوں اور اُن کے پتوں کی چھت ڈال کر ایک مسجد تعمیر کر کے خود ہی اپنے آپ کو اس مسجد کا امام اور موذن مقرر کر لیا تھا۔ وہ خود باقاعدگی سے اپنی تعمیر کی ہوئی مسجد میں پانچوں وقت اذان دیتا اور نماز کی امامت کراتا تھا۔ اپنے سسر، اس کے بھائی اور بھتیجوں کو خالد نے نماز سکھا کر پانچ وقت کا نمازی بنا دیا تھا۔ وہ اِن سب کو قرآن پڑھنا بھی سکھانا چاہتا تھا لیکن وہاں پر کسی کے پاس قرآن کا کوئی نسخہ موجود نہ تھا۔ وہاں پر قلم اور کاغذ نام کی بھی کوئی شے نہ تھی اور نہ ہی کسی کو تعلیم سے دلچسپی تھی۔ وہ اکثر نماز کے بعد درس بھی دیتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی اکثر باتیں اِن اَن پڑھ لوگوں کے سروں سے گذر جاتی تھیں۔

اللہ وسایا کی نسل میں کسی نے بھی اسکول کی شکل نہ دیکھی تھی۔ غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اللہ وسایا کو زراعت اور مویشیوں کو پالنے کی بہت سمجھ تھی۔ اس نے کچھ برسوں سے کھجور کے درختوں کے بیچ اناج اگانا

شروع کر دیا تھا۔ اس کا زراعت کا یہ تجربہ کارآمد ثابت ہوا تھا۔ آج وہ حسب معمول سبزیوں کا مشاہدہ کر رہا تھا کہ وہ اُن کی شکلیں دیکھ کر چونک اٹھا۔

اس نے خالد کو آواز دے کر اپنے قریب بلا کر کہا:

''پتر! دیکھنا، تو ذرا ان کدوؤں اور ٹنڈوں کی شکلیں! میں نے آج تک ایسی شکل کے کدو اور ٹنڈے نہیں دیکھے۔ بیج تو صحیح نسل کے اور پچھلی فصل کے ہی تھے''۔

خالد نے سبزیوں کو حیرانی سے دیکھ کر کہا:

''چاچا! میں کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا، ہوسکتا ہے کہ یہ موسم بدلنے کے اثر کا نتیجہ ہو۔ دیکھو گرمی کتنی بڑھ گئی ہے! اب تو دن کے وقت کام کرنا ناممکن ہوتا جا رہا ہے''۔

اللہ وسایا نے خالد کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا:

''ہاں، پتر! میں نے ایسی گرمی اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی۔ گرمی سے سارے پنچھی نہ جانے کس دیس کو سدھار گئے ہیں۔ کیڑے مکوڑے غائب ہو گئے ہیں اور شہد کی مکھیوں کا تو دوُر دوُر تک پتہ نہیں، مکھیوں کے نہ ہونے سے سبزیوں کی پیداوار نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے''۔

اللہ وسایا نے خالد کو سوچوں میں غرق دیکھ کر مزید کہا:

''پتر! اب تو گھر میں بھی سکون نہیں مل رہا ہے، جانور گرمی سے بیمار ہو کر مرنا شروع ہو گئے ہیں۔ اب تک ہم دو اونٹوں کو ذبح کر کے ان کا گوشت خشک کرنے کو رکھ چکے ہیں۔ پتر! تو پڑھا لکھا ہے۔ اس خوفناک گرمی کا کوئی حل سوچ''۔

خالد نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا:

''چاچا!، افغانستان میں جہاد کے دوران ہم مجاہدین اکثر غاروں میں رہتے تھے۔ اللہ کا نظام اتنا اچھا ہے کہ غار سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں ٹھنڈے رہتے ہیں۔

یہ کہہ کر خالد خاموش ہو گیا۔

اللہ وسایا نے خالد کی بات سن کر کہا:

''اگر ایسی بات ہے تو ہم آج سے ہی غار کھودنا شروع کر دیتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ پہاڑی کا کونسا

حصہ کم پتھریلا ہے"۔

خالد نے جواب میں سر ہلا کر رضامندی کا اظہار کیا تو اللہ وسایا نے ایک اور مسئلہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا:

"جب سے سیلاب آیا ہے بارش کا ایک قطرہ بھی نہیں برسا! بلکہ اب تو صبح صبح اوس کے قطرے بھی دیکھنے کو نہیں ملتے۔ پتر! وہ تو رب کا شکر ہے کہ سیلاب کی وجہ سے کنویں کا پانی اوپر تک آ گیا ہے۔ ورنہ صرف کنویں کے پانی سے باغبانی ممکن نہیں۔ اور پھر تو ذرا غور کر، درختوں کا رنگ پیلا پڑتا جا رہا ہے، جیسے ان کو اندر ہی اندر سے کوئی بیماری کھا رہی ہو!"

خالد نے پُر امید لہجے میں کہا:

"بارش کا ایک ہی حل ہے چاچا!"۔

اللہ وسایا نے بڑے اشتیاق سے پوچھا:

"وہ کیا ہے پتر؟"۔

چاچا! رسول پاک نے فرمایا ہے کہ بارش نہ ہو تو نمازِ استسقاء پڑھی جائے۔ اس نماز کو پڑھ کر بارش کی دُعا کی جائے تو بارش ہو جاتی ہے"۔ اللہ وسایا کی آنکھوں میں خالد کی بات سن کر چمک آ گئی۔

کچھ دیر سوچ کر اللہ وسایا نے دریافت کیا:

"پتر! تُو پڑھا دے گا، نا، نماز اس... اس۔ وہی بارش کی نماز"۔

خالد نے جواب میں کہا:

"کیوں نہیں؟ ہم سب آج شام کو ہی نماز استسقاء پڑھیں گے"۔

اللہ وسایا جواب سن کر مطمئن ہو گیا، پھر اس نے کہا:

"ایک خوشخبری ہے، میں اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر پہاڑیوں کے دوسری طرف کا چکر لگا کر آیا ہوں۔۔۔ سیلاب کا پانی دھیرے دھیرے اُتر رہا ہے، مجھے تو ڈر تھا کہ اگر پانی ایسے ہی چڑھتے رہا تو ہمارا سب کچھ برباد ہو جائے گا"۔

خالد نے اس کے جواب میں کہا:

''چاچا! مجھے یقین تھا کہ سیلاب رک جائے گا۔ ایک ایسا سیلاب نوح پیغمبر کے زمانے میں بھی آیا تھا۔ اس سیلاب نے زمین کو سارے نافرمانوں سے پاک کر دیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ موجودہ سیلاب نے ہند کی سرزمین کو ہندوؤں اور نافرمان مسلمانوں سے بھی پاک کر دیا ہوگا۔ چاچا جی! تم یقین رکھو، کہ اب سرزمین ہند پر خلافت کے جھنڈے لہرائیں گے۔ یہ سیلاب جہاد کی راہ میں رکاوٹ نہیں بلکہ رحمت ثابت ہوگا۔

اللہ وسایا نے خالد کی بات سن کر سوال کیا:

''پتر! یہ تیرا نماز پڑھنا اور پڑھانا، روزے رکھنا، وعظ کرنا تو میری سمجھ میں آتا ہے لیکن تو جو یہ ہر وقت جہاد، لڑائی قتل، لشکر کشی جیسی باتیں کرتا ہے، وہ سمجھ نہیں آتیں''۔

خالد نے اللہ وسایا کو مطمئن کرنے کے لئے یوں جواب دیا:

''چاچا!، اللہ کی زمین پر اللہ کا نظام نافذ کرنا ہمارا فرض ہے۔ اس ساری زمین پر اللہ کا نظام نافذ ہونا ہے۔ اس بات کی پیش گوئی حدیث کی کتابوں میں بارہا ہوئی ہے''۔

اللہ وسایا نے خالد کی وضاحت سن کر دریافت کیا:

''پتر! اگر اللہ کو ساری دنیا کو مسلمان ہی بنانا تھا تو اور دوسرے دین، دھرم اس نے پیدا ہی کیوں کیے؟''۔

خالد نے جواب میں کہا:

''اللہ نے صرف اسلام کو ہی پیدا کیا تھا۔ اس دین حق کے نام مختلف زمانوں میں مختلف تھے۔ آدم سے لے کر آخری نبی تک سب مسلمان ہی تھے۔ بس اسلام کے سوا سارے مذاہب جھوٹے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ جھوٹے مذاہب سے دنیا کو پاک کر دیں''۔

اللہ وسایا خالد کی بات سے مطمئن نہ ہوا تو اس نے پھر ایک اور سوال کیا:

''پتر! میں پڑھا لکھا تو نہیں ہوں پر میری عقل کہتی ہے کہ دیکھ ذرا تیری ماں بھی تو ہندو ہے۔ اس بے چاری اور دکھیاری کے ہندو ہونے سے اتنے بڑے اللہ کو کیا فرق پڑے گا؟''۔

خالد نے جواب میں کہا:

''چاچا! دین اسلام میں عقل کے شیطانی گھوڑے دوڑانے کی اجازت نہیں۔ یہ سوچنے اور فضول

سوالات کرنے کی رسم یونان کے فلسفیوں نے ڈالی تھی جو کافر اور بُت پرست تھے۔ مسلمانوں کے سب سے بڑے شاعر علامہ اقبال نے کہا تھا کہ:

''آزادیِ افکار ہے ابلیس کی ایجاد''۔

یہ شیطان ہے جو انسان کو دینی احکامات کے خلاف سوالات کرنے پر اکساتا ہے''۔

خالد کی باتیں اللہ دوسایا کی سمجھ میں نہ آسکیں تو اس نے کہا:

''پتر! مجھے تیری اتنی مشکل باتیں سمجھ نہیں آتیں لیکن ایک بات ضرور کہوں گا کہ میں کسی کا خون اس لئے نہیں بہا سکتا کہ اس کا دین دھرم کچھ اور ہے''۔

خالد نے اللہ دوسایا کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا:

''چاچا! جہاں تک تم نے میری ماں کے ہندو مذہب پر ہونے کا کہا ہے تو میں یہ کہوں گا:

''وہ تو اب ہندو بھی نہیں رہی ہے بلکہ مجھے تو شک ہے کہ اب اس کا کوئی مذہب ہی نہیں رہا ہے۔ وہ عجیب عجیب باتیں کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ ہر آدمی، جانور یہاں تک کہ پودوں اور درختوں تک میں خدا ہے۔بس چاچا!۔وہ میری ماں ہے۔میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں ورنہ باتیں وہ پاگلوں جیسی کرتی ہے''

اللہ دوسایا نے ہنستے ہوئے کہا:

''خیر! وہ کوئی ایسا غلط بھی نہیں کہتی ہے۔ یہ پودے اور درخت بھی ہماری طرح جاندار ہی ہیں۔اور کوئی جاندار بھلا روح کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے! اب تو خود سوچ۔تو کھجور کے درخت پر چڑھ کر مادہ پھول پر نطفہ چھڑکتا ہے تو پھول کو حمل ٹھہرتا ہے اور پھل پیدا ہوتا ہے۔اور پھر درخت ہم انسانوں کی طرح پینے کو پانی اور کھانے کو کھاد بھی مانگتا ہے''۔

خالد اللہ دوسایا کی جرح سے تنگ ہو گیا تو اس نے بات کا موضوع بدلتے ہوئے کہا:

''چاچا! سو باتوں کی ایک بات ہے۔۔ اللہ کے رسول نے کہا ہے کہ غزوۂ ہند ہو گا اور مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو گا۔چلو! اب نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ مسجد کی طرف چلتے ہیں''۔

(۱۵)

پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں سرکاری دفتروں کے علاقے کا کنٹرول فوج نے سنبھال لیا تھا۔ ان علاقوں کو عام افراد کے لئے ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ یہاں بلا اجازت آنے والے کو دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم دیا گیا تھا۔ ایندھن عام لوگوں کی دسترس میں نہیں تھا۔ اس پر صرف حکومتی اداروں کی اجارہ داری تھی۔ فوجی ہیلی کاپٹرز کراچی سے ایندھن لاتے تھے جو کہ نہایت کفایت شعاری سے خرچ کیا جاتا تھا۔ حکومتی دفاتر کے اردگرد بنکرز تعمیر کئے جا رہے تھے کیونکہ عوام کے ہاتھ بھی اسلحہ لگ چکا تھا۔ مسلح عوام اکثر خوراک چھیننے کے لئے حکومتی علاقوں پر حملے کرتے تھے۔ اسلام آباد بہادر شاہ ظفر کی دلّی کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

آج اسلام آباد میں اعلیٰ سطحی حکومتی اجلاس میں مُلکی صورت حال کا جائزہ لیا جا رہا تھا۔ اس اجلاس میں ملٹری اور سول افسران مشترک طور پر شریک تھے۔ اجلاس کی ابتدا میں پاکستان آرمی کے سربراہ نے اقوام متحدہ سے سیلاب کے متعلق ملنے والی تازہ ترین رپورٹ کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے بتایا:

''پاکستان کے علاقوں میں پائے جانے والے گلیشیرز تقریباً پگھل چکے ہیں جبکہ ہمالیہ کے دیگر علاقوں کی صورت حال بھی مختلف نہیں۔ گلیشیرز کے پگھل جانے کی وجہ سے اب سیلاب کا زور ٹوٹ رہا ہے۔ تشویش کی بات یہ ہے کہ موسمی تبدیلیوں کی وجہ سے ہمالیہ اور برصغیر کے کسی بھی علاقے میں گزشتہ برسوں سے بارش نہیں ہوئی ہے۔ ایک خطرناک بات یہ ہے کہ پہاڑی علاقوں میں بلندی پر بھی درجہ حرارت اتنا بڑھ گیا ہے کہ اگر بارش ہو بھی جائے تو برف جمنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ عالمی اداروں نے خبردار کیا ہے کہ اگر موسم اور ماحول دوبارہ پہلے جیسی حالت میں بحال نہ ہوا تو برصغیر کے تمام علاقوں، افغانستان اور چین کے کچھ حصوں کے دریا خشک ہو جائیں گے۔ صورتحال موجودہ قحط سے زیادہ خوفناک ہونے کا خطرہ ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں گرمی اور بڑھے گی اور لوگوں اور مویشیوں کی اموات میں اضافہ اور تیز ہو جائے گا''۔

آرمی چیف سے رپورٹ کا خلاصہ سننے کے بعد وزیراعظم نے چیف سیکریٹری کی طرف دیکھتے ہوئے

سوال کیا:

پاکستان پر سے سفری پابندیوں کو ہٹانے کی درخواست کا کیا نتیجہ برآمد ہوا ہے؟''۔

چیف سیکریٹری نے جواب دیتے ہوئے کہا:

''اقوام متحدہ نے ایٹمی ہتھیاروں کی منتقلی اور تنصیبات کو محفوظ بنانے کا کام مکمل کرلیا ہے، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اقوام متحدہ سفری پابندیوں کو ہٹانے کی بات پر ٹال مٹول سے کام لے رہی ہے''

وزیراعظم نے یہ سن کر وزیر خارجہ کو ہدایت کرتے ہوئے کہا:

''آپ اپنے تمام لائق افسران کو اس مشن مامور کریں کہ وہ سفر کی پابندیاں ہٹانے کے لئے مؤثر لابنگ کریں۔ ہمارے وزراء اور افسران کو دنیا بھر کے دورے کر کے اس آفت سے نمٹنے کے لئے امدادی کاروائیاں کافی نہیں ہیں۔ آپ لوگ امداد حاصل کرنے کے لئے دن رات ایک کریں ورنہ ہم سب محصور ہو کر بے بسی کی موت مارے جائیں گے۔

وزیر خارجہ کو ہدایت دینے کے بعد وزیراعظم نے وزیر دفاع سے مخاطب ہو کر دریافت کیا:

''آپ کی کیا پروگریس ہے؟''۔

وزیر دفاع نے جواب میں کہا:

نپولین نے سچ کہا تھا کہ:

''فوجیں پیٹ کے بل ہی رینگتی ہیں''، مالی و اقتصادی نظام کی تباہی کی وجہ سے تنخواہوں کا نظام ختم ہو چکا ہے۔ اب ملکی سطح پر منظم فوج کا کوئی نظام نہیں ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں کچھ فوجی افسران نے مسلح جتھے بنالئے ہیں جو صرف اپنے اور اپنے خاندان کے لئے خوراک پر قبضے کے لئے لڑ رہے ہیں''۔

وزیر دفاع کی یہ باتیں سن کر وزیراعظم نے ناپسندیدگی سے کہا:

''آپ صرف مسئلے کو اُجاگر کر رہے ہیں۔ یہ سب باتیں ہم سب کو معلوم ہیں۔ آپ برائے مہربانی مسئلہ کے حل پر بات کریں''

وزیراعظم کی تنبیہ سن کر وزیر دفاع نے کہا:

''جناب! جب تک تمام بین الاقوامی برادری ایک عزم کے ساتھ میدان میں نہیں اترے گی ہم تنہا صورت حال کو کنٹرول میں نہیں لا سکتے''۔

یہ کہہ کر وزیر دفاع کچھ سوچنے لگے۔ انہیں گہری سوچ میں دیکھ کر وزیر اعظم نے ان سے پوچھا:

''شاید آپ مزید کچھ کہنا چاہتے ہیں؟''۔

وزیر دفاع نے بہت سنجیدگی کے ساتھ کہا:

''جناب! میں اپنی وزارت سے استعفیٰ دینا چاہتا ہوں، فوج بکھر چکی ہے۔ جب کہ یہ ادارہ ہی نہیں رہا تو ایسی وزارت سے کیا حاصل اور جس وقت یہ ادارہ موجود تھا اس وقت بھی وزیر دفاع بس نام کے ہی ہوا کرتے تھے''، یہ کہتے ہوئے وزیر دفاع کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وزیر اعظم نے ان کی بات کے جواب میں کہا:

''میں چاہوں گا کہ ہم دو گھنٹے کے لئے وقفہ لیں۔ کچھ ہی دیر میں مجھے سیکریٹری جنرل اقوامِ متحدہ سے بات کرنا ہے۔ میں ان سے ذاتی طور سے بھی درخواست کروں گا کہ پاکستان پر سے سفری پابندیوں کو ختم کر دیا جائے میں وزیر دفاع سے گذارش کروں گا کہ اس امتحان کے موقع پر ہمت نہ ہاریں اور اپنے استعفیٰ دینے کے فیصلے پر دوبارہ غور کریں۔ اب آپ سب سے دو گھنٹے کے بعد دوبارہ ملاقات ہوگی''۔

یہ کہہ کر وزیر اعظم میٹنگ کے کمرے سے نکل گئے۔

(۱۶)

بھاگ بھری دادی بننے کی خوشی سے پھوُلے نہیں سمارہی تھی ۔ اُس نے خالد کے باپ بننے کے دن انگلیوں پر گِن کر کاٹے تھے ۔ آخر کار خالد کی بیوی نے ایک بچی کو جنم دیا۔ بھاگ بھری اپنی پوتی کا چہرہ دیکھ کر خوفزدہ ہوگئی تھی ۔ وہ بھی اللہ وسایا کے بھتیجے کی طرح عجیب الخلقت
تھی ۔ اس کا ماتھا بہت چوڑا، آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور ہونٹ لٹکے ہوئے تھے ۔ ان سب نے اس بچی کو خدا کی رضا جان کر قبول کر لیا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ پچھلے دنوں میں جن مویشیوں نے بچے جنے تھے وہ بھی عجیب وغریب صورتوں کے پیدا ہوئے تھے ۔ ان جانوروں کے بچے جلد ہی مر گئے تھے یا اپنی ڈراوٗنی صورتوں کے ساتھ معذوری کی حالت میں زندہ تھے ۔
گرمی کا یہ عالم کہ تھا کہ روز بروز بڑھتی ہی جا رہی تھی ۔ دسمبر کے مہینے میں بھی مئی اور جون جیسی گرمی تھی ۔ خالد نے اپنے سسر اور اس کے بھائی کے ساتھ مل کر پہاڑی میں کئی غار بنا دیئے تھے ۔ یہ غار ان کی رہائش، کھجوروں اور دوسری اجناس کو ذخیرہ کرنے کے کام آ رہے تھے ۔ اب ان لوگوں کی زندگی کا پہیہ الٹا چلنے لگا تھا ۔ یہ سب دن کے وقت گرمی سے بچنے کے لئے غار میں دبکے رہتے تھے ۔ سورج ڈھلنے کے بعد یہ لوگ اپنی کھیتی اور جانوروں کی دیکھ بھال کرتے تھے ۔ شدید گرمی اور سورج کی بڑھتی ہوئی تپش سے سبزی کے پودے جلنے لگے تو خالد نے پہاڑی میں کچھ ایسے غار بنادئے تھے جن میں براہِ راست دھوپ نہیں آتی تھی ۔ یہ لوگ ان غاروں میں سبزیاں اُگانے میں کامیاب ہوگئے تھے ، اللہ وسایا اور خالد پانی کو جانوروں کی کمر پر پانی لاد کر اوپر لاتے تھے ۔ گرمی کی شدت سے جانور تیزی سے مر رہے تھے ۔ خالد نے اللہ وسایا کو سمجھایا تھا کہ قحط اور جنگ کے حالات میں مردار جانور حلال ہو جاتا ہے ۔ اب جیسے ہی کوئی جانور مرتا تھا تو خالد اور اللہ وسایا مل کر اس کے گوشت کو نمک لگا کر خشک کرنے کے لئے غار میں لٹکا دیتے تھے ۔ اللہ وسایا نے گوشت کو سکھا کر

محفوظ کرنے کا گُر اپنے باپ سے سیکھا تھا جو اس وقت ان لوگوں کے کام آ رہا تھا۔ ان لوگوں نے بہت سی بکریوں اور اونٹوں کا ڈھیروں گوشت سکھا کر محفوظ کر لیا تھا۔

اللہ وسایا روز بارش کی دعا مانگتا تھا۔ یہ لوگ کئی بار بارش ہونے کے لئے نماز استسقاء بھی پڑھ چکے تھے مگر بادل کی صورت تک دیکھنے کو نہ ملتی تھی۔

ایک روز خالد کی اقتداء میں نماز پڑھنے کے بعد اللہ وسایا نے خالد سے سوال کیا:

''پتر! تُو نے اتنی دفعہ بارش برسنے کی نماز پڑھوائی، پر بارش ہے کہ بالکل ہی روٹھ گئی ہے!۔ کچھ تو اثر ہونا چاہئے ہماری نماز میں، ہماری دعا میں، پتر! ہمارے ڈیرے پر پہلے نہ تو مسجد تھی اور نہ ہی ہم کو نماز پڑھنا آتی تھی۔ ہم لوگ اچھی فصل ہونے پر اپنا دامن اٹھا کر اُوپر والے کا شکر ادا کر دیتے تھے۔ عجیب بات ہے کہ جب ہم نماز نہیں پڑھتے تھے تو کھل کر بارش ہوتی تھی بلکہ سردیوں میں بھی ایک آدھ بار برکھا اپنا جلوہ دکھا ہی دیتی تھی''۔

خالد نے اللہ وسایا کی بات سن کر اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھتے ہوئے کہا:

''چاچا! تمہاری باتوں سے لگتا ہے کہ اس مصیبت نے تمہارا ایمان ڈگمگا دیا ہے۔ اِسلام کے شروع کے دنوں میں بھی مسلمانوں پر ایک ایسا ہی کڑا وقت آیا تھا۔ وہ مہینوں ایک گھاٹی میں بند رہے تھے اور انہوں نے درختوں کی جڑیں اور پتے کھا کر گذارا کیا تھا''۔

اللہ وسایا نے کچھ دیر سوچنے کے بعد یوں جواب دیا:

''یہ اسلام کے شروع میں ہوا ہوگا۔ اب تو اسلام کو آئے ہوئے ہزار برس بیت چکے ہیں کیا ہم اب بھی ویسی ہی زندگی گزاریں؟''۔

خالد نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا:

''چاچا جی! یہ ایک امتحان ہے''۔

اللہ وسایا نے اس کے جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا:

''پتر! میں پڑھا لکھا آدمی تو ہوں نہیں پر پھر بھی سوچتا ہوں کہ مجھ جیسا اَن پڑھ اور جاہل بھی اپنے سے کمزور اور کمتر کا امتحان لینے کا نہیں سوچتا تو پھر دنیا میں سب سے عظیم، ہمارے رب کو ہم جیسے کمزوروں کا

امتحان لینے کی کیا ضرورت ہے؟''۔

خالد کو جب اللہ وسایا کی بات کا مناسب جواب نہ سوجھا تو اس نے کہا:

''چاچا! لگتا ہے کہ تم ماں کی فضول باتوں کو غور سے سننے لگے ہو۔ تمہارے خیالات میں اُس کی باتوں کی جھلک نظر آرہی ہے''۔

اللہ وسایا نے جواب میں کہا:

''پتر! یہاں چار ہی تو بندے ہیں۔ پھر میرے دل کو تو جس کی بات بھی لگے ہے میں اُسے سنتا ہوں''۔

خالد نے اللہ وسایا کی بات سن کر کہا:

''چاچا! صبر سے کام لو۔ اگر اس عارضی دُنیا میں بھی ہمیں کچھ نہ ملا تو اوُپر جا کر ہم کو اللہ کے ایسے انعامات ملیں گے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ لاتعداد سرُخ وسفید حوریں، سنگِ مرمر کے محل، خدمت کرنے کو غلام، دودھ اور شہد کی نہریں''۔

اللہ وسایا نے جواب میں کہا:

''میں ایک بات جانتا ہوں کہ جو دین دھرم ہم کو ہماری زندگی میں کچھ نہیں دے سکتا وہ مرنے کے بعد بھی کچھ نہ دے سکے گا۔۔۔ اور پتر! پھر مجھے تو یہ سمجھا کہ اگر سب کچھ اوُپر ہی ملنا ہے تو پھر تُو کیوں دن رات جہاد، کافروں کے قتل عام اور دین کو دنیا پر نافذ کرنے کی باتیں کرتا ہے۔ جنت اور حورُیں تو جنگ وجدل کئے بنا بھی مل سکتی ہیں؟''

خالد نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا:

''چاچا! اِس وقت مسلمان اللہ کے عذاب سے گزر رہے ہیں۔ یہ وقت توبہ اور مغفرت کا ہے۔ ہم کو اپنے گناہوں کی معافی مانگنا چاہئے''۔ اللہ وسایا نے بلا سوچے جواب میں کہا:

''پتر! کیا بگاڑا ہے ہم نے اوُپر والے کا جو ہم پر عذاب نازل ہوا ہے۔ محنت مزدوری سے پیٹ پالا ہے۔۔ جانوروں تک کو دُکھ نہیں پہنچایا، تو پھر کس بات کا عذاب؟''۔

خالد نے سنجیدہ لہجے میں کہا:

''چاچا! نہ تم نماز پڑھتے تھے نہ روزہ رکھتے تھے اور چاچی پردہ نہیں کرتی تھی''۔

اللہ وسایا نے تڑ کی بہ تڑ کی جواب دیتے ہوئے کہا:

''پتر! کوئی نماز سکھانے والا تھا نہیں۔ جب تو نے سکھائی تو پڑھنا بھی شروع کر دی۔ رہی بات تیری چاچی کے پردے کی۔ تو یہاں کون سے غیر لوگ رہتے ہیں جن سے پردہ ہوتا''۔

خالد نے اپنی پرانی بات دہراتے ہوئے کہا:

''چاچا! ہم نے اسلام کے نفاذ کی جدوجہد نہیں کی۔ لیکن تُو فکر نہ کر، شمال سے کالے جھنڈے والے آئیں گے اور ساری دُنیا پر چھا کر اِسے عدل وانصاف سے بھر دیں گے''۔

اللہ وسایا نے خالد کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا:

''نہ تیری باتیں میری سمجھ میں آئی ہیں اور نہ ہی آئیں گی''۔

اِن کی گفتگو کے بیچ میں خالد کی بیوی غار میں آ گئی۔ اُس نے خالد کو اپنے باپ کے ساتھ گپ شپ لگاتے ہوئے دیکھ کر کہا:

''بابا! چلو، ماں کو لے کر ہمارے غار میں آ جاؤ کھانا ہمارے ساتھ ہی کھانا، میں گرم گرم روٹی ڈالتی ہوں''۔

یہ کہہ کر وہ غار سے باہر نکل گئی۔ اُس کے جانے کے بعد اللہ وسایا اور خالد اپنی چادر کو گرمی سے بچنے کے لئے سر پر لپیٹ کر چلنے کو تیار ہو گئے۔

(۱۷)

دہرادون میں ہندوستان کی کابینہ کے اجلاس میں اقوامِ متحدہ کی ایک نئی تجویز پر غور کیا جار ہا تھا۔اقوام متحدہ نے امدادی کاموں میں ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے تجویز پیش کی تھی کہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش مل کر ایک ایمرجنسی کونسل تشکیل دیں۔یہ کونسل امدادی سرگرمیوں سے متعلق فیصلے کرے اور بیرونی ملکوں سے رابطہ قائم کرے۔وزیراعظم ہندوستان نے کابینہ کو پاکستانی وزیراعظم سے ہونے والی گفتگو کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا:

''پاکستان کے وزیراعظم نے اقوام متحدہ کی تجویز کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ یہ تجویز نظریہ پاکستان اور دو قومی نظریہ کے خلاف ہے''۔

کابینہ کے ایک رکن نے تجسّس سے دریافت کیا:

''آپ نے جواب میں ان کو کیا کہا؟''۔

وزیراعظم نے کہا:

''میں نے حکومت کی طرف سے پیشکش کی ہے کہ مشترکہ کونسل ہم سب کے فائدے میں ہے۔ پاکستان اس کونسل کا سربراہ بن جائے ،ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ہم سب کو اس سے وقت کے مخالف دوڑ لگانا ہے۔آدھا ممبئی اور کراچی قبرستان بن چکا ہے۔دونوں دیسوں میں مُردوں کو جانوروں کی لاشوں کی طرح لاد کر اجتماعی طور پر دفن کیا جار ہا ہے۔شہر مرگھٹ بن کر رہ گئے ہیں۔اور نفرت ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی ہے''۔

وزیراعظم یہ کہہ کر خاموش ہوئے تو ایک وزیر نے دریافت کیا:

''کیا پاکستان آپ کی پیشکش کو قبول کرنے کو تیار ہے؟''۔

وزیراعظم نے جواب میں کہا:

''انہوں نے کہا ہے کہ وہ اپنی کابینہ سے مشورہ کر کے ہماری پیشکش کا جواب دیں گے''۔

وزیراعظم نے امدادی صورت حال کے متعلق مزید بتاتے ہوئے کہا:

''اقوام متحدہ کی مدد سے چوبیس گھنٹے نشر ہونے والے ریڈیو پروگرامز سے لوگوں کو اس مصیبت سے نبرد آزما ہونے اور ان حالات میں جینے کا ڈھنگ سکھایا جا رہا ہے۔ جنتا کو سکھایا جا رہا ہے کہ وہ سورج کی گرمی کو استعمال کرتے ہوئے سیلابی پانی کو کس طرح پینے کے قابل بنائیں۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہماری نظروں کے سامنے ہمارا ہندوستان دم توڑ رہا ہے۔ سیاست میں مذہب کے زہر کی آمیزش نے پہلے اس ملک کے تین ٹکڑے کئے اور اب اِس کو موت کے دہانے پر پہنچا دیا ہے''۔

یہ کہہ کر وزیراعظم نڈھال ہو کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

(۱۸)

پاکستانی دارالحکومت اسلام آباد کے ایک دومنزلہ عالی شان بنگلے میں ایک بوڑھا آدمی اپنی لائبریری میں افسردہ بیٹھا ہوا تھا۔ ریٹائرمنٹ اور بڑھاپے کی زندگی وہ کتابیں پڑھ کر، اخبار میں کالم لکھ کر اور مچھلیاں پکڑنے کے مشغلہ میں گذارتا تھا۔ جب سے خوراک کی قلت ہوئی تھی راول جھیل مچھلیوں سے خالی ہوگئی تھی۔ دریاؤں میں تاب کاری سے آلودہ پانی کی وجہ سے پانی میں آبی حیات نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی، تو مچھلیاں پکڑنے کا مشغلے سے دل بہلانا ممکن نہ تھا۔ اب اِس بوڑھے آدمی کا زیادہ تر وقت گھر پر ہی گذر رہا تھا۔ ویسے بھی اب شہر میں جگہ جگہ لوٹ مار کا دور دورہ تھا، اِس صورت حال میں گھر سے نکلنا خطرے سے خالی نہ ہوتا تھا۔ یہ بوڑھا آدمی پاکستان کے ایٹمی پروگروم کی بنیاد رکھنے والوں میں سے ایک اہم انجینئر تھا۔

رات کافی بیت چکی تھی لیکن نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کی یوروپی نژاد بیوی کئی دفعہ اُس کو سونے کا کہہ کر خود سونے کے لئے جا چکی تھی۔ اس کی بیٹیاں، نواسے اور نواسیاں جو اُس کے پاس ہی آگئی تھیں وہ بھی سوچکی تھیں۔ پاکستانی اشرافیہ کے طبقے کا حصّہ ہونے کی وجہ سے اِن کو ڈیزل کا مناسب کوٹہ مل جاتا تھا۔ اس لئے گھر والے جنریٹر کے ذریعے ائرکنڈیشن چلا کر آرام سے سوسکتے تھے۔

بزرگ آدمی اپنا وقت گذارنے کے لئے ماضی کی کتاب سے ورق الٹتے ہوئے سوچنے لگا:

''یورپ کے خوبصورت ماحول میں رہتے رہتے نہ جانے اس کے دِل میں کیا خیال آیا کہ اس نے اپنے پیشے سے بددیانتی کرتے ہوئے اپنی کمپنی سے سنٹری فیوج کے ڈیزائن چوری کرنے کا منصوبہ بناڈالا''۔

ریٹائرمنٹ کی زندگی میں وہ خاصا مذہبی ہو چکا تھا۔ وہ اب تک مذہبی اخلاقیات پر اخبارات میں کئی مضامین لکھ چکا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اُس نے اپنی کمپنی سے سنٹری فیوج کے ڈیزائین چوری کرتے وقت، اسلامی اخلاقیات سے متعلق کچھ نہ سوچا تھا۔ اُس کی اِن خدمات کے صلے میں پاکستان کے قومی ایٹمی

پروگرام میں اُسے نمایاں مقام دیا گیا تھا۔ ملک کے وسائل اِس کے ہاتھوں میں اس لئے سونپ دیئے گئے تھے کہ وہ فوج کو جلد از جلد اس خوفناک ہتھیار سے مسلح کر سکے۔

کبھی کبھی اس کا ضمیر اس چوری پر اس کو کچو کے لگا تا تھا تو وہ اپنے ضمیر کو یہ کہہ کر سُلا دیتا تھا:

''ایٹم بم کی تیاری کے بعد ہندستان اور پاکستان آپس میں کبھی جنگ نہیں کریں گے۔ یہ ایٹم بم دراصل امن کا سفیر ثابت ہوگا''۔

افسوس کہ اس کے یہ خیالات اس وقت باطل ثابت ہوگئے جب ایک جنرل نے ہندوستانی کشمیر کے علاقے میں چپ چاپ چڑھائی کر کے دونوں ممالک کو جنگ کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔

اس بوڑھے ریٹائرڈ انجینئر نے اپنے ماضی کے دریچوں پر نظر دوڑاتے ہوئے سوچا:

''ایٹم بم کی تیاری کے دوران وہ اور اُس کے رفقائے کار سوچتے تھے کہ پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کے بعد ان کے ملک کا دِفاع ناقابلِ تسخیر ہو جائے گا، پھر اِن کے ملک کو بجٹ کا بیشتر حصہ دِفاع پر خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔ عام آدمی کی تعلیم اور صحت کا معیار بلند ہو جائے گا۔ پاکستان ایک سیکورٹی ریاست سے فلاحی ریاست میں تبدیل ہو جائے گا۔ مگر افسوس کی ایٹمی طاقت بننے کے بعد پاکستان کے دفاعی اخراجات اور بڑھ گئے تھے۔ یہاں تک کہ افواج پاکستان نے اپنی آمدنی میں مزید اِضافوں کے لیے، جائیداد اور رہائشی کالونیوں کے کاروبار میں بھی دخل اندازی شروع کردی تھی۔ پاکستان آرمی نے کاروبار میں کامیاب پیش رفت کے بعد بینکاری سے لے کر بیوٹی پارلر تک کے کاروباروں میں سرمایہ کاری شروع کردی تھی۔ اگر ایٹمی طاقت و ٹیکنالوجی ملک کے دفاع تک محدود رہتی تو پھر یہ پاکستان کا حق تھا۔ مگر طاقتور افراد نے اس ٹیکنالوجی کو دُوسرے ملکوں کے ہاتھوں بیچ کر پاکستان کی سلامتی کو خطرے میں ڈال دیا تھا''۔

یہ تمام باتیں سوچ کر اُس کا حلق شدّتِ جذبات سے خشک ہو گیا تھا۔

اُس نے قریب ہی رکھے ہوئے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر پیا اور سوچنے لگا:

''میں نے اس قوم کو کیا دیا؟، ایک خوفناک ہتھیار، خوفناک میزائل.

آج میری چرائی ہوئی ٹیکنالوجی کے باعث ملک کی آدھی آبادی مر چکی ہے۔ اور باقی بچنے والوں کی دہلیز پر موت دستک دے رہی ہے۔ پالتو مویشی مرتے جارہے ہیں۔ عجیب الخلقت بچے پیدا ہو رہے ہیں

گرمی روز بروز شدّت اختیار کرتی جا رہی ہے۔موت کا عفریت رفتہ رفتہ اس سرزمین سے زندگی کو نگل رہا ہے ۔اس تمام صورت حال کا ذمّے دار میں ہوں۔وہ ایک شیطانی خیال تھا جس نے مجھے قوم کی خدمت کے نام پر چوری کرنے کے لئے اُکسایا تھا۔دیکھا میں ایک بار پھر اپنے کرتوت کو شیطان کے سر تھوپ کر چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔نہیں!، میں اپنے آپ کو ہرگز معاف نہیں کر سکتا''۔

یہ سوچ کر اُس نے اپنی الماری سے بھرا ہوا ریوالور نکالا اور مزید کچھ سوچے بغیر کنپٹی پر رکھ کر فائر کر دیا۔

(۱۹)

بھاگ بھری اور خالد کو سیلاب کے پانی میں محصور اس وادی میں رہتے ہوئے آٹھ سال بیت چکے تھے۔ اس عرصے میں سیلاب کا پانی کافی حد تک خشک ہو چکا تھا۔ سیلابی پانی کے خشک ہونے کے ساتھ کھجوروں کے باغ کے بیچ موجود قدیم کنویں کا پانی بھی نیچے اترتے جا رہا تھا۔ اب کنویں سے پانی نکالنے کے بعد کئی روز کے وقفہ کے بعد دوبارہ پانی دستیاب ہو پاتا تھا۔ خالد نے غاروں میں سبزیاں اگانے کا جو تجربہ کیا تھا وہ کامیاب تو تھا، لیکن اب پودوں پر سبزیاں نہایت قلیل مقدار میں اُترتی تھیں۔ اللہ وسایا کا کہنا تھا کہ کیڑے مکوڑے اور شہد کی مکھیوں کے خاتمے نے زرعی پیداوار پر اثر ڈالا ہے لیکن یہ بات خالد کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ یہ لوگ ابھی تک قحط سے بچے ہوئے تھے لیکن آہستہ آہستہ جانوروں کا ریوڑ ختم ہو رہا تھا۔ بکریاں تو ختم ہو چکی تھیں البتہ اونٹ ذرا سخت جان واقع ہوئے تھے۔

خالد اونٹوں کو پانی پلانے کے بعد غار میں آ کر لیٹ گیا تھا، گرمی کی شدّت سے تھکن جلدی غالب ہو جاتی تھی۔ بھاگ بھری اونٹنی کا تازہ دودھ ایک پیالہ میں خالد کے لیے لے کر آئی۔

ماں کو دودھ کا پیالہ تھامے ہوئے دیکھ کر خالد نے اُس سے کہا:

''ماں! تم اپنی بہو کو کام کرنے کے لئے کیوں نہیں کہتی ہو؟، وہ دن بھر غار میں پڑی سوتی رہتی ہے!''۔

بھاگ بھری نے خالد کی غصے سے مغلوب گرجدار آواز سن کر کہا:

''پُتر! آہستہ آہستہ بات کر۔ کہیں اُس کی آنکھ نہ کھل جائے وہ بے چاری دُکھے دل کی ہے اُس کو اُوپر والے نے ایک ہی اولاد دی اور وہ بھی خوفناک اور چڑیل جیسی''۔

خالد نے ماں کے ہاتھ سے دودھ کا پیالہ لے کر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا:

''ماں!۔ چل، باہر کنویں کے پاس چل کر بیٹھتے ہیں۔ تجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں''۔

بھاگ بھری نے خوشی سے سر ہلا کر رضا مندی کا اظہار کیا۔ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ اس کا ساون اس سے دل کی بات کرے، دونوں ماں اور بیٹا چودھویں کے بھرپور چاند کی روشنی میں کنویں کی طرف چل دیئے۔

ماں نے راستے میں خالد سے پوچھا:

''تیری بیٹی کہاں ہے؟۔وہ کبھی کبھار ہی ڈیرے پر نظر آتی ہے''۔

خالد نے بڑا سا منہ بناتے ہوئے جواب میں کہا:

''ماں! اسے میری بیٹی نہ کہا کرو۔۔۔۔اُس کے جسم میں شاید کسی بدروح نے جنم لیا ہے۔اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بھی خوف آتا ہے۔دیکھو تو ذرا سات سال کی ہوئی ہے،لیکن دیکھنے میں سترہ سال کی لگتی ہے۔جنگلوں میں رات دن اپنے چاچے کے ساتھ گھومتی رہتی ہے جو خود بھی اُس کی طرح خوفناک ہے''۔

بھاگ بھری اپنی پوتی کی بابت سوال کر کے خود ہی شرمندہ ہو گئی تھی۔اس دوران یہ دونوں کنویں تک آ چکے تھے۔بھاگ بھری نے کنویں کی منڈیر پر بیٹھتے ہوئے خالد سے پوچھا:

''تُو کچھ کہنا چاہتا تھا''۔

خالد نے بھرپور چاند کی طرف ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا:

''دیکھ! ماں، میں نے اپنا وعدہ نبھایا اور شادی کر لی۔لیکن میرا وعدہ قاری صاحب سے اور اپنے اللہ سے بھی ہے۔وہ وعدہ اس کی راہ میں جہاد و قتال کا ہے۔دیکھ! میں اب یہاں مزید نہیں رُک سکتا۔سیلابی پانی اُتر چکا ہے۔تو نے بھی مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تُو مجھے غزوۂ ہند میں شریک ہونے سے نہیں روکے گی۔میں ایک عرصے سے دشمنوں کا خون نہ بہا سکنے کی وجہ سے شدید بے چینی کا شکار ہوں۔یہ بے چینی صرف اور صرف خون بہانے سے ہی ختم ہوتی ہے۔دیکھ ذرا میرے بازوؤں کو دیکھ یہ کہہ کر اس نے کُرتے کی آستین الٹ کر بازوؤں پر جگہ جگہ کاٹے جانے کے نشانات دکھائے۔خالد اپنی بے چینی دور کرنے کے لئے اکثر اپنے بازوؤں پر زخم لگاتا تھا۔اپنے بیٹے کے زخمی بازو دیکھ کر بھاگ بھری کی آنکھوں سے حیرت اور تکلیف واضح جھلک رہی تھی۔

خالد نے مزید کہا:

دیکھ، ماں! کل میں اللہ وسایا کو صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ اب میرے جہاد پر جانے کا وقت آ گیا ہے۔اگر کوئی میرے ساتھ جہاد پر جانے کو تیار ہے تو سو بسم اللہ۔اگر نہیں تو کوئی بات نہیں لیکن مجھے تو

اب جانا ہی ہوگا''۔

یہ کہہ کر اس نے پھر ایک نظر تاروں بھرے آسمان پر ڈالتے ہوئے کہا:

''نہ جانے قاری صاحب کا لشکر کہاں ہوگا؟ غزوۂ ہند کس مرحلے پر ہوگا! اب تو شاید اسلام کا پرچم دلی کے لال قلعے پر لہرا بھی چکا ہوگا۔

کاش ہم سیلاب کے گھیرے میں نہ آتے''۔

بھاگ بھری نے جواب میں کہا:

''اب تو نے جانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو سن! مجھے تیری لڑائی بھڑائی اور جہاد سے کوئی لینا دینا نہیں ہے لیکن میں تجھے اکیلے نہیں جانے دوں گی تو جہاں اور جس حال میں بھی ہوگا میں تیرے ساتھ رہوں گی۔۔اب میں تجھ کو دوبارہ کھونا نہیں چاہتی ہوں''. یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کے چہرے کو تر کرنے لگے۔

خالد نے اپنے کھردرے ہاتھوں سے ماں کے نرم رخساروں کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا:

''ماں! جہاد کے رستے میں بہت دشواریاں ہوتی ہیں۔ تم انہیں برداشت نہ کر پاؤ گی''۔

بھاگ بھری نے جواب میں کہا:

''تیری غیر موجودگی میں جو وڈیرے کے ظلم سہے تھے وہ بھی کچھ کم دشوار نہ تھے''۔

خالد نے ماں کے آنسوؤں کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا:

''ٹھیک ہے ماں جیسے تمہاری مرضی، جو بھی جانا چاہے وہ میرے ساتھ جہاد میں شریک ہو سکتا ہے''۔

بھاگ بھری خالد کی بات سن کر بہت خوش ہوئی؛ اُسے اچانک دُور پہاڑی پر سے ایک سرخ ستارہ اوپر نیچے حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا۔۔۔اُس نے اس منظر کی طرف نظر ٹکاتے ہوئے خالد سے کہا:

''یہ میری نظر کا دھوکا ہے یا واقعی کوئی ستارہ پہاڑی پر اُتر آیا ہے''۔

خالد نے غور سے پہاڑی کی طرف نظر جما کر دیکھنے کے بعد کہا:

''ماں لگتا ہے کہ کوئی بھولا بھٹکا مسافر اِدھر آنکلا ہے اس نے ہاتھ میں مشعل اُٹھا رکھی ہے۔ چاند اتنا روشن ہے کہ اندھیرے میں بھی صاف دکھائی دے رہا ہے''۔

یہ روشنی رفتہ رفتہ قریب آتی جارہی تھی۔اب خالد اور بھاگ بھری اپنی باتیں بھول کر قریب آتی ہوئی روشنی کو تکنے لگے تھے۔کچھ دیر میں روشنی کے اردگرد کچھ انسانی ہیولے واضح نظر آنے لگے تھے۔کچھ ہی دیر میں واضح ہوگیا تھا کہ کئی افراد اِن کے ڈیرے کی جانب بڑھ رہے تھے۔یہ لوگ تعداد میں پندرہ بیس کے قریب لگ رہے تھے۔جب یہ لوگ کچھ اور قریب آگئے تو نظر آنے لگا تھا کہ انہوں نے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھامی ہوئی تھیں۔خالد نے کنویں کے قریب درانتی ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے ماں کو کہا:

''ماں! تو دوڑ کر اللہ وسایا اور چاچا کرمو کو خبردار کر۔۔۔اِن آنے والوں کے ارادے اچھے نہیں معلوم ہوتے''۔

بھاگ بھری تیزی سے اللہ وسایا کے گھر کی طرف بڑھ گئی جو کہ کنویں سے زیادہ دور نہ تھا۔اللہ وسایا کچھ ہی دیر میں لاٹھی تھامے اپنے بھائی کے ساتھ کنویں پر پہنچ گیا۔

آخرکار اجنبیوں کا یہ ٹولہ اُن کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ان لوگوں میں سے ایک کے کندھے پر جی۔۳ رائفل لٹک رہی تھی جو کہ عام طور پر صرف پاکستان کے فوجی ہی استعمال کرتے ہیں۔

رائفل بردار آدمی نے للکارتے ہوئے کہا:

تمہارے پاس جو بھی اجناس اور مویشی ہیں ہمارے حوالے کردو!''۔

''خالد نے جواب میں کہا:

''ہمارے پاس جو بھی کچھ ہے، ہمارے خون پسینے کی کمائی ہے ہم یہ سب تمہارے حوالے کیوں کریں ۔۔۔کچھ تو اللہ کا خوف کرو'' رائفل بردار آدمی نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ یہ جواب دیا:

''اللہ کا خوف، ہاہا۔دُنیا میں سب سے بڑا خوف بھوک سے مرنے کا ہے۔یہ خوف سارے خوف بھلا دیتا ہے۔تم لوگ یہاں مزے میں ہو بستیوں کی بستیاں بھوک اور قحط سے قبرستانوں میں بدل چکی ہیں''۔

خالد نے رائفل بردار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''تم لوگ بھوکے ہو تو ہم تم کو کھانا کھلا دیتے ہیں''۔

رائفل بردار نے کہا:

''بات ایک وقت کے کھانے کی نہیں۔لوگ بھوک سے مر رہے ہیں تم لوگوں کو مویشیوں اور کھانے کا

ذخیرہ کرنے کا کوئی حق نہیں ۔۔ یہ حق صرف اور صرف ہمارا ہے۔ہم تعداد میں زیادہ ہیں ۔ہمارے پاس اسلحہ ہے۔اب خوراک صرف طاقتور کے قبضے میں ہوتی ہے''۔

خالد خاموش رہا۔

رائفل بردار اِس بار بڑھک مارتے ہوئے بولا:

''سنتے ہو! یا تم سب کو جلا کر راکھ کر دیں ہم لوگوں کو تم سے اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔

ابھی اس رائفل بردار کی چنگھاڑ ختم نہ ہوئی تھی کہ خالد کی عجیب الخلقت بیٹی اور اللہ وسایا کے بھائی کا عجیب الخلقت بیٹا دوڑتے ہوئے اِن لوگوں کے عین بیچ میں آ کر کھڑے ہو گئے۔خالد کی بیٹی کا ڈیل ڈول اور اس کی صورت دیکھ کر رائفل بردار کے چہرے پر خوف کے سائے لہرانے لگے۔رائفل بردار نے اپنے خوف پر قابو پانے کے بعد ایک بار پھر دھاڑ مارتے ہوئے کہا:

''کدھر ہیں تمہارے مویشی اور تم نے اجناس کہاں ذخیرہ کی ہیں؟''۔

رائفل والے کی دھاڑ کے جواب میں خالد کی بیٹی نے ایک زوردار چیخ ماری۔اِس کی چیخ اتنی زوردار تھی کہ خالد کی بیوی غار سے نکل کر دوڑتی ہوئی کنویں کی طرف چلی آئی۔خالد کی گونگی بیٹی نے ایک بار پھر زور سے چیخ ماری۔اس دفعہ اس کی چیخ کو سن کر رائفل بردار نے اپنے کندھے سے رائفل کو اُتارا۔جیسے ہی اُس نے رائفل کو اُتارا خالد کی بیٹی نے تیزی سے بڑھ کر رائفل بردار کے سر کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ایسا گھمایا کہ اس کی گردن زوردار طریقے سے گھوم گئی۔اس کی گردن کڑکڑ کی ایک زوردار آواز سے ٹوٹ گئی تھی۔ اُس میں سے گرم گرم خون کا ایک فوارہ اُبل پڑا۔خالد کی بیٹی نے حملہ آوار کے سر کو بالوں سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ اُس نے گردن سے اُبلتے ہوئے خون پر منہ رکھ کر اپنی پیاس بجھانا شروع کر دی۔اسی دوران اللہ وسایا کا بھتیجا بھی ایک لاٹھی والے کی گردن اسی طرح سے اتار چکا تھا۔اس خوفناک منظر کو دیکھ کر خالد کی بیوی بے ہوش ہو کر زمین پر گر چکی تھی، بھاگ بھری نے خالد کے پیچھے چھپ کر پناہ لے لی تھی۔یہ دونوں عجیب الخلقت بچے حملہ آوروں کا سر اور دھڑ اٹھا کر پہاڑی کی طرف چل پڑے۔باقی حملہ آور خوف سے دُم دبا کر بھاگ چکے تھے۔

خالد اپنی بیٹی کی طاقت اور وحشت کو دیکھ کر ابھی تک سکتے میں کھڑا ہوا تھا۔اللہ وسایا کی آنکھیں اس منظر کو دیکھ کر پتھرا گئی تھیں۔وہ نڈھال ہو کر زمین پر بیٹھ گیا تھا۔اُس کے بیٹھنے پر باقی افراد بھی اللہ وسایا کے

اردگرد بیٹھ گئے۔

اوسان بحال ہونے کے بعد اللہ وسایا نے کہا:

''جب یہ بچے ہوئے تھے تو مجھے اسی وقت شک ہوگیا تھا کہ ان بچوں میں جنات کی روح ہے''۔

بھاگ بھری نے بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا:

''اب جیسے بھی پیدا ہوگئے ہیں بھگوان نے ہی پیدا کیا ہے۔ اب اِن کی فکر چھوڑو! یہ سوچو کہ آگے کی زندگی کیسے گزارنا ہے۔ خالد نے تو جہاد پر جانے کا فیصلہ کرلیا ہے''۔

اللہ وسایا یہ سن کر سوالیہ نظروں سے خالد کی طرف دیکھنے لگا۔

خالد نے اس کی نظروں میں چھپے ہوئے سوال کو بھانپ کر کہا:

''چاچا میں نے آج ہی ماں کو کہہ دیا تھا کہ اب میں یہاں مزید نہیں رک سکتا، میرا فرض مجھے پکار رہا ہے۔ غزوۂ ہند اور جہاد خراسان اپنے کمانڈر کا منتظر ہے۔ اُس کا کمانڈر کا جو بد نصیبی سے اپنے لشکر سے پیچھے رہ گیا ہے۔ چاچا میں تم سب کو جہاد میں شرکت کی دعوت دیتا ہوں یہ دنیا فانی ہے۔ شہادت اور وہ بھی میدان جنگ میں۔ چاچا! سمجھ لو کہ جیسے راتوں رات لاٹری نکل آئے۔ شہید کا مقام لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے''۔

اللہ وسایا نے جواب میں کہا:

''پتر! ہم ٹھہرے دہقانی لوگ، ہمارا کام زمین کا سینہ چیرنا ہے۔ ہم انسانوں کا سینہ نہیں چیر سکتے''۔

خالد نے جواب میں کہا:

''چاچا! انسان اور کافر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ آدمی کلمہ پڑھنے کے بعد ہی انسان بنتا ہے''۔

اللہ وسایا نے جواب میں کہا:

''یہ تو تمہارا خیال ہے۔ ہمیں کون سا کلمہ آتا تھا۔ پھر بھی تم کو اور تمہاری ماں کو پناہ دی اور اپنی بیٹی سے تیرا بیاہ کر کے تیرا گھر بسایا۔ ہم نے تو کلمہ اور نماز پڑھنا بھی تم سے ہی سیکھا۔ پتر! کلمہ نہ آنے کے باوجود ہم میں انسانیت تو تھی''۔

خالد نے موضوع بدلتے ہوئے کہا:

''چاچا! اس بات کو چھوڑو۔ میرا جانا اٹل ہے''۔

اللہ وسایا نے بہت دکھ بھرے لہجے میں ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا:

''مجھے معلوم ہے کہ تم رکنے والے نہیں ہو پر اپنی بیوی کا تو کچھ خیال کرو''۔

خالد نے جواب میں کہا:

''میں اُس کو اپنے ساتھ لے جانے پر تیار ہوں''۔

خالد کی بیوی نے پہلی بار لب کشائی کرتے ہوئے کہا:

''مجھے کہیں نہیں جانا تم کو جہاں جانا ہے جاؤ جو بھی کرنا ہے کرو۔ میں تمہیں کیسے روک سکتی ہوں۔ بھلا مرد کے آگے کبھی عورت نے نہ کی ہے!''۔

خالد کی بیوی کی بات سن کر سب خاموش ہو گئے۔

اللہ وسایا نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا:

''بیٹا! جس نے اپنی بیٹی دے دی تو سمجھ لو کہ اس نے اپنا سب کچھ دے دیا۔۔۔ ہم غریبوں کے پاس تمہیں دینے کے لیے تو کچھ نہیں البتہ اگر تم چاہو تو میری اونٹنی لے سکتے ہو۔ اس کے تھن دودھ سے بھرے ہوئے ہیں۔ تم اس کے دودھ کی وجہ سے سفر میں بھوکے نہیں رہو گے۔ تم جتنا بھی کھانے پینے کا سامان اس پر لاد سکو لاد لینا۔ مجھے تو افسوس یہ ہے کہ بہن بھاگ بھری بھی ہم سے جدا ہو رہی ہے۔ تم لوگوں نے جانے کی ٹھان ہی لی ہے! لیکن ہماری آنکھیں تم لوگوں کی واپسی کی منتظر رہیں گی''۔

خالد نے اپنے سُسر کی بات سن کر کہا:

''چاچا! اگر اللہ کا حکم آڑے نہ آتا تو میں تم کو چھوڑ کر کبھی نہ جاتا۔ جہاد اور ہجرت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تم دیکھنا۔ میں ایک دن ضرور واپس آؤں گا۔ میں ایک سیاہ گھوڑے پر سوار ہوں گا۔۔۔ خلافت کا سیاہ پرچم میرے ہاتھ میں ہوگا۔ اور اِس زمین پر اللہ کا نظام نافذ ہو چکا ہوگا''۔

اللہ وسایا نے جواب میں کہا:

''اوپر والا تمہارے خوابوں کو پورا کرے''۔

خالد کی بیوی کی سسکیوں سے ماحول افسردہ ہوتا جا رہا تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے رُونما ہونے والے ہولناک واقعہ کے خوف کا اثر خالد کے جانے کی خبر میں کہیں تحلیل ہو گیا تھا۔

(۲۰)

اس دفعہ البرٹ کی داستان گوئی کا دورانیہ کافی طویل تھا، لیکن طوالت کے باوجود کسی کو بھی اکتاہٹ کا احساس نہ ہوا تھا۔ البرٹ اتنی طویل داستان گوئی کے بعد تھک گیا تھا۔ وہ پانی کی بوتل ہاتھ میں لے کر ساتھی طالب علموں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اب اِس کی جگہ پروفیسر صاحب سنبھال چکے تھے۔ طالب علموں کے اذہان میں کئی سوالات مچل رہے تھے۔ وِنود نے سب سے پہلے ہاتھ کھڑا کیا تھا۔ اس لئے پروفیسر نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''کیا سوال ہے تمہارے ذہن میں ونود؟''۔

ونود نے کہا:

''ایسا لگتا ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کی سزا کے طور پر دنیا نے ہندوستان کی اس طرح سے مدد نہیں کی جیسے کہ کرنی چاہئے تھی''۔

پروفیسر صاحب نے کہا:

''مجھے ایسی کسی بات کا ثبوت نہیں مِلا ہے کہ دنیا نے مدد کرنے میں سستی سے کام لیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ تباہی اندازوں سے کہیں زیادہ تھی.. پورے علاقے کا بنیادی مواصلاتی نظام ختم ہوگیا تھا صرف ہوائی ذریعے سے اتنے بڑے علاقے کی امداد کرنا ممکن نہ تھا۔ سب سے بڑی تباہی یہ تھی کہ ریاستی ادارے سلامت نہ رہے تھے۔ برصغیر کا زرعی نظام نہری نظام سے پہلے مون سون پر منحصر ہوتا تھا۔ خوفناک سیلاب نے نہری نظام کو ختم کر کے زراعت کو دوبارہ بارانی نظام کی طرف لوٹا دیا تھا لیکن بارشیں نہ ہونے سے خوراک کی پیداوار ختم ہوگئی تھی۔ اتنا بڑا خطہ دیکھتے ہی دیکھتے قحط کا شکار ہوگیا تھا''۔

اس دوران البرٹ نے بھی اپنا ہاتھ سوال پوچھنے کے لئے اُٹھالیا تھا۔

پروفیسر صاحب نے اس کا ہاتھ کھڑا ہوا دیکھ کر پوچھا:

''لگتا ہے کہ تم داستان سنا کر تھکے نہیں ہو! خیر پوچھو، کیا سوال ہے تمہارے ذہن میں؟''۔

البرٹ نے پوچھا:

''پاکستان میں انتہا پسندی کی سوچ کی ابتدا کہاں سے ہوئی تھی؟۔کیا پاکستان میں انتہا پسندی کی سوچ ہندستان پر بھی اثر انداز ہوتی تھی؟''

پروفیسر صاحب نے کچھ دیر سوچ کر یوں جواب دیا:

''دراصل پاکستان کی بنیاد ہی انتہا پسندانہ تھی، 'دو قومی نظریہ' جیسے احمقانہ خیال کو پاکستان بنانے کا نعرہ بنایا گیا تھا، بعد میں یہ بے بنیاد خیال پاکستان کے لوگوں میں اتنا راسخ ہو گیا تھا کہ پاکستان بننے کے بعد بھی اس خیال سے پیچھا چھڑانا ناممکن ہو گیا تھا.جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ رہی سہی کسر پاکستان کے آئین کی قرار دادِ مقاصد نے پوری کر دی تھی.اس قرارداد کے مطابق پاکستان میں ہر قانون قرآن اور سنت کے مطابق بنا ضروری تھا.دوسری بات یہ ہوئی تھی کہ پاکستان کے قیام کے کچھ ہی عرصے بعد تحریک ختم نبوت شروع ہو گئی تھی۔اس تحریک نے ریاست کو مذہبی اور فرقہ وارانہ معاملات میں اس قدر دھکیل دیا تھا کہ قومی اسمبلی میں قانون سازی کے بجائے سرکاری سطح پر مذہبی مناظرے ہونے لگے تھے. یہاں تک کہ قومی اسمبلی نے سنی مسلمانوں کے ایک فرقے کو کافر قرار دے کر ان کے بنیادی مذہبی اور سیاسی حقوق ختم کر دیئے تھے.تمہارے سوال کے دوسرے حصے کا جواب یہ ہے کہ، ہاں! پاکستان میں بڑھتی ہوئی انتہا پسندی کا اثر ہندو انتہا پسندی کو بھی بڑھاوا دیتا تھا'' مزید یہ کہ؛ دنیا بھر کی قومی حکومتوں کو تسلیم نہ کرنا اور ایک عالمی خلافت کی تشکیل کے احمقانہ نظریات کی ترویج نے بھی مسلمانوں کے ایک گروہ کو انتہا پسندی کے راستے کا راہی بنا ڈالا تھا''۔

پروفیسر صاحب نے اپنا جواب مکمل کرنے کے بعد کہا:

''البرٹ کل سے ناول کا تیسرا اور آخری حصہ شروع کریں گے جو اس خطے میں خشک سالی کے دور کی عکاسی کرتا ہے۔اب آپ مجھ کو اجازت دیں۔ یہ کہہ کر پروفیسر صاحب کھونٹی پر لٹکا ہوا کوٹ اٹھا کر ہال سے باہر نکل گئے۔

تیسرا حصّہ

خشک سالی کا دور

(۱)

سورج ڈھلنے کے ساتھ ہی اللہ وسایا نے اپنی اونٹنی پر مختلف تھیلوں میں چھوہارے، خشک گوشت، خشک سبزیاں اور مشکوں میں پانی لاد دیا تھا۔ ایک بڑے تھیلے میں اونٹنی کے لئے خشک چارا بھر دیا گیا تھا۔ چارے میں اللہ وسایا نے خشک اجناس کو خاص طور سے ملایا تھا تاکہ اونٹنی کو غذائیت کی کمی نہ ہو اور وہ دودھ دیتی رہے۔ مقتول حملہ آور کی جی تھری۔۳ رائفل اور گولیوں سے بھرا میگزین خالد نے کندھے پر لٹکا رکھا تھا۔ اب وہ لشکرِ اسلام سے جا ملنے کو پوری طرح تیار تھا۔

اِن تمام تیاریوں کے بعد خالد نے اللہ وسایا اور اس کے بھائی سے گلے ملنے کے بعد اپنی ساس اور بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''آپ سب لوگ میرا کہا سُنا معاف کر دیں''۔

یہ کہنے کے بعد اس نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''ماں! اب تم بھی سب سے مل لو نجانے کب دوبارہ مُلاقات ہو''۔

بھاگ بھری نے خالد کی بات سن کر ساری عورتوں کو گلے سے لگا کر الوداع کیا اور اس کے بعد اپنی بہو سے کہنے لگی:

''بیٹی! اگر میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں یہاں چھوڑ کر کبھی نہ جاتی''۔

اس کی بہو نے جواب میں صرف سسکیاں بھرنے پر اکتفا کیا۔ بھاگ بھری نے اسے گلے سے لپٹا کر کہا:

''دعا کرنا کہ ہم جلد واپس آئیں' اُوپر والے کا کرم ہو اور بارش ہو جائے! یہ بھی دعا کرنا کہ بھگوان پہلے جیسا موسم دوبارہ لوٹا دے... روٹھے ہوئے پنچھی واپس آجائیں اور ان پنچھیوں کی طرح ہم بھی لوٹ آئیں''۔

بھو نے سسکیوں کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے بھاگ بھری کو اُونٹنی پر سوار ہونے میں مدد دی. ماں کے سوار ہونے کے بعد خالد بھی اونٹنی پر سوار ہو گیا۔ اِن لوگوں کے سوار ہونے کے بعد اللہ وسایا نے اونٹنی کی مہار پکڑ کر ہش کی آواز نکالی تو اونٹنی کھڑی ہوگئی۔ اللہ وسایا اونٹنی کی مہار پکڑ کر چلنے لگا۔ وہ اپنے داماد کو پہاڑی کے اُس درّے تک پہنچانا چاہتا تھا، جو قریبی قصبے کی طرف جاتا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد اللہ وسایا نے اونٹنی کو بٹھا دیا۔ اونٹنی کے بیٹھتے ہی خالد اونٹنی سے اُتر آیا۔

اللہ وسایا نے ایک راستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خالد سے کہا:

''پتر! یہ رستہ تم کو قریبی قصبے کو لے جائے گا اگر اونٹنی بغیر رکے چلتے رہی تو رب کی مرضی سے تم صبح ہونے سے پہلے ہی قصبے تک پہنچ

جاؤ گے''۔

یہ کہنے کے بعد اس نے خالد کو گلے سے لگایا، وہ اپنے آنسو، جو نہ جانے کب سے روکے ہوئے تھا، مزید نہ روک پایا۔

اور خالد کو گلے لگا کر بلک بلک کر رونے لگا۔

خالد نے اسے اپنے گلے سے پرے ہٹاتے ہوئے کہا:

''چاچا! بس، خاموش ہو جاؤ، کہیں تمہارا اس طرح سے رونا اور تمہاری یہ محبت جہاد کے رستے میں رکاوٹ نہ بن جائے، اگر میرا اِرادہ بدل گیا تو تمہیں اور مجھے جہنم میں جانے سے کوئی نہ روک سکے گا''۔

اللہ وسایا نے خالد کی بات سن کر کُرتے کی آستین سے آنسو خشک کر کے کہا:

''جا! پتر، اللہ بیلی''۔

خالد نے اونٹنی پر بیٹھ کر مہار کو اور زور دار جھٹکا دے کر ہش کی آواز نکالی تو اونٹنی کھڑی ہوگئی۔ خالد نے ایک نظر اللہ وسایا پر ڈالی اور مہار کو جھٹکا دیا۔ اونٹنی نے منہ موڑ کر اللہ وسایا کی طرف ایسے دیکھا کہ جیسے اُسے آخری بار دیکھ رہی ہو۔ بھاگ بھری نے دونوں ہاتھ جوڑ کر بہت انکساری سے اللہ وسایا کی طرف دیکھا تو اللہ وسایا نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ کر انکساری سے اس کی تکرِیم کی۔

اونٹنی کچھ آگے نکل گئی تو خالد نے ماں سے کہا:

''میں نے تمہیں کتنی دفعہ کہا ہے کہ تم یہ ہندو کافروں کے طریقے سے سلام نہ کیا کرو مگر تم میری نصیحت ہمیشہ بھول جاتی ہو''۔

بھاگ بھری نے جواب میں کہا:

''میں پوری کوشش کرتی ہوں کہ اسلامی طریقے سے ہی سلام کروں لیکن میں کیا کروں کہ جب کسی کے لئے میرے دل کی گہرائی سے محبت اُبھرتی ہے تو میرے ہاتھ خود بخود جڑ جاتے ہیں! میرا کوئی اختیار نہیں ہوتا اپنے آپ پر''۔

خالد کو ماں کی بات سمجھ نہ آئی تو وہ خاموش ہو گیا۔

چاندی رات میں اونٹنی چلتی جا رہی تھی، رات کے باوجود گرمی کے مارے ان کے پسینے بہے جا رہے تھے۔

اللہ وسایا کے اندازے کے مطابق یہ لوگ صبح ہونے سے پہلے ایک بڑے قصبے میں پہنچ گئے تھے۔ وہاں سڑکوں پر جا بہ جا انسانوں اور جانوروں کے پنجر بکھرے ہوئے تھے۔ابھی سورج نکلنے میں کافی وقت باقی تھا لیکن گرمی میں اضافہ شروع ہو چکا تھا. خالد کی نظریں کسی مسجد کو تلاش کر رہی تھیں. وہ چاہتا تھا کہ اللہ کے گھر میں قیام کرے اور وہیں سے جہاد کی تحریک کی ابتدا کرے. وہ اونٹنی سے اُتر آیا اور اس کی مہار پکڑ کر ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے چلنے لگا۔

اچانک ایک نیم مخدوش گھر سے ایک عورت نکل کر اس کی جانب بڑھ کر فریاد کرتے ہوئے گویا ہوئی:

''میرا بچہ بھوک سے مر رہا ہے. کچھ کھانے کو ہو تو دے دو۔ اللہ تم لوگوں کو ڈکیتوں سے محفوظ رکھے''۔

خالد نے عورت کی صدا سن کر اونٹنی کی مہار کھینچ کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا. اونٹنی کے بیٹھنے کے بعد اس نے بھاگ بھری کو اونٹنی سے اُترنے کے لئے سہارا دیا۔ بھاگ بھری جیسے ہی اونٹنی سے اتری تو درد کے مارے اُس کی چیخیں نکل گئیں. گھنٹوں اونٹنی پر سوار رہنے سے اس کی کمر اور ٹانگیں بُری طرح اکڑ گئی تھیں. بھاگ بھری نے اپنی کمر کو ہلا کر اس کی اکڑ کو دور کرنے کی کوشش کی۔

اس دوران خالد نے اس عورت سے دریافت کیا:

''تمہارے پاس کوئی برتن ہے دودھ کے لئے؟''

عورت نے بے یقینی کے عالم میں کہا: ''دُودھ!''

خالد نے کہا: ''تم برتن لے آؤ ہم تم کو بچے کے لئے دُودھ دے دیں گے''۔

عورت لپک کر اپنے کھنڈر نما گھر میں چلی گئی۔اس دوران خالد نے بھاگ بھری کو مشک سے تھوڑا سا پانی پینے کو دیا۔اس نے دو گھونٹ پانی پینے کے بعد کچھ پانی سے اونٹنی کے تھنوں کو دھویا تا کہ اُن میں دودھ اُتر آئے۔کچھ ہی دیر گذری تھی کہ وہ عورت ایک برتن لے آئی۔ بھاگ بھری نے اُس کے ہاتھ سے برتن لے کر اس میں اونٹنی کے تھنوں سے دودھ دوھنا شروع کر دیا۔دودھ کی دھار برتن پر پڑنے سے ایک آہنگ پیدا ہو رہا تھا جسے دودھ مانگنے والی عورت اتنے انہماک سے سن رہی تھی کہ جیسے کسی جلترنگ کی آواز ہو۔خالد کی آواز نے اُس کی توجہ کو دودھ کے برتن سے آنے والی آواز سے ہٹا دی۔

خالد نے اُس سے پوچھا:

''تم نے دعا دی تھی کہ اللہ ہمیں ڈاکوؤں سے محفوظ رکھے؟''۔

ہاں! لیکن تم اتنی حیرانی سے کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا تم کسی اور دنیا سے آئے ہو؟''

خالد نے جواب میں کہا:

''ہمارا علاقہ سیلابی پانی میں برسوں محصور رہا تھا،اس لئے ہمیں باقی ملک کی کوئی خبر نہیں۔ہم تو ابھی وہاں سے نکل کر آ رہے ہیں''۔

عورت نے حیرانی سے کہا:

''ہاں میں بھی یہی سوچ رہی تھی کہ تم لوگوں کے چہرے کتنے تروتازہ ہیں!''۔

اسی دوران بھاگ بھری نے دودھ کا برتن عورت کی طرف بڑھاتے ہوئے خالد سے کہا:

''اس دُکھیاری کو کچھ چھوہارے بھی تھیلے سے نکال کر دے دے''۔

خالد نے ماں کی بات سن کر ایک تھیلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا:

''وہ ڈاکوؤں کا کیا قصہ ہے؟''

عورت نے حیرت سے کہا:

''کمال ہے! تم کو کچھ خبر نہیں،حکومت نے ہیلی کاپٹر سے ریڈیو گرائے ہیں جن سے ساری خبریں ملتی

ہیں، کیا تم کو وہ ریڈیو نہیں ملا ؟''

خالد نے نفی میں سر ہلا دیا۔

عورت نے کہا:

''ذرا ٹھہرو! میں ابھی آئی''

جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک گیند نما ریڈیو تھا۔

اس نے یہ ریڈیو خالد کو دیتے ہوئے کہا:

''یہ میرے مرحوم شوہر کا ہے اسے تم رکھ لو، میرے پاس ایک اور بھی ہے، تم کو اس کے ذریعے حالات سے آگاہی ملتی رہے گی''۔

خالد نے خوشی خوشی اُس سے ریڈیو لے لیا۔

خالد نے اِس عورت کے سامنے اپنا سوال دوبارہ دہرایا:

''وہ ڈاکوؤں والی کیا بات ہے؟''۔

عورت نے کہا:'' اوہ..وہ.....بہت سے لوگوں نے چھاؤنی کے ڈوب جانے کے بعد وہاں سے اسلحہ لوٹ کر اپنے مسلح لشکر بنا لئے ہیں. پانی اور خوراک پر ان ہی ڈاکوؤں کا قبضہ ہے. یہ لوگ سونے اور چاندی کے بدلے میں خوراک اور پانی دیتے ہیں. یہ لوگ جس کو چاہے لوٹ لیتے ہیں. مویشی اور نوجوان لڑکیاں اُن کا خاص شکار ہوتی ہیں. اِن کو جیسے ہی خبر ملے گی کہ تمہارے پاس اونٹنی اور خوراک ہے وہ تم پر ضرور حملہ کریں گے''۔

خالد نے اس عورت کے لہجے سے متاثر ہو کر کہا:

''تم پڑھی لکھی لگتی ہو؟''۔

''ہاں، میں مقامی کالج میں تاریخ پڑھاتی تھی''۔

خالد نے یہ سن کر کہا:'' تاریخ کا علم ایک شیطانی علم ہے. یہ علم اس شہر کو نہ بچا سکا. اگر تم نے قرآن کا علم سیکھا ہوتا تو شاید آج اس شہر کا یہ حال نہ ہوتا''۔

عورت نے خالد سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا، وہ خاموش ہو گئی۔

خالد نے اُس سے پھر ایک سوال پوچھا:

''کیا اس شہر میں کوئی مسجد سلامت بچی ہے؟''۔

اس عورت نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا:

''جامع مسجد اونچائی پر ہونے کی وجہ سے بچ گئی ہے. اس دوران بھاگ بھری نے کچھ اجناس جھولی میں بھر کر اس عورت سے اپنی جھولی پھیلانے کو کہا۔ عورت نے جھولی پھیلائی تو بھاگ بھری نے اجناس اس کی جھولی میں ڈال دیں۔ وہ عورت تشکر سے بھرپور نگاہوں سے دونوں کو دیکھنے لگی. بھاگ بھری نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا:

''جا، بیٹی! تیرا بچہ بھوکا ہے''۔

یہ سن کر وہ عورت ایک ہاتھ سے بھری جھولی سنبھالے اور ایک ہاتھ میں دودھ کا برتن لئے گھر کی طرف چلی جب کہ خالد نے اونٹنی کی مہار پکڑ کر جامع مسجد کا رُخ کر لیا۔

(۲)

خالد اونٹنی کی مہار تھامے کچھ دیر اس عورت کی بتائی ہوئی سمت کو چلتے رہا. کچھ ہی دیر میں اسے مسجد کے مینار نظر آنے لگے. اُسے مسجد تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہ لگی. یہ اس قصبے کی جامع مسجد تھی جو سرخ اینٹوں سے تعمیر کی گئی تھی۔ مسجد کا مرکزی دروازہ یا تو ٹوٹ چکا تھا یا کوئی اکھاڑ کر لے جاچکا تھا. وہ اپنی اونٹنی کو لئے مسجد کی چہار دیواری میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ صحن کے بیچ لگے بڑے سے برگد کو لوگ کاٹ چکے تھے، اب صرف موٹا سا تنا باقی بچا تھا۔ شاید اسے کاٹنا لوگوں کے لئے ممکن نہ تھا۔ وہ اِس بات پر حیران تھا کہ راستے میں نظر آنے والے تقریباً تمام درخت سوکھے ہوئے تھے، جیسے کہ اُن درختوں کی زندگی کو سُوکھے کی بیماری چاٹ گئی ہو۔

اس نے مسجد کے برآمدے میں اونٹنی کی مہار کو ایک ستون سے باندھ کر اس پر لدا ہوا سامان اتار کر اس کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ بھاگ بھری نے اونٹنی کے آگے چارہ ڈال کر اس پر پانی چھڑکنا شروع کر دیا تا کہ چارے میں کچھ تازگی آجائے. اونٹنی بہت بھوکی تھی اس نے فوراً ہی چارہ کھانا شروع کر دیا. مسجد کی حالت زار بتا رہی تھی کہ وہ آباد نہیں ہے۔ وہ جوتے اتار کر مسجد کے اندر آیا تو بھاگ بھری بھی اس کے پیچھے چل پڑی۔

خالد نے جب ماں کو مسجد میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو اُسے کہا:

''ماں! جب تک مسلمان نہ ہو جاؤ گی پلید رہو گی، تم مسجد میں داخل نہیں ہو سکتیں، باہر ہی رہو''۔

بھاگ بھری بیٹے کی بات سن کر باہر ہی رک گئی. راج جیسے ہی مسجد میں داخل ہوا اُسے کچھ آوازیں سنائی دیں. اس نے فوراً اپنے کندھے سے رائفل کو اُتار کر بولٹ چڑھالیا. کچھ دیر میں اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اس نے دیکھا کہ کچھ مریل کتے مسجد میں پناہ لئے ہوئے تھے۔

کتوں کو مسجد میں دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھا اور اس نے غصّے سے کہا:

''خنزیر کی اولاد و، تم کو پناہ کے لئے اللہ کا گھر ہی ملا تھا؟' یہ کہہ کر اُس نے ان کتوں کو ٹھوکروں سے مارنا شروع کردیا، یہ مصیبت کے مارے کتے نحیف سی آواز نکال کر باہر کو لپکتے اور پھر دوٗ بارہ مسجد میں گھسنے کی کوشش کرنے لگتے .کافی دیر تک خالد اور کتوں کے درمیان یہ آنکھ مچولی ہوتی رہی۔

آخر کار ایک کتے کا پیچھا کرتے ہوئے خالد باہر آیا اور اس نے تنگ آکر اس پر رائفل تانتے ہوئے کہا:

''جب تک تجھے جہنم میں نہ پہنچادوں تو باز نہیں آئے گا''۔

بھاگ بھری نے آگے بڑھ کر رائفل پرے دھکیلتے ہوئے کہا:

''کیا تو پاگل ہوگیا ہے کہ ان بے زبانوں کو مارنے پر تُل گیا ہے''۔

خالد نے غصّے سے کہا:

''ماں یہ پلید ہیں ان کی وجہ سے مسجد پلید ہوجائے گی''۔

بھاگ بھری نے جواب میں کہا:

''میں مسلمان نہیں پلید ہوں! چلو بات عقل میں آتی ہے، پر یہ بے چارے بے زبان ہیں، بھگوان کی پیدا کی ہوئی مخلوق بھلا کیسے پلید ہوسکتی ہے''

خالد نے جھنجھلاتے ہوئے کہا:

''اچھا تو پھر تو خود ہی ان کو مسجد سے نکال!''

یہ سن کر بھاگ بھری مسجد کے برآمدے کی طرف گئی جہاں اونٹنی بندھی ہوئی تھی؛ اُس نے مسجد کے برآمدے میں پڑا ہوا مٹکے کا ایک بڑا سا ٹھیکرا اٹھا کر مشک سے پانی نکال کر اس میں ڈالنے کے بعد کچھ خشک روٹی بھگو دی، روٹی پانی میں بھیگ کر فوراً ہی نرم ہوگئی۔ وہ یہ ٹھیکرا لے کر مسجد کے دروازے کے پاس گئی اور اس نے کتوں کو پچکارا؛ اُن کے حساس نتھنوں تک خوراک کی خوشبو پہلے ہی پہنچ گئی تھی؛ کتے ڈرتے ڈرتے مسجد سے نکل کر اس کے پاس آگئے؛ بھاگ بھری کتوں کی خوراک سے بھرے ٹھیکرے کو لے کر برآمدے میں اونٹنی کے پاس آگئی. کتے آہستہ آہستہ جھجکتے ہوئے اُس کے پیچھے برآمدے میں آگئے. بھاگ بھری نے جیسے ہی کھانے کا ٹھیکرا زمین پر رکھا تو دونوں کتے کھانے پر جھپٹ پڑے. دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے کھانا چٹ کر ڈالا۔ کھانا ختم کرکے یہ دونوں بھاگ بھری کے سامنے کھڑے ہوکر اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے دم

ہلانے لگے۔

اس منظر کو دیکھ کر خالد نے سوچا:

''میں تو اِن کتوں کو واقعی گولی مارنے والا تھا، ماں نے اِن کو کتنی آسانی سے رام کر لیا''۔

بھاگ بھری نے برآمدے سے آواز لگا کر خالد کو کہا:

''چل آجا! اب تو بھی روٹی کھالے، مجھے بھی بہت بھوک لگی ہے''۔

وہ ماں کی آواز سن کر اس کے پاس برآمدے میں آکر بیٹھ گیا۔ بھاگ بھری نے باسی روٹی پر چٹنی چپڑ کر اونٹنی کے تازہ دودھ کے ساتھ اسے دیتے ہوئے کہا:

''بیٹا! پانی احتیاط سے خرچ کرنا ہے۔۔اونٹنی کو زیادہ پانی کی ضرورت ہے، اور ہمارے کھانے کا ذخیرہ بھی زیادہ دن ساتھ نہیں دے سکتا''۔ خالد نے جواب میں کہا:

''اور اوپر سے تم نے ان دو کتوں کو بھی پال لیا ہے''۔

بھاگ بھری نے جواب میں کہا:

''ان معصوم جانوروں کے حصے کا کھا کر شاید ہم ایک دن زیادہ جی سکیں گے. میں کہتی ہوں کہ موت جب بھی آئے آتما کے سکون کے ساتھ آئے''۔

خالد نے روٹی چباتے ہوئے جواب میں کہا:

''ماں! تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں''۔

کھانا کھانے کے دوران پو پھٹنے لگی تھی۔

خالد نے جلدی جلدی کھانا کھا کر ماں کو کہا:

''ماں! ذرا پانی نکال دو میں وضو کر لوں''۔

بھاگ بھری نے جواب میں کہا:

''پانی کی صرف دو مشکیں ہیں، تو اِن کو وضو کر کے ضائع نہیں کر سکتا''۔

خالد نے سوچتے ہوئے کہا:

''ہاں ماں تم ٹھیک کہتی ہو، ہم جہاد کے دوران اکثر بغیر وضو کے نماز پڑھتے تھے۔ اچھا، میں ذرا اذان

دے دوں شاید کوئی اللہ کا بندہ اذان سن کر نماز پڑھنے آ جائے''۔

بھاگ بھری نے حیرت سے سر پکڑتے ہوئے کہا:

''پاگل نہ بن، اس عورت نے ہمیں بتایا تھا کہ یہاں ڈاکو تاک میں لگے ہوئے ہیں، تو چاہتا ہے کہ اذان سن کر اِن کو ہم تک پہنچنے میں آسانی ہو جائے''۔

خالد ماں کی بات سن کر سر ہلاتا ہوا مسجد میں نماز پڑھنے چلا گیا۔

جب وہ نماز پڑھ کر آیا تو اُس نے ماں سے کہا:

''مجھ کو یہ برآمدہ اور نیچے کی منزل محفوظ نہیں لگتی۔ میں اوُپر کا جائزہ لے کر آیا ہوں۔ اوپر ایک پکا کمرہ ہے جس کی کھڑکی مسجد کے صحن میں کھلتی ہے، ہم وہاں چلتے ہیں۔ جب تم سوؤ گی تو میں پہرا دوں گا اور جب میں آرام کروں تو تم کھڑکی سے باہر دیکھتی رہنا''۔

بھاگ بھری نے اثبات میں سر ہلا کر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ خالد نے رائفل کندھے پر لٹکائی اور گولیوں کا تھیلا اٹھا کر مسجد کے مینار کے اندر سے اوپر کو جاتے ہوئے زینے کی طرف چل پڑا بھاگ بھری کچھ چھوہارے اور پانی کی چھوٹی مشک لے کر خالد کے پیچھے چل پڑی۔

مسجد کے اوپر کے حصے پر بنا ہوا یہ کمرہ شاید مسجد کے چوکیدار یا موذن کے لئے بنایا گیا تھا۔ کمرہ بالکل خالی اور مٹی سے اٹا ہوا تھا۔ بھاگ بھری نے کمرکو اپنی چادر کی مدد سے صاف کیا۔

فرش کو صاف کرنے کے بعد بھاگ بھری نے خالد سے کہا:

''پتر! میری تو نیند اڑ چکی ہے تو سو جا، جب تیری آنکھ کھلے گی تو میں آرام کرلوں گی''۔

خالد نے ماں کی بات سن کر کہا:

''ٹھیک ہے ماں، ویسے بھی دن میں کوئی خطرہ نہیں، خوفناک گرمی میں کوئی باہر نکل ہی نہیں سکتا''۔ یہ کہہ کر اس نے اپنا کُرتا اتار کر اس کو تہہ کر کے تکیہ بنایا اور سر کے نیچے رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

(۳)

خالد کو مسجد میں رہتے ہوئے دو دن ہو گئے تھے. ابھی تک کسی بھی انسان نے مسجد کا رخ نہیں کیا تھا۔ پانی کا ذخیرہ تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ اب مسجد سے نکلے بغیر کوئی چارہ نہ تھا. اس نے ان ہی حالات میں لشکر اسلام کو ڈھونڈنے کے لئے باہر نکلنے کا فیصلہ کر لیا تھا، اسے اب سورج غروب ہونے کا انتظار تھا۔

ان دو دِنوں میں کتے خوراک ملنے کی وجہ سے چاق و چوبند ہو گئے تھے۔ وہ بھاگ بھری کے آس پاس منڈلاتے ہوئے اس کی ٹانگوں سے لپٹتے پھرتے تھے. خالد وقت گزارنے کے لئے ریڈیو سنتا رہتا تھا. ایک عرصے کے بعد اس کو خبریں سننے کو مل رہی تھیں۔ مگر ان خبروں میں جہاد کی یا دُنیا کے دوسروں ملکوں کی کوئی خبر نہ ہوتی تھی۔ یہ ریڈیو صرف سیلاب سے متاثر علاقوں کے بارے میں خبریں نشر کرتا تھا۔ ان خبروں سے یہ پتہ چل جاتا تھا کہ ہیلی کاپٹر کہاں امدادی سامان گرائیں گے، کہاں پر جنریٹر پھینکے جائیں گے اور کہاں پر دوائیں گرائی جائیں گی۔ خالد کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ان حالات میں قاری صاحب کے لشکر تک پہنچنا آسان نہ ہو گا۔

شام ہو چکی تھی، وہ اور بھاگ بھری ابھی تک اوپر والے کمرے میں ہی تھے کہ اچانک کتوّں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کتوّں کے شدت سے بھونکنے پر خالد نے چوکنا ہو کر رائفل کو اُٹھا لیا. بھاگ بھری نے کھڑکی سے جھانک کر مسجد کے صحن میں دیکھا کہ کچھ مسلح لوگ مسجد کے اندر آ چکے تھے. وہ لوگ اونٹنی کو ہنکانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اونٹنی اپنی جگہ سے نہیں ہل رہی تھی. کتے ان اجنبیوں پر بھونک رہے تھے۔

خالد نے کھڑکی سے یہ منظر دیکھ کر گرجدار آواز میں کہا:

''دفع ہو جاؤ یہاں سے! اونٹنی کو ہاتھ لگانے کی کوشش مت کرو''۔

ایک اجنبی مسلح آدمی نے خالد کی آواز کی سمت کا تعین کر کے فائر کر دیا۔ خالد کو فائر کی آواز سے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ جی تھری۔۳ رائفل کا فائر ہے۔ خالد کی پوزیشن اونچائی پر ہونے کی وجہ سے بہتر تھی۔ وہ مسجد کے

سارے صحن کو دیکھ سکتا تھا.اس نے ماں سے فرش پر لیٹنے کو کہا اور خود کھڑکی کے ساتھ چوکس ہو کر کھڑا ہو گیا.اس کے اندر کا لڑاکا مجاہد جاگ چکا تھا.اسے برسوں بعد مخالفوں پر آگ برسانے کا موقع ہاتھ آیا تھا۔

ایک اجنبی نے نیچے سے آواز لگائی:

''کون ہے اوئے؟ چل باہر نکل، یہ کہہ کر اُس نے ایک موٹی سی گالی بکی اور اونٹنی کو چھوڑ کر اپنے ساتھیوں سمیت مسجد کے صحن میں آگیا۔اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اوپر چھپا ہوا انسان مسلح بھی ہو سکتا ہے.اس آدمی نے ایک بار پھر گندی سی گالی بکی، وہ اپنے تینوں ساتھیوں سمیت خالد کے نشانے پر تھا۔خالد نے رائفل کو پہلے سے ہی لوڈ کر رکھا تھا، وہ بجلی کی سی سرعت سے کھڑکی پر آیا اور اس نے یکے بعد دیگر تین آدمیوں کو ڈھیر کر دیا جب کہ چوتھا زمین پر ایسے گرا کہ اس کی کلاشنکوف دور جا گری۔

اُسے گرتا ہوا دیکھ کر خالد نے چیخ کر اس سے کہا:

''اگر دونوں ہاتھ اوپر کر کے کھڑے ہو گا تو گولی نہیں ماروں گا۔گرے ہوئے آدمی نے اٹھ کر دونوں ہاتھ کھڑے کر لئے۔

خالد نے اب اسے مزید ہدایات دیتے ہوئے کہا:

''اب اپنا کُرتا اُتارو، مگر ہاتھوں کو آستینوں میں ہی پھنسے رہنے دے''۔

اس آدمی نے ایسے ہی کیا، ایسا کرنے سے اس کے دونوں ہاتھ آستینوں میں پھنس چکے تھے۔

اب خالد نے اسے نیا حکم دیتے ہوئے کہا:

''مینار کے اوپر چڑھنے والے زینے سے اوُپر چڑھنا شروع کر''۔

وہ آدمی اپنے دونوں ہاتھ آستینوں میں پھنسائے اوپر چڑھنے لگا.اب خالد نے کمرے سے نکل کر زینے کے پاس آکر پوزیشن لے لی.جیسے ہی اجنبی حملہ آور زینے پر نظر آیا خالد نے اسے رائفل کے نشانے پر لیتے ہوئے آگے بڑھنے کو کہا.وہ آدمی اب اوپر کی منزل تک آگیا تھا۔

وہ خالد کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر تک خالد کو دیکھنے کے بعد اس نے کہا:

''آپ کمانڈر خالد خراسانی؟''۔

خالد جانا پہچانا لہجہ سن کر چونک اٹھا!۔

خالد نے اس اجنبی کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

''معاویہ! مجاہد وادیٔ سوات''۔

یہ کہہ کر خالد نے رائفل کو دیوار سے ٹکا کر رکھنے کے بعد جلدی سے اِس کے ہاتھوں کو آزاد کروایا.اس کے ہاتھ آزاد کروانے کے بعد خالد اس کے گلے سے لپٹ گیا. بھاگ بھری دروازے پر کھڑی حیران سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔

خالد نے گلے ملنے کے بعد سوال کیا:

''کہیں میرے ہاتھوں مرنے والے وہ تینوں مجاہد تو نہیں تھے؟''۔

معاویہ نے جواب میں کہا:

''ہاں! یہ ہمارے مجاہد ساتھی ہی تھے لیکن تم ان کے مرنے کا غم نہ کرو، تم نے تو انہیں ڈاکو سمجھ کر ہی مارا تھا''۔

خالد نے جواب میں کہا:

''پھر بھی مجھے اپنے مجاہد بھائیوں کا خون بہانے پر افسوس رہے گا''۔

خالد نے معاویہ کو کمرے کے اندر آنے کو کہا۔

اندر آنے کے بعد اس نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''ماں! یہ معاویہ ہے، میرا مجاہد ساتھی، یہ بہت بہادر انسان ہے''۔

بھاگ بھری نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

''میرے پتڑ کے دوست ہو تو تم بھی مجھے اپنی ماں ہی سمجھو''۔

خالد نے ماں کو کہا:

''ماں! اس نے سوات میں بہت بے جگری سے اسلام کے نفاذ کے لئے جنگ کی تھی، یہ لوگ وہاں پر نظام اسلام کے نفاذ کے قریب پہنچ گئے تھے کہ منافق حکمرانوں نے دھوکے سے فوج کشی کر دی ورنہ ہم سوات

کے بعد پورے پاکستان پر اسلامی نظام نافذ کر دیتے ۔ بھاگ بھری چپ چاپ خالد کے برابر میں کھڑی رہی ،اسے خالد کی باتیں سمجھ نہیں آ رہی تھیں ۔

ماں کو یوں گم سم دیکھ کر خالد نے کہا:

'' ماں ! مہمان بُرے حالات میں آیا تو کیا ہوا! مہمان کو ہم کم از کم اپنی محنت سے اگائے ہوئے چھوہارے تو کھلا سکتے ہیں''۔

یہ کہہ کر خالد نے معاویہ کو اشارے سے زمین پر بیٹھنے کو کہا اور اُس کے بیٹھنے کے بعد خود بھی بیٹھ گیا۔

بھاگ بھری نے پاس رکھے ہوئے چھوہاروں کو مٹھی میں اٹھا کر معاویہ کو دے کر کہا:

'' کھا کر دیکھو بہت مزہ آئے گا''۔

خالد نے مسکرا کر بھاگ بھری کی طرف دیکھ کر کہا:

'' بہت مہربانی''۔

خالد نے معاویہ کی توجہ اپنی طرف کراتے ہوئے کہا:

'' جہادی سرگرمیوں کی کیا اطلاعات ہیں؟''

معاویہ نے جواب میں کہا:

'' اب کیسا جہاد اور کہاں کا اسلام''!

خالد نے حیرانی سے کہا:

'' کیا مطلب ہے تمہار؟''۔

معاویہ نے کہا:

'' اب ہمارا جہاد صرف پانی اور خوراک پر قبضہ حاصل کرنا ہے''۔

خالد نے بہت سنجیدہ لہجے میں کہا:

'' اگر جہاد وقتال کے ساتھ اسلام کی دعوت نہ دی جائے تو جہاد باطل ہو جاتا ہے۔

معاویہ نے کہا:

'' شاید تم کسی نئی دنیا سے اس دنیا میں ابھی وارد ہوئے ہو،لوگ کھانے اور پانی کے سوا کوئی دوسرا لفظ نہ

سننا چاہتے ہیں اور نہ ہی انہیں کوئی دوسرا لفظ سمجھ میں آتا ہے''۔

خالد نے جواب میں کہا:

''حالات کیسے بھی ہوں، ہمیں یہ عہد نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہم کو سارے خراسان و ہند پر خلیفۃ المسلمین کا پرچم لہرانا ہے''۔

معاویہ نے جواب میں کہا:

''تم کو معلوم ہے ہم یہاں کیوں آئے تھے؟''۔

خالد نے مختصراً جواب میں کہا:

''لوٹنے کو''۔

معاویہ نے تائید میں کہا:

''ہاں لوٹنے کو کیوں کہ ہم کو خبر ملی تھی کہ علاقے میں کوئی اونٹ دیکھا گیا ہے، ایک عجیب سی بیماری پھیلنے سے جانور نا پید ہو گئے ہیں۔ ہم لوگ پیدل لوٹ مار کر کے تھک جاتے ہیں، سوچا تھا کہ اونٹ ہاتھ لگ گیا تو ہماری نقل و حرکت آسان ہو جائے گی''۔

معاویہ نے مزید کہا:

''تمہارے پاس اونٹ ہے تو سمجھ لو کہ تمہارے پاس سب سے قیمتی گاڑی ہے''۔

خالد معاویہ کی باتوں سے شدید افسردہ ہو گیا تھا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کل کے مجاہدین آج کے جرائم پیشہ گروہوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔

کچھ دیر سوچ کر خالد نے افسردہ لہجے میں کہا:

''میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجاہدین دین کے راستے سے ہٹ کر جرائم کی راہ پر چل پڑیں گے اور تم جیسا دیندار آدمی ان کا شریک کار بن جائے گا''۔

معاویہ نے چھوہارا چباتے ہوئے جواب میں کہا:

کمانڈر صاحب! آپ نے جہادی زندگی کا بیشتر وقت افغانستان اور کشمیر میں گزارا تھا اس لئے آپ کو شاید نہ معلوم ہو کہ، ہماری جہادی تنظیموں میں ایک بڑی تعداد جرائم پیشہ افراد کی شامل ہو جاتی تھی۔ ان کو

ہماری سرپرستی چاہیئے ہوتی تھی تاکہ پولیس ان کے جرائم کی پردہ پوشی کرے اور ہمیں ایسے لوگ چاہیئے ہوتے تھے کہ جو بہادر ہوں اور بلا سوچے سمجھے ہر کام کر گزریں۔ ہمارے سر پر ایجنسیوں کا ہاتھ ہوتا تھا اور جرائم پیشہ جہادیوں پر ہمارا ہاتھ، البتہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ ہمارے ساتھ رہ کر بہت سے جرائم پیشہ چھوٹے موٹے جرائم سے تائب ہو کر ہمارے نظریاتی ساتھی بن جاتے تھے۔ جن کو قتل کرنے کا شوق ہوتا تھا، وہ اس شوق کی تسکین اسلام کے نام پر قتل کر کے کرلیا کرتے تھے۔ ایجنسیوں کا بھی کام چلتا رہتا تھا، لوگوں کے خونی شوق بھی پورے ہوتے رہتے تھے اور ہم اس حکمت عملی سے اپنا شرعی فریضہ بھی پورا کر لیتے تھے. ہم سے اوپر والوں پر جو ریال اور ڈالر برستے تھے، وہ اوپر والے ہی جانتے ہیں، لیکن یہ بات ہے کہ ہم کو کبھی روپے پیسے کی تنگی نہ ہوئی تھی''۔

معاویہ کی باتیں سن کر خالد پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔

معاویہ نے خالد کو یوں افسردہ اور خاموش دیکھ کر کہا:

''خالد بھائی! آپ نے سیلاب کے بعد کے حالات نہیں دیکھے. اس وقت انسان، انسان کا گوشت کھا رہا ہے. ہم دو انسان ان جرائم پیشہ گروہوں سے نہیں لڑ سکتے. میں آج بھی آپ کو دل سے اپنا کمانڈر تسلیم کرتا ہوں. آپ جو کہیں میں وہ کرنے کو تیار ہوں''۔

خالد نے معاویہ سے سنجیدہ لہجے میں کہا:

''قاری صاحب نے غزوۂ ہند کی بشارت دی تھی.۔ سیلاب نے آدھے سے زیادہ کام آسان کر دیا ہے. میں قاری صاحب کی بشارت کو سچ ثابت ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہوں. ہمیں ٹیکسلا کی طرف جانا ہے یا پھر اُس سے آگے افغانستان کی طرف، مجھے یقین ہے کہ وہاں خلافت اسلامیہ کے کالے جھنڈے لہرا چکے ہوں گے''۔

معاویہ نے جواب میں کہا:

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر جناب! لیکن آپ کے پاس پانی ختم ہونے کو ہے. اونٹنی کا بھی ساتھ ہے میری تجویز ہے کہ ابھی ہمارے ڈیرے پر چلیں۔ وہاں سے مناسب موقعے پر افغانستان کی جانب چل پڑیں گے. ڈیرے سے ہم کو پانی اور کھانے کا سامان بھی مل جائے گا''۔

معاویہ کی تجویز خالد کے دل کو لگی تو اس نے سر ہلا کر رضا مندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''جیسے تمہاری مرضی میرے بھائی''۔

معاویہ نے جواب میں کہا:

''ہم کو وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے. چلو اب چلنے کی تیاری کرتے ہیں''۔

یہ سنتے ہی یہ سب فوراً کھڑے ہو گئے۔

خالد نے ماں سے کہا:

''ماں! تم باقی بچے ہوئے سامان کو تھیلیوں میں باندھنا شروع کرو، میں سامان کو اونٹنی پر لاد دوں گا''

یہ کہہ کر تینوں مینار کے اندر تعمیر کردہ بل کھاتے ہوئے زینوں سے اتر کر نیچے آ گئے. نیچے آنے کے بعد معاویہ نے اپنے تینوں مقتول ساتھیوں کی رائفلوں کو ایک طرف رکھنے کے بعد ان کی لاشوں کو گھسیٹ کر برآمدے میں ڈال دیا. بھاگ بھری کو دیکھ کر کتے اس کے اِردگِرد منڈلانے لگے۔

اس نے کتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''پانی کی کمی تو ہے، پر ٹھہرو ذرا''۔

یہ کہہ کر اس نے اونٹنی کے بچے ہوئے دوُدھ میں خشک گوشت کے ٹکڑے ڈال کر کتوں کے آگے رکھ دیئے۔ وہ دم ہلاتے ہوئے چپڑ چپڑ کر کر کے کھانے میں مشغول ہو گئے. اس کام سے فارغ ہو کر بھاگ بھری نے اونٹنی کا دوُدھ دوہنا شروع کر دیا۔ دوُدھ نکالنے کے بعد اس نے دوُدھ کو ایک چھوٹی سی مشک میں بھر دیا تاکہ راستے میں پیاس بجھانے کے کام آ سکے. خالد نے اونٹنی کو بٹھا کر سب سامان اور ہتھیار سلیقے سے اس پر لاد دیئے۔

اس کام سے فارغ ہو کر اُس نے ماں کو کہا:

''ماں اب تم سوار ہو جاؤ میں اور معاویہ پیدل چلیں گے''۔

بھاگ بھری کو اونٹنی پر سوار ہونے میں مدد دینے کے بعد خالد نے معاویہ سے کہا:

''چلو! تمہارے ساتھیوں کو دفنا دیں گے، میں اُن کی نماز جنازہ پڑھا دوں گا''۔

معاویہ نے جواب میں کہا:

''اب کفنانے اور دفنانے کا رواج ختم ہو چکا ہے، بس جو مر گیا وہ مر گیا، اب جلدی کرو یہاں سے نکل چلو، ڈیرہ کافی دور ہے رات بھر چلنا ہوگا''۔

خالد نے یہ سن کر اونٹنی کی مہار پکڑ کر ہش کیا وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

خالد نے مہار پکڑ کر چلنا شروع کیا تو کتے بھی اونٹنی کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

خالد نے ان کو ہش ہش کر کے واپس مسجد میں دھکیلنے کی کوشش کی تو اونٹنی پر بیٹھی ہوئی بھاگ بھری نے غصے سے کہا:

''جو ساتھ چل پڑے اسے کبھی نہ دھتکارو''۔

خالد نے یہ سن کر کتوں کو دُھتکارنے کی کوشش ترک کر دی اور مہار تھامے ہوئے معاویہ کے پیچھے چل پڑا۔

(۴)

ہندستان میں دہرادون کے فوجی اڈے پر اعلیٰ سرکاری اجلاس جاری تھا۔اس اجلاس میں اب تک کی جانے والی امدادی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جانا تھا۔ایک وفاقی سیکریٹری نے اقوامِ متحدہ سے موصول ہونے والی رپورٹ کا خلاصہ یوں پیش کیا:

''اقوامِ متحدہ نے واضح پیغام دیا ہے کہ اگر موسمی حالات تبدیل نہ ہوئے تو ساری دنیا بھی مل کر اتنے بڑے خطے کو قحط کے چنگل سے نہیں نکال سکتی۔موسمی حالات کی بحالی ہمالیہ کے علاقوں میں بارش کے ہونے سے جڑی ہوئی ہے۔عالمی اداروں نے ہمارے پربتوں پر مصنوعی برکھا برسانے کی بہت کوشش کی لیکن درجہء حرارت کی زیادتی کی وجہ سے چارج پیدا نہ ہوسکا۔بعض ممالک نے کارگو جہازوں کے ذریعے قطبی علاقوں سے برف لاکر ہمالیہ پر برسائی لیکن گرمی کی وجہ سے وہ بھی فوراً ہی پگھل گئی۔اقوام متحدہ کا کہنا ہے کہ لوگ ان شدید موسمی حالات میں شاید خود ہی جینا سیکھ جائیں لیکن زیرِ زمین پانی کا تیزی سے ختم ہونا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ شاید اس خطے میں زندگی گزارنا ناممکن ہوجائے گا۔صرف وہ ہی لوگ بچ پائیں گے جو اس خطے سے نکلنے میں کامیاب ہوسکیں گے۔اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ بعض علاقوں میں تابکاری اتنی زیادہ تھی کہ وہاں انسانی جین میں میوٹیشن ہورہی ہے،اس جینیاتی میوٹیشن کی وجہ سے عجیب الخلقت بچوں کی پیدائش بڑھنے کا امکان ہے''۔

رپورٹ کا خلاصہ سُنا کر سیکریٹری صاحب خاموش ہوگئے۔

وزیرِاعظم نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا:

''اب ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرلینا چاہئے کہ حکومت صرف اور صرف دہرادون تک محدود ہوکر رہ گئی ہے۔میرے خیال میں سرکار کو ریڈیو پر یہ اعلان کردینا چاہئے کہ جو افراد کسی بھی طرح سے ہندوستان سے نکل

سکتے ہوں نکل کر اپنی جان بچائیں''۔

ایک وزیر نے وزیر اعظم سے اختلاف کرتے ہوئے کہا:

''ایسے اعلانات سن کر جنتا بوکھلا جائے گی اور انارکی پھیل جائے گی''۔

ایک اعلیٰ افسر نے بیچ میں ٹانگ اڑاتے ہوئے کہا:

''جناب! انارکی تو کب سے پھیلی ہوئی ہے، آدمی آدمی کو کاٹ کر کھا رہا ہے، لائیو اسٹاک ختم ہو چکا ہے، ریاستی ادارے ٹوٹ چکے ہیں، انارکی اور کیا ہوتی ہے''؟

کلچر کے وزیر نے وزیر اعظم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''اقوامِ متحدہ کے ذریعے حکومت برطانیہ نے اجازت مانگی ہے کہ وہ ہندوستانی نوادرات اور عجائب گھر میں باقی بچ جانے والی اشیاء کو برطانیہ لے جاسکیں. حکومتِ برطانیہ کا وعدہ ہے کہ حالات معمول پر آتے ہی تمام نوادرات لوٹا دیئے جائیں گے''۔

ایک دوسرے وزیر نے اس بات کا یوں جواب دیا:

''بہت خوب! ایک بار پھر سے لوٹنے کا بہانہ ہاتھ آگیا ہے، جو کوہ نور کو اپنے قبضے کے دوران ہتھیا یا تھا آج تک نہیں لوٹا پائے''!

ایک اور وزیر نے بیچ میں یوں لقمہ دیا:

''اگر ہم اجازت دیں بھی تو اس شرط پر دیں کہ جب ہندوستان کے نوادرات واپس آئیں تو کوہِ نور بھی واپس ملے' گا'۔

وزیر اعظم نے میٹنگ میں غیر سنجیدہ گفتگو پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''ہمیں مصیبت کی اس گھڑی میں ماضی میں ہونے والے واقعات پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں. ہمارے ہم وطنوں نے نوادرات کو خود ہی لوٹ لیا ہے، اب اگر کوئی دیس ہماری ایک چھوٹی سی چیز بھی محفوظ کر ے تو ہم اس کے شکر گزار ہوں گے. آپ سب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اقوامِ متحدہ نے پہلے ہی ہمارے نایاب جانوروں اور پودوں کو دوسرے ممالک میں منتقل کرنا شروع کر دیا ہے تاکہ موسم بحال ہونے پر ان کو یہاں دوبارہ اُگایا جاسکے''۔

یہ بات کرنے کے بعد وزیراعظم نے سرکاری افسران سے کہا:

''آپ ریڈیو پر جنتا کو اصل صورت حال سے آگاہ کریں۔ آپ عوام کو صاف صاف بتا دیں کہ آنے والے دِنوں میں قحط کی صورتحال اور شدید ہو جائے گی... جو لوگ کشتیوں کے ذریعے یا اور کسی طریقے سے سر زمین ہند سے نکل سکتے ہوں نکل جائیں۔ آج کی میٹنگ برخاست ہوتی ہے''۔

یہ کہہ کر وزیراعظم اپنی کرسی سے کھڑے ہو گئے۔

(۵)

نیتا مکرجی کافی سخت جان واقع ہوئے تھے لیکن وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے تھے۔ اس وقت وہ قحط سے مر جانے والوں کی لاشوں کے انبار کے درمیان کھڑے ہوئے تھے۔ ان کو یہ گمان تھا کہ یہ سب لوگ زندہ ہیں اور ان کے سیاسی جلسے میں اِن کا بھاشن سننے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔

انہوں نے اپنے تصور میں سب کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کرنے کے بعد اپنا بھاشن اس طرح سے شروع کیا:

''آپ سب لوگ میرے ساتھ زور زور سے کہیں:

شری رام۔۔شری رام۔۔۔ جے جے شری رام۔

شری رام۔۔شری رام۔۔۔ جے جے شری رام۔

اتنی اونچی آواز سے شری رام کو پکارو کہ سارا سنسار ہندوؤں کی آواز سے گونج جائے۔ مٹھیاں بھینچ کر پکارو۔ مٹھیاں بھینچ کر دکھادو کہ ہم سب جنگ کرنے کو تیار ہیں، میرے مترو! تمہاری جنگ کرنے کی اِچھا ہی ہم کو دلّی کے تخت تک لے جائے گی۔ اس بار دلّی پر ہمارا ہی راج ہوگا۔ میرے مترو، یہ پاکستان بھی تو ہمارا ٹوٹا ہوا انگ ہی ہے، یہ سب ہمارے بھائی ہیں۔ یہ سب پہلے ہندو ہی تھے۔ ان سب بھائیوں اور بہنوں کو پرانے دھرم پر واپس لانا ہوگا۔ پر اس کے لئے دلّی اور اسلام آباد تک ہی نہیں رکیں گے بلکہ کابل تک جائیں گے وہ سب بھی پہلے ہندو ہی تھے۔

میرے بھائیو! اور بہنو!۔۔۔۔۔ محمد صاحب کے مندر میں بھی تو پہلے بت اور مورتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ہم ان مورتیوں کو عرب کے سب سے بڑے مندر میں دوبارہ سے لے جا کر رکھیں گے۔ بھائیو! ایک بار پھر زور لگا کر کہو!

''شری۔۔۔ش۔۔۔شی

اس بار نیتا جی کی آواز حلق میں اٹک گئی تھی۔ ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اب تو ان کو کمزوری کی وجہ سے کھڑے رہنا دشوار تھا آخر کار وہ چکرا کر قریب پڑی پھولی ہوئی لاش پر گر پڑے۔

(۶)

خالد اور معاویہ باری باری اونٹنی کی مہار پکڑتے ہوئے مجاہدین کے ڈیرے کی جانب گامزن تھے، یہ لوگ بھوک لگنے پر ایک گھونٹ دودھ پی کر چھوہارے یا خشک گوشت کھالیتے تھے۔خالد نے راستے میں معاویہ کو قاری صاحب کے خلاف ہونے والی بغاوت کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔اس نے معاویہ کو یہ بھی بتایا کہ مُلّا سواتی نے اسے کس طرح چالاکی سے نظر بند کر کے اس کا رابطہ قاری صاحب سے ختم کراوایا تھا۔

معاویہ کی نظروں میں خالد ہمیشہ سے اس کا پسندیدہ کمانڈر تھا۔اس نے ہمیشہ خواہش کی تھی کہ وہ خالد کی سربراہی میں کفار کے خلاف جہاد کر سکے مگر اسے یہ سعادت نصیب نہ ہو سکی۔

معاویہ نے دل میں سوچا:

''قدرت کے کھیل کتنے نرالے ہیں کہ آج سے خالد جیسے عظیم کمانڈر اور اس کی ماں اس کے مہمان ہوں گے اتنے بڑے کمانڈر کی میزبانی ایک اعزاز سے کم نہیں''۔

خالد کی داستان سننے سے سفر دلچسپی سے کٹ رہا تھا۔

جب وہ اپنی داستان سنا چکا تو معاویہ نے اپنی داستان سناتے ہوئے کہا:

''پشاور میں فوجیوں کے بچوں کے اسکول پر حملے کے واقعے کے بعد ایجنسیوں نے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لی تھیں۔ ہمارے کئی رہنماؤں کو جیلوں سے نکال کر پولیس مقابلوں میں شہید کر ڈالا تھا، صرف وہی ساتھی سکون سے تھے جو ان کے کہنے پر بِلا چُون و چرا عمل کر رہے تھے۔ان تمام باتوں کے ساتھ نئی مصیبت یہ تھی کہ ہندوستان میں دہشت گردی کی کارروائی کا الزام پاکستان پر آرہا تھا۔حکومت پاکستان کے لئے یہ ثابت کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ اس کاروائی میں حکومت کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔مجاہدین ہندوستان میں کارروائی کے بعد پاکستانی شناخت کی دستاویزات وہیں چھوڑ آئے

تھے جس سے ثابت ہو گیا تھا یہ یہ کارروائی پاکستانی مجاہدین کی تھی۔ دِلّی پر دہشت گردی کا یہ حملہ آخر کار ایٹمی حملوں کا شاخسانہ ثابت ہوا"۔

خالد نے معاویہ کی کہانی میں رخنہ ڈالتے ہوئے کہا:

"ہاں! تم صحیح کہتے ہو، جیسے کہ یومِ جمہوریہ پر خوفناک کارروائی کا اسے کوئی علم ہی نہ ہو۔

معاویہ نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا:

"ایٹمی حملوں کے کچھ عرصے بعد سارے ملک بلکہ ہندوستان، بنگلہ دیش، نیپال اور بھوٹا نجیسے پہاڑی علاقوں تک میں سیلاب آگئے۔ اس سیلاب میں ہمارے علاقوں میں وہی لوگ زندہ بچ پائے جو پہاڑوں یا اونچی چھتوں پر چڑھ گئے تھے، سیلاب ایسا تھا جو شہروں کے ساتھ ساتھ حکومت و سیاست کو بھی بہا کر لے گیا. ان حالات میں جس کے ہاتھ میں اسلحہ اور اُس کو چلانے کی ہمت تھی وہی زندہ رہ سکتا تھا. میں نے جہاد کشمیر کے سابق جہادیوں اور مذہبی جماعتوں کے کچھ بہادر جوانوں پر مشتمل گروہ تشکیل دیا۔ ہم نے چھاؤنی سے اسلحہ لوٹ کر اپنے گروہ کو ناقابل شکست بنا دیا. وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہاں بھی قحط پڑنا شروع ہو گیا۔ کوئی بھی مذہب دین، اسلام اور اس کے نفاذ پر بات سننے کے تیار نہ ہوتا تھا. ہر کسی کے لب پر بس دو ہی الفاظ تھے، روٹی اور پانی... ہمارے گروہ نے فیصلہ کیا کہ ہم خوراک پر اپنی اجارہ داری قایم کریں گے تا کہ ہماری سُنی جائے اور پھر ہم نفاذ اسلام کے لئے کچھ کر سکیں۔ ہم نے خوراک کے ذخیرے لوٹے، ہم ہیلی کاپٹر سے گرائے جانے والی امداد اور اشیاء کو ہم اپنے قبضے میں لے لیتے تھے ...ہم لوگوں نے علاقے کے سارے بڑے زمینداروں کو کنگال کر دیا تھا۔ ہم نے انُ کو سونے اور چاندی کے بدلے خوراک فراہم کی۔ تم دیکھنا کہ ہمارے ڈیرے پر سونے کے ڈھیر لگ گئے ہیں"۔

بھاگ بھری نے اونٹنی پر سے چلا کر کہا:

"پتر! اب ذرا اونٹنی کو بٹھا دے میری کمر میں درد ہونے لگا ہے"۔

خالد نے اونٹنی کو بٹھا کر ماں اُترنے کے لئے سہارا دیا۔

اُس نے اونٹنی سے اتر کر کہا:

"بچو! اب تم لوگ اونٹنی پر سوار ہو جاؤ میں مہار پکڑ کر چلتی ہوں"۔

معاویہ نے ہنستے ہوئے کہا:

''ماں جی! بس اب ڈیرہ قریب ہی ہے وہ جو سامنے پہاڑوں پر روشنی ہے وہ ہمارے ڈیرے کی ہے''۔

معاویہ نے خالد سے اور بھاگ بھری سے کہا:

''ایک خاص بات یاد رکھنا کہ مسجد والے واقعے کا کوئی ذکر نہ ہو، ساتھیوں سے متعلق سوالوں کو میں خود سنبھال لوں گا''۔

اب یہ تینوں ذرا تیزی سے منزل کی طرف چلنے لگے۔ منزل سامنے ہو تو رفتار خود بخود تیز ہو جاتی ہے۔

(۷)

نیویارک میں اقوام متحدہ کی 'ثقافتی ورثہ کمیٹی' کے اجلاس میں فیصلے کئے گئے تھے کہ برطانیہ اور فرانس مل کر برصغیر پاک و ہند کے ثقافتی ورثے کو برطانیہ منتقل کریں گے۔ ہالینڈ، برازیل اور آسٹریلیاء کی ذمے داری تھی کہ وہ اس خطے میں اگنے والے تمام نباتات اور جانوروں کا جنیاتی مادہ اور بیج جمع کر کے اس خطے کا حیاتیاتی بنک قائم کریں گے۔اسی علاقے میں بچ جانے والے درختوں کو برازیل میں لگائے جانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ امریکی میرینز نے اس علاقے میں آ کر کام کرنے والے سائنس دانوں کی سیکورٹی کی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ اقوام متحدہ کے مطابق اس عظیم ثقافتی اور حیاتیاتی ورثے کو محفوظ کرنے میں پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔اس لئے اس اجلاس کے فیصلے پر تیزی سے عمل کئے جانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

(۸)

پاکستانی دارالحکومت اسلام آباد کے ایک بڑے سے بنگلے میں کچھ سرکاری افسران جمع تھے .ان افسران میں تینوں مسلح افواج؛ آرمی ،نیوی ، ائرفورس نیز خفیہ ایجنسیوں کے افسران کے علاوہ بہت سے وفاقی سیکریٹریز شامل تھے۔اس گھر کے باہر فوجیوں کا ایک چاق وچوبند دستہ حفاظت کے فرائض انجام دے رہا تھا .یہ ایک غیر سرکاری اور غیر رسمی میٹنگ تھی۔

خفیہ ایجنسی کے ایک بڑے افسر نے گفتگو کا آغاز یوں کیا:

''عزیز ساتھیو!، آج کے اِس خفیہ اِجلاس کی خبر اِس گھر سے باہر نہیں جانی چاہیے ...جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان نے کھلم کھلا اپنے عوام کو ہندوستان چھوڑنے کی ترغیب دینا شروع کر دی ہے۔اِن کو اندازہ ہے کہ اب اِس برِصغیر سے زندگی گذارنے کے سارے ذرائع آہستہ آہستہ ختم ہو رہے ہیں۔اب ہم کو بھی خود کو اور اپنے اہل خانہ کو اس آفت زدہ اور آسیب زدہ علاقے سے نکالنا ہوگا''۔

ایک آفیسر نے بے تابی سے خفیہ ایجنسی کے افسر کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا:

''مگر کیسے؟''۔

اس افسر نے کہا:

''ذرا مجھے بات مکمل کرنے دیں، میں سب کی بھلائی چاہتا ہوں''۔

یہ کہہ کر انہوں نے اپنی بات کو دوبارہ یوں شروع کیا:

''ساتھیو! ساحلی علاقوں سے بہت سے لوگوں نے چھوٹی کشتیوں کے ذریعے نکلنے کی کوشش کی ہے۔ کچھ لوگ کامیاب ہو گئے ہیں، لیکن اکثر کشتیاں سمندر کی طغیانی کا مقابلہ نہیں کر سکیں ...ہمارے سب سے بڑے ساحلی شہر کراچی میں اسّی فی صد سے زیادہ آبادی مر چکی ہے۔ وہاں پر لاشوں کے تعفن سے وبائیں

پھوٹ پڑی ہیں. کراچی شہر کیا سمگلرز سونے کے علاوہ کسی اور زبان میں بات نہیں کرتے. وہ مسلح بھی ہیں اور خطرناک بھی۔ یہ اطلاعات بھی ملی ہیں کہ وہ نوکریوں کا لالچ دیتے اور کثیر رقم ہتھیا کے لوگوں کو خلیجی ریاستوں تک پہنچانے کے بجائے ویران جزیروں پر چھوڑ آتے ہیں. وہاں پر لوگ بھوک اور پیاس سے مرجاتے ہیں. نیوی کے کچھ جہاز اپنے خاندانوں کو یوروپی ملکوں کی طرف لے کر ایسے گئے کہ پھر کبھی واپس نہیں آئے. برصغیر سے آنے والوں کو یورپی سرزمین پر قدم رکھنے سے باز رکھنے کے لیے عالمی طاقتیں ساؤتھ امریکا میں موجود اور مقیم ہندوستانیوں پر مشتمل ایک نیا ہندوستان تخلیق کر رہی ہیں''!

مندرجہ بالا اطلاعات پہنچانے کے بعد انہوں نے ائر وائس مارشل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''اب آپ سے گذارش ہے کہ یہاں سے نکلنے کے پلان اور اس میں رُکاوٹوں پر آپ کچھ روشنی ڈالئے''

ائر وائس مارشل اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہنا شروع کیا:

''یورپ نے ہندوستان کی طرف سے نامعلوم پروازوں پر پابندی لگا رکھی ہے۔ ہمیں مل کر اس کا حل نکالنا ہوگا. مایوسی کی اِس بات کے بعد خوشی کی بات یہ ہے کہ ہم نے دو بوئنگ اور دو۔ سی۔ ون تھرٹی C.130 طیاروں کو پرواز کے قابل بنالیا ہے۔ ائر فورس کے ایک بیس سے وافر مقدار میں طیاروں کے لیے ایندھن بھی مل گیا ہے''۔

اس میٹنگ کے شرکاء نے یہ خبر سنتے ہی زوردار تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کیا. ائر وائس مارشل میابی کی یہ خبر سُنا کر اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

اب خفیہ ایجنسی کے اعلیٰ افسر نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر کہا:

''یہاں پر موجود تمام افسران اور انُ کے اہل خانہ کا نام یقیناً مسافروں کی فہرست میں ہوگا، لیکن کچھ افسران ایسے ہیں جن کو ابھی تک حب الوطنی کا بخار چڑھا ہوا ہے. وہ اس حقیقت کو قبول کرنے کو تیار نہیں کہ ملک و ریاست ختم ہو چکی ہے''۔

ایک دوسرے اینٹلی جنس کے افسر نے اپنے ساتھی کی بات میں ٹانگ اڑاتے ہوئے کہا: سر! آپ فکر نہ کریں، ہم کو افسران کی خواب گاہوں کی باتیں تک معلوم ہوتی تھیں، ہم ایسے افسران کو منصوبے کی خبر نہیں ہونے دیں گے، یہ لوگ یقیناً ہمارا کام خراب کر سکتے ہیں''۔

سنیئر انٹیلی جنس افسر نے جواب میں کہا:

''شاباش! یہ ایک غیر سیاسی مشن ہے''۔

اس میٹنگ کے میزبان سرکاری افسر نے کہا:

''خوش قسمتی سے ایک فوجی ڈپو سے بیسن اور تیل مل گیا تھا. اس لئے آپ حضرات کی خدمت میں تازہ پکوڑے حاضر ہیں''۔

یہ کہہ کر انہوں نے اپنی بیوی کو پکوڑے لانے کا اشارہ کیا۔ ان کی اہلیہ نے بذات خود سب کو پکوڑے پیش کئے۔

اس خاطر تواضع کے بعد انہوں نے کہا:

''آپ حضرات چائے نوش کریں اور اس بات پر غور کریں کہ یہاں سے نکلنے میں جو رکاوٹیں آسکتی ہیں ان کا سدباب کیسے کیا جائے؟''

یہ کہنے کے بعد وہ خود شرکائے میٹنگ کے لئے پیالیوں میں چائے انڈیلنے لگے۔

(۹)

خالد، بھاگ بھری اور معاویہ باری باری اونٹنی کی مہار تھامے، ماضی کے قصّے سناتے ڈیرے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اب پو پھٹ رہی تھی اور اندھیرا چھٹ چکا تھا۔

خالد نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''چلو! جلدی سے نماز پڑھ لو، پہاڑی پر چڑھتے چڑھتے قضا ہو جائے گی''۔

یہ کہہ کر خالد زور زور سے اذان دینے لگا۔ اذان دینے کے بعد اس نے قبلہ کی سمت کا اندازہ کر کے نیت باندھ لی۔

معاویہ خالد کے پیچھے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ نماز سے فارغ ہو کر ان کے لوگوں نے ڈیرے کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ کچھ دیر اور چل کر خالد نے دیکھا کہ پہاڑی کے دامن میں سینکڑوں کی تعداد میں قیمتی گاڑیاں کھڑی ہوئی ہیں۔

خالد نے یہ منظر دیکھ کر معاویہ سے دریافت کیا:

''کیا تم لوگوں نے گاڑیوں کا کاروبار شروع کر دیا ہے؟''

معاویہ نے جواب میں کہا:

''جس وقت تک پٹرول اور ڈیزل میسّر تھا ہم لوگ خوراک کا سودا گاڑیوں کے بدلے بھی کرتے تھے۔ مگر یہ سودا گھاٹے کا ثابت ہوا ہے۔ اب یہ قیمتی گاڑیاں لوہے کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں۔ ہم نے گاڑیوں کی بیٹریاں نکال کر ان سے بلب روشن کرنے کا کام لیا تھا لیکن اب بیٹریاں بھی دم توڑ چکی ہیں''۔

اس دوران یہ لوگ ڈیرے کے قریب آ گئے۔ انجان لوگوں اور اونٹنی کو دیکھتے ہی کچھ مسلح لوگ پہاڑی میں بنے ہوئے غاروں سے نکل آئے''۔

ان مسلح افراد نے بندوقیں تانتے ہوئے کہا:

''کون ہو تم لوگ؟''

معاویہ نے با آوازِ بلند جواب دیا:

''میں ہوں معاویہ، یہ اپنے ساتھی ہی ہیں''۔

معاویہ کی بات سن کر یہ مسلح افراد پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔

ان افراد نے قریب آ کر خالد سے مصافحہ کیا معاویہ نے خالد کا تعارف کراتے ہوئے کہا:

''یہ خالد خراسانی ہیں، جہاد افغانستان و کشمیر کے مشہور کمانڈر اور یہ خاتون ان کی والدہ گرامی ہیں''۔

تعارف کرانے کے بعد ایک ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے معاویہ نے کہا:

''تم اونٹنی سے سامان اتار کر کسی غار میں رکھو اور اونٹنی کو سائے میں باندھ کر چارے پانی کا فوری طور پر بندوبست کرو''

وہ آدمی معاویہ کا حکم سنتے ہی اونٹنی کی مہار پکڑ کر ایک طرف کو چلدیا۔

معاویہ نے خالد اور بھاگ بھری سے کہا:

''آپ میرے ساتھ چلئے، جب تک آپ کے آرام کا بندوبست ہو تب تک میرے غار میں آرام کریں''۔

یہ کہہ کر معاویہ نے ایک پہاڑی درّے کی طرف قدم بڑھانا شروع کر دیئے. خالد اور بھاگ بھری اس کے پیچھے چل پڑے. پتھروں اور چھوٹی چھوٹی چٹانوں پر سے گزر کر یہ لوگ معاویہ کے غار میں داخل ہوئے۔ بھاگ بھری کے کتّے دم ہلاتے دوڑ کر ایک دوسرے سے کھیلتے ہوئے اُن کے پیچھے چل رہے تھے۔ معاویہ نے غار میں داخل ہوتے ہی دیا روشن کر دیا. روشنی ہونے پر خالد غار کی سجاوٹ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ غار کسی امیر عرب شیخ کا خیمہ لگ رہا تھا، دیواریں اور فرش قیمتی قالینوں سے آراستہ تھیں. خالد کو اس غار میں ایسے لگا کہ شاید وہ صحرا میں لگے کسی رئیس شکاری کے خیمے میں آ گیا ہے. معاویہ نے ماں اور بیٹے کو بیٹھنے کے لئے کہا۔

جب وہ لوگ آرام سے بیٹھ گئے تو معاویہ سرگوشی کرتے ہوئے خالد سے کہنے لگا:

''تم لوگ آرام کرو میں اپنے ساتھیوں کو مرنے والے ساتھیوں کے بارے میں بتا کر ابھی واپس آتا

ہوں. میں اُن کی آنکھوں میں اٹھتے ہوئے سوالوں کو پڑھ چکا ہوں...میں اُن کو بتاؤں گا کہ ایک مخالف گروہ کے حملے میں وہ تینوں مارے گئے اور اس گروہ کو پسپا کرنے میں تم نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا''۔

خالد نے معاویہ کی بیان کردہ کہانی سے متفق ہو کر سر ہلا دیا۔

جب معاویہ غار سے نکل گیا تو بھاگ بھری نے حیرانی سے کہا:

''تو نے کب سے جھوٹ کا ساتھ دینا شروع کر دیا؟ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ تینوں تیرے ہاتھوں سے ہی مارے گئے تھے کیونکہ وہ ہماری اونٹنی چرانے آئے تھے''۔

خالد نے ماں کے چبھتے ہوئے سوال کے جواب میں کہا:

''ماں! ہم اس وقت بہت خراب حالات میں گھرے ہوئے ہیں، یہ وقت سچ اور جھوٹ میں پڑنے کا نہیں''۔

بھاگ بھری خالد کا جواب سن کر خاموش ہو گئی. یہ دونوں غار میں بچھے ہوئے قالین پر پیر سیدھے کر کے نیم دراز ہو گئے۔ ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کتوں کی بخ بخ کرنے کی آواز آئی۔ ایک آدمی غار میں داخل ہوا، اس نے ہاتھ میں ایک مٹی کی ہانڈی اٹھائی ہوئی تھی جس پر تازہ تازہ موٹی روٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس آدمی نے ہانڈی قالین پر رکھی تو معاویہ بھی اس دوران غار میں آ گیا. کھانا لانے والا آدمی ہانڈی قالین پر رکھ کر چلا گیا۔

معاویہ نے ہانڈی پر سے روٹیاں اٹھا کر خالد اور بھاگ بھری کو دیتے ہوئے کہا:

''آپ کھانا شروع کریں ان حالات میں یہ اُبلی ہوئی دال قورمہ اور بریانی سے کسی طور بھی کم نہیں''۔

بھاگ بھری روٹی کے دو ٹکڑوں کو دُم ہلاتے ہوئے کتوں کے پاس لے گئی اور دونوں کو ایک ایک ٹکڑا ڈالنے کے بعد خالد اور معاویہ کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گئی۔

کھانا کھانے کے بعد معاویہ نے ان دونوں سے کہا:

''آپ کے قیام کے لئے ایک غار تیار ہے، آیئے میں آپ کو وہاں لے چلوں تا کہ آپ آرام سے سو جائیں باقی باتیں بعد میں ہوں گی''۔

یہ کہنے کے بعد معاویہ اٹھ کھڑا ہوا، ماں اور بیٹا معاویہ کے پیچھے چل پڑے۔

(۱۰)

سورج ڈھلنے سے پہلے ہی خالد کی نیند پوری ہو چکی تھی .وہ ضروری حاجت پوری کرنے غار سے باہر گیا.
اُسے یہ چند پل باہر گزارنا دوبھر ہو گئے تھے،سورج بھرپور شدت کے ساتھ آگ برسا رہا تھا۔
وہ فارغ ہو کر واپس آیا اور ماں کے پاؤں کے پاس آکر بیٹھ کر سوچنے لگا:
''کتنی بدنصیب ہے میری ماں اس کو چار دن بھی سکون کے نہ مل سکے''۔
یہ سوچ کر وہ ماں کے پاؤں کی طرف دیکھنے لگا اور انہیں دیکھ کر اس کے دل میں خیال آیا کہ:
''پیغمبر نے یوں ہی نہیں فرمایا تھا کہ ماں کے پیروں تلے جنت ہے''۔
یہی ماں ہے،جس نے مجھے انتہائی غربت اور غلامی کے حالات میں بھی آسودہ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ یہ
ماں جیسی ہستی ہی کر سکتی ہے کہ میرے ساتھ محاذِ جنگ پر چل پڑی ہے۔
یہ ماں ہی کر سکتی ہے،جو اس وقت تک جاگتی رہتی ہے کہ جب تک میں نہ سو جاؤں''۔
یہ سب کچھ سوچ کر اس کی آنکھوں میں آنسوں تیرنے لگے .اس نے بے اختیار اپنے دونوں ہاتھ ماں
کے پیروں پر رکھ دیئے۔ جب اسے ماں کے پیروں کا کھردراپن محسوس ہوا تو اس نے غور سے ماں کے پیروں
کی طرف دیکھا،اُس کے تلوے پیدل چل چل کر سخت ہو چکے تھے اُس نے اپنے ہونٹ ماں کے پیروں تک
لے جا کر انہیں چوما اور پھر انہیں دبانا شُروع کر دیا۔ خالد کے پیر دبانے کی وجہ سے بھاگ بھری کی آنکھ کُھل
گئی .اسے یہ منظر دیکھ کر خالد کا بچپن یاد آ گیا جب وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کے پیروں کو دباتا تھا۔
بھاگ بھری نے خیالوں سے باہر نکلتے ہوئے بہت دُلار سے اپنے بیٹے کو کہا:
''ساون اب تو چھوٹا سا بچہ نہیں ہے۔ تیرے ہاتھوں میں جوانی کی طاقت ہے اور میں بوڑھی ہو گئی
ہوں .اتنی طاقت سے نہ دبا''۔

خالد نے ہنستے ہوئے جواب میں کہا:

''بوڑھے ہوں تمہارے دشمن اور سن ! تیرے منہ سے ساون ہی اچھا لگتا ہے جب تم مجھے خالد پکارتی ہو تو میرے نام کا حلیہ ہی بگاڑ دیتی ہو۔تم مجھے ساون ہی پکارا کرو''۔

یہ سن کر بھاگ بھری اٹھ کر بیٹھ گئی اور خالد کا ماتھا چومنے لگی۔

اس کا ماتھا چومنے کے بعد اس نے کہا:

''پتر !ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آتی''۔

خالد نے کہا:

شوق سے پوچھو ماں !''۔

بھاگ بھری نے کہا:

''تیرے منہ سے ہمیشہ سنا ہے کہ اسلام نافذ کرنا ہے...یہ نافذ بھلا کس بلا کا نام ہے''۔

خالد نے سنجیدگی سے کچھ دیر سوچا کہ اِس مشکل لفظ کو کس طرح سمجھایا جائے ، پھر اس نے کہا:

''ماں یوں سمجھ لو کہ جب مویشیوں کے ریوڑ میں کوئی نیا جانور آتا ہے تو وہ کبھی دائیں کو بھاگتا ہے کبھی بائیں کو۔ چرواہا اُس کو ڈنڈیاں مار مار کر سیدھے رستے پر چلنے کا عادی بنا دیتا ہے۔بس مسلمانوں کو سزا دے کر ڈرا دھمکا کر اسلام پر عمل کروانے کو اسلام کا نافذ کرنا کہتے

ہیں''۔خالد کی تشریح سن کر بھاگ بھری سوچ میں پڑ گئی۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا:

''میں تو سمجھتی تھی کہ دین دھرم دل کا سودا ہوتا ہے اِس میں سوٹی اور لاٹھی کی کیا ضرورت؟''۔

خالد نے ماں کو یوں جواب دیا:

''ماں !دین میں زبردستی ہوتی ہے..اگر حضرت عمر فارق ایران پر اپنی تلوار نہ چلاتے تو ایرانی آج تک مسلمان نہ ہوتے بلکہ ابھی تک آگ کی پُوجا ہی کر رہے ہوتے''۔

ابھی ماں بیٹے میں بات ہو ہی رہی تھی کہ معاویہ کچھ کھانے کا سامان لے کر آ گیا، معاویہ نے سامان ماں کو دے کر خالد کو کہا:

''کمانڈر صاحب! آیئے آپ کو میں ڈیرے کی سیر کرواتا ہوں''۔

خالد فوراً اُٹھ کر معاویہ کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔

اس نے ماں کو کہا:

''ماں! تمہارے پالتو کتے غار کے دہانے پر کھڑے دم ہلا رہے ہیں۔ تم ان کی خاطر مدارت کرو میں ذرا ڈیرے کی سیر کرآؤں''۔

یہ کہہ کر وہ معاویہ کے ساتھ غار سے باہر نکل گیا۔

(۱۱)

معاویہ خالد کو ڈیرے کے سب سے بڑے غار کی طرف لے چلا۔ خالد جب اس غار میں اندر آیا تو اِن لوگوں کی ہمت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا کہ انہوں نے بغیر کسی مشین کے اتنا بڑا غار بنا ڈالا تھا۔ وہاں بہت سے مجاہدین ایک دائرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان قہوے سے بھرا ہوا ایک برتن رکھا ہوا تھا، قہوے کی مہک سارے غار کو معطر کر رہی تھی۔ یہ سب مجاہدین اپنے مہمان سے تفصیلی ملاقات کے منتظر تھے. خالد کے غار میں داخل ہوتے ہی تمام افراد اُس کے اعزاز میں کھڑے ہوگئے۔ سب نے اُسے باری باری گرم جوشی سے گلے لگایا۔ سب افراد خالد سے معانقہ کرنے کے بعد بیٹھ گئے۔ تمام ساتھیوں کے بیٹھ جانے کے بعد معاویہ نے خالد کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا:

''ہماری سعادت ہے کہ آج ایک عظیم جہادی کمانڈر خالد خراسانی ہمارے درمیان موجود ہیں. ان کو شہید اعظم حضرت اُسامہ بن لادن کے شانہ بہ شانہ جہاد کرنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ کشمیر سے افغانستان اور افغانستان سے کاشغر تک انہوں نے کفار کے دلوں پر دہشت طاری کر دی تھی. یہ بات ساری دنیا کے مجاہدین میں مشہور تھی کہ خالد خراسانی کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا اور اُن کا بنایا ہوا منصوبہ کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھتا۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ مجھ کو اِن کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا ہے''۔

ایک مجاہد نے یہ تعریفی کلمات سننے کے بعد کہا:

''ہمارے گروہ میں آپ کی شمولیت ہم کو یقیناً طاقت و استقامت بخشے گی. ہمیں مخالف گروہوں سے شدید خطرہ ہے۔ ان حاسد مخالفین کی نظروں میں ہماری دولت اور ہماری خوبرو کنیزیں بُری طرح کھٹکتی ہیں''۔

خوبرو کنیزوں کا ذکر سُن کر خالد چونک اُٹھا۔

وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ معاویہ نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے بات کرنے سے روکتے ہوئے کہا:

''دوستو! میں ذرا اپنے مہمان کو ڈیرے کی سیر کرا دوں، آج شام کا کھانا سب مل کر کھائیں گے اور دل کھول کر گپ شپ بھی کریں گے''۔

یہ کہنے کے بعد معاویہ نے قہوے کی پیالی رکھتے ہوئے خالد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''آیئے! میں آپ کو ڈیرے کی سیر کرانے کے علاوہ آس پاس کے علاقے کے متعلق بھی سمجھا دوں''۔

یہ سن کر خالد نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''انشاءاللہ! آپ سب سے کھانے پر مُلاقات ہوگی''۔

یہ کہنے کے بعد وہ معاویہ کے ساتھ چل دیا۔

راستے میں معاویہ نے خالد سے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا:

''میں نے آپ کو جان بوجھ کر بات کرنے سے روکا تھا، ان لوگوں میں اکثریت غیر نظریاتی لوگوں کی ہے۔ یہ لوگ علاقے کے جانے مانے جرائم پیشہ تھے، لیکن یہ اب ہمارے گروہ کا حصہ ہیں''۔

خالد نے ایک لمحہ کو سوچنے کے بعد کہا:

''یہ تمہارے ساتھی کنیزوں کی باتیں کر رہے تھے! مجھے تو اس ڈیرے پر دور دور تک عورت نظر نہیں آ رہی اور پھر مسلمانوں میں کنیزیں کہاں سے مل گئیں تم لوگوں کو؟''

معاویہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا:

''کمانڈر! آپ بھول رہے ہیں کیا! اس علاقے میں ہندو، شیعہ، احمدی، بریلوی اور عیسائی کافی تعداد میں رہتے تھے. اُن کافروں کی نوجوان لڑکیوں کو کنیز بنایا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے جرائم پیشہ ساتھی مسلمانوں کی چھوٹی بچیوں تک کو اٹھا لائے ہیں تا کہ جوان ہونے پر اُن کو اپنی بیویاں بنا سکیں. سچ بات تو یہ ہے کہ بہت سے والدین نے بھی خوراک کے بدلے اپنی بچیوں کو ہمارے ساتھیوں کے سپرد کر دیا تھا۔ پہاڑی کے پچھلے حصے میں کنیزوں کے غار ہیں۔ مجھے آپ کو وہاں لے جا کر بہت شرمندگی ہوگی''۔

خالد نے معاویہ سے خفا ہوتے ہوئے کہا:

''تم تو ایک نظریاتی ساتھی ہو! تم کو اسلام اور فقہ کی بھی سمجھ ہے. کسی بھی مسلمان لڑکی کو ہم نہ کنیز بنا سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی مرضی کے بغیر اس سے نکاح کر سکتے ہیں''۔

معاویہ نے شرمندہ ہوتے ہوئے جواب میں کہا:

''آپ کی بات بجا ہے لیکن اگر میں نے اپنے کسی بھی ساتھی کی مجرمانہ سرگرمی پر اعتراض کیا تو یہ سب مل کر سب سے پہلے مجھے ہی نشانہ
بنائیں گے''۔

خالد معاویہ کی یہ بات سن کر خاموش ہو گیا. کچھ دیر اونچے نیچے راستوں سے گزر کر معاویہ خالد کو ایک اور غار میں لے گیا. اس غار میں معاویہ کے ساتھی پہلے ہی موجود تھے۔

معاویہ نے وہاں پر موجود اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا:

''کمانڈر صاحب کو ذرا ہماری کمائی کا دیدار کراؤ. انہیں دکھاؤ کہ ہم نے علاقے کے وڈیروں اور مال داروں کو کس طرح سے کنگال کیا ہے''.

معاویہ سے حکم سنتے ہی اس کے ساتھیوں نے قطار میں رکھے ہوئے تھیلوں کا منہ کھولنا شروع کر دیا. خالد سونے کے زیوات سے بھرے تھیلے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

سونے سے بھرے تھیلے دیکھ خالد نے بے اختیار کہا:

''اتنا سونا!''۔

معاویہ نے جواب میں کہا:

''ایسے کئی غار ہیں جو سونے اور چاندی سے بھر ہوئے ہیں چلیں، اب باہر چلتے ہیں''۔

''بہت سے غار کرنسی نوٹوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اب ہم ان روپوں کو خشک لکڑیوں سے ملا کر آگ جلانے کا کام لیتے ہیں۔

ان روپوں کی قدر اب کاغذ جیسے ہی رہ گئی ہے۔ کیا زمانہ تھا کہ لوگ اس روپے کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار رہتے تھے''۔

خالد نے تجسس سے دریافت کیا:

''اُتنا روپیہ آیا کہاں سے تم لوگوں کے پاس؟''

معاویہ نے کہا:

''پانی اور خوراک فروخت کر کے، پانی بیچ کر ہم نے بہت رؤ پیہ کمایا، لیکن اب پانی کے چند ہی ذخائر بچے ہیں، اب گہرائی میں بورنگ کرنے سے زہر ملا پانی نکلتا ہے، رزق تو اس زمین سے اٹھ ہی گیا تھا! اب پانی بھی نایاب ہوتا جا رہا ہے''۔

خالد نے معاویہ سے پھر ایک سوال کیا:

''تو اب آمدنی کا کیا ذریعہ ہے؟''۔

معاویہ نے جواب میں کہا:

''امدادی سامان کو لوٹنا اور اس کو مالدار لوگوں کر فروخت کرنا، مگر!!!

خالد نے معاویہ کو خاموش ہوتے دیکھ کر کہا:

''مگر کیا؟...تم کچھ کہتے کہتے رک گئے ہو''۔

معاویہ نے اپنی بات کو یوں آگے بڑھایا:

''موسم کی تبدیلی اور وباؤ کی وجہ سے لوگ اتنی تعداد میں مر رہے ہیں کہ خریدار ملنا مشکل ہو گئے ہیں۔ اور اگر خریدار مل بھی جائے تو اُس کے پاس دینے کو کچھ نہیں ہوتا''۔

یہ سب سن کر خالد کی آنکھوں میں مایوسی کے اندھیرے چھاتے جا رہے تھے۔

اس نے مایوسی کے اس عالم میں معاویہ سے پوچھا:

''کیا یہ اسلام ہے؟ کیا یہ سب کچھ جو تم لوگ کر رہے ہو جہاد ہے؟ تم اور تمہارے ساتھی بھوکے اور آفت زدہ لوگوں کو دی جانے والی امداد پر قبضہ کر کے انہی لوگوں کو فروخت کر رہے ہو۔ کاش! یہ سب کچھ کرنے سے پہلے تم حضرت معاویہ کا نام اپنے نام سے ہٹا دیتے۔ تم نے اپنا نام معاویہ سے بدل کر فرعون کیوں نہ رکھ لیا۔ یاد رکھنا تم اس سونے کے ڈھیر کے ساتھ کسی غار میں ایک فرعون کی طرح دفن ہو جاؤ گے! سونے کے یہ ڈھیر تمہاری آخرت نہ سنوار سکیں گے میرے بھائی''۔

خالد یہ سب کہتا جا رہا تھا اور معاویہ کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو بہہ کر اس کی داڑھی کو تر کر رہے تھے۔ اُسے یوں بلک بلک کر روتے ہوئے دیکھ کر خالد نے کہا:

''اگر یہ آنسو ندامت اور اللہ تعالیٰ سے معافی کے لئے ہیں تو یہ آنسو پروردگار کی بارگاہ میں قبول

ہوں گے۔ مجھے امید ہے کہ تم اپنا رستہ

بدل کر راہِ حق پر آ جاؤ گے، میں بہر حال تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا"۔

معاویہ نے شرمسار لہجے میں کہا:

"اللہ گواہ ہے کہ اِن جرائم کا ساتھ میں نے دل سے نہیں دیا۔ مجھے کہیں بھی روشنی کی کرن دکھائی نہیں دیتی۔ مجھے اِس اندھیرے میں رستہ بھائی نہیں دیتا، ہم یہاں سے نکل کر کہاں جائیں گے؟"۔

خالد نے جواب میں کہا:

"اپنے نام کی لاج رکھو، ہم مجاہد ہیں گھونٹ گھونٹ پانی پی کر اور دانا دانا گیہوں کھا کر ہم افغانستان تک پہنچ سکتے ہیں، قاری صاحب نے جو پیغمبر کی حدیث سنائی تھی وہ جھوٹ نہیں ہو سکتی، خراسان پر خلافت کا جھنڈا لہرایا جا چکا ہوگا، اگلا معرکہ غزوۂ ہند کا ہوگا۔ اللہ تمہارے گناہوں کو شہادت کے خون کی سرخی سے دھوئے"۔

معاویہ نے جواب میں سسکتے ہوئے کہا:

"آمین! میرے بھائی تم کو اللہ کا واسطہ ہے مجھے اس گناہ کی دلدل میں چھوڑ کر نہ جانا، میں آپ کو دل سے اپنا کمانڈر مانتا ہوں اور آپ کی بیعت کرتا ہوں"۔

یہ کہہ کر معاویہ نے خالد کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ رکھے اور اُن کو آنکھوں سے لگا لیا۔

خالد نے معاویہ کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا:

"فکر نہ کرو۔ اللہ اپنے نیک بندوں کو ماں سے بڑھ کر چاہتا ہے ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمارے پاس اونٹنی ہے۔ ہم تیزی سے منزل کی جانب بڑھیں گے"۔

معاویہ نے کہا:

"ہمیں ہوشیار رہنا ہوگا۔ میرے ساتھی اونٹنی کو ذبح کرنا چاہتے ہیں، انہوں نے ایک عرصے سے گوشت نہیں کھایا۔

خالد نے جواب میں کہا:

"اس سے پہلے کہ یہ اونٹنی کو نحر کریں، ہمیں یہاں سے نکل جانا ہوگا"۔

معاویہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:

''آپ کی بات بجا ہے لیکن لوگوں پر یہ قطعی ظاہر نہ ہونے دیں کہ آپ ان کی حرکتوں سے ناخوش ہیں اور یہاں سے جانا چاہتے ہیں''۔

خالد نے جواب میں کہا:

تم درست کہتے ہو مجھے یہاں سے نکلنے کا کوئی منصوبہ سوچنے دو۔ ایسا کام کرنا ہوگا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے''۔

معاویہ نے کرتے کی آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

خالد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

''چلو اب اپنے ٹھکانے کی طرف چلتے ہیں۔ ماں کا دل اکیلے میں گھبرا رہا ہوگا''۔

یہ کہہ کر اس نے معاویہ کے ہمراہ اپنے قدم غار کی طرف بڑھا دیئے۔

(۱۲)

اسلام آباد میں اعلیٰ افسران کے خفیہ اجلاس میں ہونے والے فیصلوں کے مطابق قابل اعتماد افسران اور اُن کے اہل خانہ کی فہرستیں تیار کر کے اُن کو ائر پورٹ کے قریبی علاقوں میں منتقل کیا جا چکا تھا۔ صدارتی بوئنگ طیارے میں تبدیلی کر کے اس میں زیادہ مسافروں کی گنجائش پیدا کر دی گئی تھی۔ اعلیٰ افسران کے علم میں یہ بات تھی کہ ان علاقوں سے آنے والے تارکین وطن کو یورپی ممالک کیریبین کے علاقے میں موجود کالونیوں میں منتقل کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی بھولا بھٹکا مسافر طیارہ ان علاقوں سے یورپ تک پہنچا بھی تو اس میں ایندھن بھر کر جنوبی امریکہ روانہ کر دیتے ہیں۔ اعلیٰ افسران نے یورپ میں جہازوں کی لینڈنگ کو یقینی بنانے کے واسطے یورپ کا پاسپورٹ رکھنے والے کچھ پاکستانی ڈھونڈ لئے تھے کہ شاید ان پاکستانی نژاد یورپی مسافروں کے طفیل انہیں بھی یورپ میں پناہ مل جائے۔

آج رات کے اندھیرے میں مسافروں کو طیاروں میں منتقل کرنے کا کام انجام دیا جانا تھا۔ صبح اُجالا ہوتے ہی ان طیاروں کو پرواز بھرنا تھی۔ طے شدہ منصوبے کے مُطابق کسی کو بھی بھاری سامان لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ ویسے بھی غیر ملکی کرنسیوں اور سونے سے بھرے ہوئے صندوقوں کا وزن کافی تھا۔ وہ افسران جن کے بنک اکاونٹ باہر کے ممالک میں تھے وہ یورپ کے نئے قوانین سے سخت نالاں تھے۔ اِن نئے قوانین کے مطابق انُ کو یہ وضاحت پیش کرنا تھی کہ انہوں نے یہ دولت کیسے کمائی تھی۔ ان افسران کے مُطابق اس گوری قوم نے حالات کی وجہ سے ان کے ساتھ بے ایمانی کر کے ان کی رقومات ہڑپ کرنے کی ٹھان لی تھی۔

فوج کے مسلح سپاہیوں نے تمام افسران اور اہل خانہ کو جہازوں میں سوار کرانے کے بعد جہازوں پر قبضہ کر کے خود بھی اِن پروازوں پر سوار ہونے کا مطالبہ کر ڈالا تھا۔ اعلیٰ افسران کے پاس ان کا مطالبہ ماننے

کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، یہی نہیں بلکہ جہاز کی تمام نشستیں پُر ہونے کی وجہ سے ان بے چاروں کو جہاز کے کونوں کھدروں میں بیٹھ کر سفر کرنا تھا۔

تمام معاملات طے ہونے کے بعد جہاز کے کپتان روشنی ہونے کے منتظر تھے تا کہ رن وے واضح طور پر نظر آ سکے. تمام لوگ اس بات سے بے انتہا خوش تھے کہ وہ موت کو شکست دے کر زندگی کی جانب بڑھنے والے ہیں۔ صبح ہونے کا انتظار سب کو خاصا طویل لگ رہا تھا۔ اس بات کا بھی ڈر تھا کہ کہیں دوسرے فوجی نہ آ جائیں اور ان طیاروں پر حملہ نہ کر دیں۔ آخر کار اندھیرے پر روشنی نے غلبہ پانا شروع کر دیا۔ طیاروں نے ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ اڑان بھرنے کے لئے رن وے پر رینگنا شروع کر دیا۔

(۱۳)

معاویہ نے خالد کے مشورے سے ایک منصوبہ ترتیب دیا، اس منصوبے کے مطابق اس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ:

''علاقے کے ایک بڑے زمیندار نے اپنے ایک ہرکارے کے ذریعے پیغام دیا ہے کہ اگر جلدی کینسر کی دوا، اناج کی دو بوریاں، پانی، سولر سیلز کی مکمل کِٹ اس کو پہنچا دی جائے تو وہ زمیندار اپنا تمام سونا اور بڑی مقدار میں کلاشنکوف کی گولیاں دینے کو راضی ہے۔ نیز اس کو ایک معمر اور تجر کار خاتون کی ضرورت ہے جو اس کی ماں کے جسم کی صفائی کرکے صاف کپڑے پہنا سکے''۔

معاویہ نے اپنے ساتھیوں سے مزید کہا:

زمیندار کے گاؤں تک بحفاظت جانے کے لئے دو مزید جانباز ساتھی جناب خالد خراسانی کی سربراہی میں جائیں گے۔ میں خود بھی ان کے ساتھ ہوں گا۔ کمانڈر صاحب کی والدہ کو زخمیوں کی مرہم پٹی کا تجربہ ہے ،وہ زمیندار کی ماں کے زخموں کو صاف کرنے کی ذمے داری اٹھائیں گی''۔

معاویہ کے تمام ساتھی اس منصوبے سے راضی تھے سونا اور چاندی کے ڈھیر اکھٹا کرنے کے باوجود اُن کا دل سونا جمع کرنے سے نہیں بھرا تھا۔

شام ہونے سے پہلے معاویہ کے ساتھیوں نے اونٹنی کو اچھی طرح سے کھلا پلا کر سفر کے لئے تیار کر دیا۔ تمام ضروری سامان کو لادنے کے بعد وہ لوگ سورج غروب ہوتے ہی اپنے مشن پر روانگی کے لئے تیار تھے۔ معاویہ کے ساتھی مکمل طور پر مسلح تھے، انہوں نے بھی پانی کی مشک اور کھانے کے تھیلے اپنی کمر پر لاد رکھے تھے ۔جیسے ہی سورج پہاڑیوں کے پیچھے ڈوبا، پانچ افراد پر مشتمل یہ قافلہ اپنی منزل کی سمت کو روانہ ہو گیا. بھاگ بھری کے پالتو کتے دم ہلاتے ہوئے اونٹنی کے پیچھے چل رہے تھے۔

کچھ گھنٹے چلنے کے بعد یہ قافلہ ایک مخصوص جگہ پر رُک گیا۔ بھاگ بھری کو اونٹنی سے اُتارنے کے لئے خالد نے اونٹنی کو بٹھا دیا۔

معاویہ نے اپنے دونوں ساتھیوں کے ہاتھ میں ٹارچ دے کر کہا:

''تم دونوں سامنے والے ٹیلے پر جا کر تین دفعہ ٹارچ کو وقفے وقفے سے روشن کرو اور اگر سامنے کے علاقے سے بھی ایسا ہی اشارہ ملے تو مجھے آواز دینا''۔

یہ سُن کر معاویہ کے ساتھی ٹیلے کی طرف چل پڑے۔ اُن کے کچھ آگے بڑھتے ہی معاویہ کی نظریں خالد کی نظروں سے ملیں۔ ان کی رائفلیں پہلے ہی سے لوڈ تھیں، خالد اور معاویہ کی رائفل سے ایک ساتھ نکلی ہوئی گولی نے دونوں ساتھیوں ایک ساتھ چاٹ لیا۔

بھاگ بھری یہ منظر دیکھ کر سینے پر ہاتھ کر ''ہائے'' کہتے ہوئے کہا:

''اپنے ہی ساتھیوں کو مار ڈالا''۔

''ماں! تم نہیں سمجھوگی، یہ ساتھیوں کے بھیس میں بھیڑیئے تھے، یہ تیری اونٹنی کو مار کر کھانے والے تھے انہوں نے بہت سی عورتوں کو پہاڑوں میں غلام بنا کر رکھا ہوا تھا''۔

بھاگ بھری خالد کی یہ وضاحت سن کر خاموش ہوگئی۔

خالد نے ماں کو خاموش دیکھ کر کہا:

''ماں! آؤ اب اونٹنی پر سوار ہو جاؤ --- یہاں رُکنا خطرے سے خالی نہیں--- سفر لمبا ہے--- یہاں سے لاہور--- لاہور سے--- پشاور اور وہاں سے افغانستان میں داخل ہونا ہے''۔

اس، دوران معاویہ مقتولین کا اسلحہ اور ان کی کمر پر لدا ہوا کھانے کا سامان اور پانی کی بوتلیں لے کر آ گیا ۔معاویہ یہاں کے رستوں سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے اونٹنی کی مہار پکڑ کر لاہور کو جانے والے راستے کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔

(۱۴)

البرٹ کی داستان گوئی اب آخری مراحل میں داخل ہوچکی تھی۔ داستان کے گذشتہ حصے نے طالب علموں کے اذہان میں بہت سے سوالات کو جنم دیا تھا۔ طالب علم ان سوالات کے جوابات پرفیسر صاحب سے سننے کے لئے بے تاب تھے۔ فلپ کا ہاتھ سب سے پہلے بلند ہوا تھا۔ پروفیسر صاحب نے اشارے اسے سوال پوچھنے کی اجازت دی تو اس نے پوچھا کہ:

''جس وقت ہندوستان کی سرزمین پر ایٹمی جنگ چھڑی تو اس زمانے میں، مشرقِ وسطیٰ، پاکستان، ہندوستان بنگلہ دیش وافغانستان میں بنیاد پرستانہ نظریات بہت تیزی سے پھیل رہے تھے۔ کیا اِن نظریات کی وجوہات فکری نوعیت کی تھیں؟''۔

پرفیسر صاحب نے جواب میں کہا:

''تمہارا کہنا درست ہے۔ اس زمانے میں خاص طور سے بنگلہ دیش میں آزادنہ خیالات رکھنے والے مصنفین پر قاتلانہ حملے شروع ہوگئے تھے۔ وہاں فکری وسعت رکھنے والی کتابوں کے پبلشرز کو بھی قتل کیا گیا تھا۔ اس بنیاد پرستانہ اور وحشیانہ طرزِ عمل کے پیچھے یقیناً ایک نظریاتی طاقت کارفرما تھی۔ سید قطب، حسن البناء ،سید مودودی اور محمد اقبالؒ کے نظریات وافکار نے ترقی پسندانہ مسلم دانشوروں کے نظریات پر غلبہ حاصل کرلیا تھا۔ مذکورہ بالا دانشوروں نے قومی حکومتوں کے وجود کو رد کرکے خلافت کے قیام پر زور دیا تھا۔ یہ دانشور جمہوری حکومتوں اور جمہوری نظام کے ویسے ہی کھلم کھلا مخالف تھے جیسے کہ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ ان دانشوروں نے نہ صرف جمہوری حکومتوں کی مخالفت کی تھی بلکہ زبان وثقافت کے تنوع کو بھی رد کردیا تھا۔ آپ نے تاریخ کی کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ طالبان نے افغانستان میں اور خودساختہ خلیفہ بغدادی نے شام اور عراق میں اسلام سے پہلے کے تمام آثارِ قدیمہ کو تباہ کردیا تھا''۔

اس دوران سوزان نے بھی ہاتھ کھڑا کر لیا تھا۔

پروفیسر صاحب نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''سوزان تمہارا سوال آخری ہوگا کیوں کہ آج ہم سب کو ہندستان کی دراوڑی تہذیب کے عجائب گھر کا دورہ کرنا ہے۔

کیا سوال ہے تمہارا؟ سوزان نے کہا: ''کیا ترقی یافتہ اقوام نے اس بدترین ایٹمی حملے اور ماحولیاتی حادثے سے کوئی سبق حاصل کیا؟''۔

پروفیسر صاحب نے جواب میں کہا:

''اس حادثے کے بعد یورپ اور امریکہ میں ایٹمی ہتھیاروں کے خلاف تحریک نے ایک نئی توانائی کے ساتھ سر اٹھایا. روس میں بھی ایٹمی ہتھیاروں کے خلاف رائے عامہ ہموار ہوئی۔۔۔آخر کار پچیس سال کے متواتر مذاکرات کے بعد دنیا ان منحوس ایٹمی ہتھیاروں سے پاک ہوگئی. صرف یہی نہیں بلکہ ماحولیات میں اچانک ہونے والی تبدیلی نے دنیا کو چونکا دیا تھا. آخر کار ہم ڈیزل اور پٹرول جیسے ایندھن سے جان چھڑانے میں کامیاب ہوگئے۔ سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ تیل کی بنیاد پر امیر ممالک اچانک غریب ہوگئے اور وہ پیسوں کے بل بوتے پر انتہا پسندانہ خیالات کو پھیلانے سے قاصر ہوگئے، بس آج کے لئے اتنا ہی کافی، میں آپ سب کا لاؤنج میں منتظر ہوں۔ کچھ دیر میں ہم سب ایک ساتھ سفر کریں گے۔

(۱۵)

معاویہ سرائیکی بولنے والے علاقے میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے باپ نے غربت کے ہاتھوں تنگ آ کر اُسے اسکول سے نکال کر مقامی مدرسے میں داخل کروا دیا تھا۔ مدرسے میں اُس کو تعلیم کے علاوہ، کھانا اور سال میں تین جوڑے کپڑے بھی ملتے تھے۔ اسی مدرسہ میں تعلیم پا کر وہ جہاد کی طرف راغب ہوا تھا۔ افغانستان کے علاوہ اُس نے پنجاب کے اکثر علاقوں میں جہادی سرگرمیاں انجام دی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پنجاب کے کچے پکے تمام راستوں سے واقف تھا۔

بھاگ بھری زیادہ تیز نہیں چل سکتی تھی اس لئے معاویہ بھی آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ وہ اونٹنی کی مہار کو اپنی کلائی پر باندھے اندھیرے میں گردوپیش کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے رائفل کو اپنے ہاتھ میں محاذِ جنگ پر موجود ایک فوجی کی طرح ہشیاری سے تھام رکھا تھا۔ بھاگ بھری کی نظریں معاویہ کے ہاتھ پر بندھی ہوئی گھڑی کی سوئیوں کی چمک پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ رات کے اندھیرے میں یہ سوئیاں کیسے چمک رہی ہیں۔

اُس نے آخرکار معاویہ سے پوچھ ہی لیا:

''پتر! یہ جو تیری گھڑی ہے اس کی سوئیاں اندھیرے میں جگنو کی طرح کیوں چمکتی ہیں؟''۔

معاویہ نے جواب میں کہا:

''ماں اس گھڑی کی سوئیوں پر ایک خاص رنگ ہے جو رات کے اندھیرے میں چمکتا ہے''۔

بھاگ بھری نے اپنی ٹھوڑی کو ہاتھ لگا کر حیرت کا اظہار کیا۔

معاویہ نے اسے حیرت زدہ ہوتے دیکھ کر کہا:

''کیا تم کو میری گھڑی اچھی لگی؟''۔

بھاگ بھری نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

معاویہ نے گھڑی اپنی کلائی سے اتارتے ہوئے کہا:

''ذرا اپنا ہاتھ آگے کرو''۔

معاویہ نے گھڑی بھاگ بھری کی کلائی پر باندھتے ہوئے کہا:

''آج سے یہ گھڑی تمہاری ہے''۔

بھاگ بھری نے پیار سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

''میں بھلا اس گھڑی کا کیا کروں گی۔۔۔ مجھے تو وقت دیکھنا بھی نہیں آتا ہے، ویسے وقت کو آزاد ہی ہونا چاہیئے۔ نہ جانے یہ کس کے دل میں آئی کہ وقت کو گھڑی میں قید کر دیا۔ یوں بھی اب زندگی اتنی بدل گئی ہے کہ دن بھر گرمی کے خوف سے زندہ درگور رہنا ہوتا ہے اور رات کو اُلو کی طرح باہر نکلنا ہوتا ہے''۔

معاویہ نے بھاگ بھری کو کہا:

''پھر بھی تم اِسے قبول کرلو، سمجھ لو کہ اوُپر والے نے تم کو ایک اور بیٹا دیدیا ہے''۔

بھاگ بھری نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا جو اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ اُس نے معاویہ کا تحفہ قبول کرلیا ہے۔

بھاگ بھری کی کلائی کافی پتلی تھی۔ گھڑی بار بار اس کے ہاتھ سے اتُرنے لگتی تھی۔

اس نے گھڑی کو بازو پر کھسکاتے ہوئے کہا:

''یہ گھڑی تو بہت پیسوں میں خریدی ہوگی توُ نے؟'' معاویہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا:

یہ خریدی نہیں بلکہ مالِ غنیمت میں ملی تھی''۔

بھاگ بھری نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

''تو بھی ساون کی طرح مشکل الفاظ بولتا ہے۔ یہ موُا۔ مال۔۔۔ غ غ غنیم کیا بلا ہے؟''

معاویہ نے ہنستے ہوئے جواب میں کہا:

''افغانستان میں ہم نے ہزارہ کافر شیعوں کے ایک گاؤں کو فتح کیا تھا تو یہ گھڑی میں نے خود گاؤں کے ایک آدمی کو گولی مارنے کے بعد اس کے ہاتھ سے اتاری تھی''۔

بھاگ بھری نے یہ سن کر گھڑی اپنے ہاتھ سے اُتار کر اسے واپس دیتے ہوئے کہا:

''تو یہ کہو نہ کہ لُوٹے ہوئے مال کو مال۔۔۔غ غ۔۔غنیم کہتے ہیں''۔

معاویہ نے اقرار میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

''ہاں، ہاں، لیکن صرف اُس مال کو جو جنگ میں کافر سے چھینا جائے''۔

بھاگ بھری نے دوٹوک لہجے میں کہا:

'جو بھی ہو مجھے لوٹ مار کا مال نہیں چاہیئے''۔

معاویہ نے بھاگ بھری سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور گھڑی اس سے لے کر اپنی کلائی پر باندھ لی۔
اب خالد کو اونٹنی پر بیٹھے بیٹھے تھکن ہونے لگی تھی۔

اس نے اونٹ کی کمر پر ہچکولے کھاتے ہوئے ماں کو کہا:

''ماں! اب اونٹنی کو بٹھادو۔ ذرا وہ بھی ستالے گی اور تم لوگ بھی ذرا سکون کا سانس لے لینا''۔

خالد کی آواز سن کر بھاگ بھری نے اونٹنی کی مہار معاویہ کے ہاتھ سے لے کر اونٹنی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
اونٹنی کے بیٹھتے ہی خالد پھرتی سے چھلانگ مار کر اونٹنی سے اُتر آیا۔ بھاگ بھری نے مہار کو قریب ہی موجود ایک خشک درخت کے تنے سے باندھ دیا۔ یہ لوگ اِس وقت ایک نہر میں سفر کر رہے تھے۔ جس کے شکستہ پشتوں کے دونوں اطراف گھنے درخت ہوتے تھے۔ یہ نہر سیلاب میں درختوں سمیت بہہ چکی تھی
تاہم کچھ درخت اپنی مضبوط جڑوں کی وجہ سے بہنے سے بچ گئے تھے لیکن وہ تمام درخت موسمی تبدیلی کی وجہ سے سوکھ گئے تھے۔

خالد نے نیم اندھیری رات میں دور تک نظر دوڑاتے ہوئے کہا:

''اِن ٹوٹی اور خشک نہر میں کھڑے ہو کر ان خشک درختوں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہم کسی آسیب زدہ علاقے سے گذر رہے ہیں''۔

معاویہ نے جواب میں کہا:

''بھائی یہ علاقہ پہلے غربت کے آسیب سے جکڑا ہوا تھا لیکن یہ آسیب تو ایسا ہے کہ چلتے پھرتے، جیتے جاگتے لوگ دیکھتے ہی دیکھتے زندہ

ڈھانچوں میں تبدیل ہو گئے۔ تم کو تو معلوم نہیں کہ یہاں انسانوں نے انسانوں کو مار کر ان کا گوشت کھانا شروع کر دیا تھا''۔

خالد نے معاویہ کی بات سن کر کان کو ہاتھ لگا کر کہا:

''یہ سب قیامت کی نشانیاں ہیں''۔

اس دوران بھاگ بھری نے پوٹلی کھولتے ہوئے کہا:

''چلو باتیں بعد میں کر لینا اب روٹی کھالو''۔

روٹی کی خوشبو آتے ہی کتے بھاگ بھری کے آس پاس منڈلانے لگے۔

اُس نے کتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''ارے! بھگوان کو مانو۔ اِتنی بھی کیا بے صبری۔ ذرا سانس تو لے لینے دو مگر کان کھول کر سن لو، بس ایک ٹکڑے سے زیادہ نہیں ملے گا''۔

کتوں نے بھاگ بھری کی بات سن کر ہلکی سی بخ کی آواز نکالی جیسے کی ان کی سمجھ میں بھاگ بھری کی بات آگئی ہو۔

بھاگ بھری نے کتوں کو کھانا دینے کے بعد معاویہ اور خالد کو آدھی روٹی دی، اس کے بعد اُس نے پانی کی بوتل سے ایک گھونٹ پانی پی کر کہا:

''اب گھونٹ گھونٹ پانی پی کر گزارا کرنا ہے، بھگوان جانے کب تمہیں تمہاری منزل تک پہنچائے؟

خالد نے ماں کی بات سن کر کہا:

''ماں! منزل پر پہنچانا اوپر والے کا کام ہے، کیا تم صرف پانی پی کر گزارہ کرو گی؟ تم بھی پیٹ مین کچھ ڈال لو''۔

بھاگ بھری اپنے بیٹے کی بات سن کر تھیلے سے خشک روٹی کا ایک ٹکڑا نکال کر چبانے لگی۔

معاویہ نے روٹی چباتے ہوئے خالد سے کہا:

''میں نے کبھی یہ سوچا تک نہ تھا کہ ایسی زرخیز زمین، جو ہر وقت سبزے سے ڈھکی رہتی تھی ایک روز ایسی پتھریلی اور بنجر ہو جائے گی! ایسا لگتا ہے کہ زمین کی بھی انسانوں کی طرح موت واقع ہو جاتی ہے''۔

بھاگ بھری نے معاویہ کی بات سن کر کہا:

''پتر! زمین مری نہیں، اِسے قتل کیا گیا ہے''۔

خالد نے ماں کی بات سن کر دل میں سوچا:

''شاید ماں صحیح کہتی ہے''۔

معاویہ کھانا کھاتے ہی کھڑے ہوگیا۔ اُس نے کہا:

''اب چلنا چاہیئے۔ رات بھر جتنا سفر ہو سکے اچھا ہے۔ ہماری سمت بالکل صحیح ہے۔ یہ رستہ لاہور کو ہی جاتا ہے''۔

یہ سب معاویہ کی بات سن کر کھڑے ہو گئے۔

بھاگ بھری نے اونٹنی کو سہلاتے ہوئے کہا:

''ایک بات اس اونٹنی کی بہت اچھی ہے۔ اس کے تھنوں میں پھر سے دودھ اُتر آیا ہے۔ کل تم دونوں کو تازہ دودھ پینے کو ملے گا۔

یہ کہنے کے بعد اس نے خالد سے کہا:

''پتر! تو اونٹنی کی مینگنیوں کو اکھٹا کر لے''۔

خالد نے ماں کو کہا:

''یہ مینگنیاں سمیٹنے کی کیا تک ہے؟''۔

بھاگ بھری نے کہا:

''کسی دشمن کے لئے نشان نہ چھوڑو کہ یہاں سے کوئی جانور گزرا ہے۔ لوگ خوراک کے بھوکے ہیں۔ اس اونٹنی کے ساتھ ہمیں بھی مار ڈالیں گے۔ دوسری بات یہ کہ جلانے کو خشک لکڑیاں بہت مشکل سے ملتی ہیں، یہ مینگنیاں جلانے کے کام بھی آسکتی ہیں اور اگر کسی کو زخم لگ جائے تو اُن کا لیپ زخم بھر دیتا ہے''۔

بھاگ بھری کی بات سن کر خالد نے سرہلاتے ہوئے مینگنیاں اکھٹا کرنا شروع کر دیں''۔

اس کام سے فارغ ہو کر تینوں نے چلنا شروع کر دیا۔

سفر کو دلچسپ بنانے کی خاطر معاویہ نے بھاگ بھری سے پوچھا:

''ماں! تم کبھی کبھی خالد کو ساون کے نام سے بھی پکارتی ہو۔ یہ نام تمہارے منہ سے کتنا بھلا لگتا ہے۔
تم اُسے ساون ہی پکارا کرو شاید تمہارے ساون پکارنے سے سچ مُچ روٹھا ساون لوٹ آئے''۔

بھاگ بھری نے جواب میں کہا:

''میں نے تو اس کا نام ساون ہی رکھا تھا۔ یہ بھری برسات میں جو پیدا ہوا تھا! بھگوان سمجھے ان موئے مدرسہ والوں کا جنھوں نے اس کا نام بگاڑ کر خالد رکھ دیا''۔

معاویہ نے بھاگ بھری کا جواب سن کر ہنستے ہوئے کہا:

''اچھا! تو تم میری کہانی سنو!''

بھاگ بھری نے جواب میں کہا:

''ہاں! ہاں ضرور سُناؤ''۔

معاویہ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا:

''میری ماں سندھی تھیں اور باپ سرائیکی۔ ماں کو شاہ لطیف کا بہت سا کلام زبانی یاد تھا، ماں پڑھی لکھی تو نہیں تھی لیکن اُس نے شاہ سائیں
کے فقیروں سے ان کے کلام کو سُن کر یاد کر لیا تھا۔ اُس کو سسی پنوں کی کہانی بالکل ایسے ہی یاد تھی جیسے شاہ لطیف کے فقیر گاتے تھے۔ خیر! میں پیدا ہوا تو اُس نے میرا نام پنوں رکھا۔ میں چھوٹا تھا تو وہ سریلی آواز میں شاہ لطیف کا کلام میرے لئے گاتی تھی۔ یہ بتاتے بتاتے شدّت جذبات سے اُس کی آواز رُندھ گئی تو

بھاگ بھری نے شفقت سے اُس کے سر پر دلاسہ دینے کے انداز میں ہاتھ رکھ دیا۔

معاویہ نے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے مزید کہا:

''باپ مجھے اسکول سے اٹھا کر مدرسہ لے گیا۔ وہاں پر بڑے مولوی صاحب نے میرا نام پُوچھا، میں نے فخر سے بتایا کہ میرا نام پنوں ہے''۔

یہ کہہ کر معاویہ خاموش ہو گیا تو بھاگ بھری نے کہا:

''پتر! رک کیوں گیا؟، پھر کیا ہوا؟''۔

معاویہ نے کہا:

مولوی صاحب نے باپ کو غصے سے کہا:

''یہ کیا فضول عاشقوں جیسا نام رکھا ہے۔ کیا اسے بڑے ہو کر عشق لڑانا ہے۔ یہ بڑا ہو کر مجاہد اسلام بنے گا۔ بس آج سے اس کا نام معاویہ ہے''۔

بھاگ بھری نے یہ بات سن کر کہا:

''بھگوان ہی جانے، ان مدرسے والوں کو ماں کے رکھے ہوئے نام سے اللہ واسطے کا بیر کیوں ہوتا ہے ؟''۔

یہ کہنے کے بعد بھاگ بھری نے ایک وقفے کے بعد کہا:

''پھر کیا ہوا پتر؟''۔

''پھر کیا ہونا تھا ماں جی! میں اپنے نام کے چھن جانے سے کئی روز تک چھپ چھپ کر رویا، پھر مجھے نئے نام کی عادت پڑ گئی لیکن ماں نے مجھے کبھی بھی نئے نام سے نہیں پکارا۔ لیکن۔۔۔۔''۔

بھاگ بھری نے کہا:

''تو خاموش کیوں ہو جاتا ہے؟۔ بات پوری کیا کر!''۔

معاویہ نے کہا:

''ایک بات کا افسوس مجھے ساری زندگی رہے گا''۔

بھاگ بھری نے سنجیدگی سے پوچھا:

''کس بات کا افسوس پتر؟''۔

معاویہ نے افسردگی سے کہا:

''ماں کہتی تھی کہ اُس نے مجھے شاہ لطیف سے مانگا تھا۔ وہ مجھ کو شاہ کے مزار پر لے جانا چاہتی تھی لیکن وہ غریب تھی اس لئے نہ لے جا سکی پھر جب حالات اچھے ہوئے تو وہ سفر کے لئے تیار ہوئی تھی لیکن۔۔۔۔

معاویہ نے مزید کہا:

''میرا باپ مجھے مدرسے سے لینے آیا اور اس نے نے بڑے مولوی صاحب سے کہا کہ وہ مجھے کچھ روز کے لئے بھٹ شاہ لے جانا چاہتا ہے۔ باپ کی بات سنتے ہی مولوی صاحب آگ بگولا ہو گئے۔ میرے باپ

نے مولوی صاحب کو بہت سمجھایا کہ ماں نے مجھے شاہ لطیف سے مانگا تھا۔ بس، اس بات پر میرے باپ کی بہت بے عزتی ہوئی۔ مولوی صاحب نے باپ کو میرے سامنے کہا کہ تم مشرک ہو، شاہ لطیف کون ہوتا ہے اولاد دینے والا؟''۔

بھاگ بھری نے معاویہ کی بات سن کر غصّے سے کہا:

''اتنی سی بات مولبی کی عقل میں نہیں آئی کہ اگر بچے بغیر مانگنے دنیا میں آسکتے ہیں تو کسی کے مانگنے سے بھی آسکتے ہیں۔ شاہ لطیف تو پھر بھی اوتاروں کے اوتار ہیں۔ شاید میرے کہنے سے بھی بھگوان کسی کو اولاد دے۔''

معاویہ نے بھاگ بھری کے جواب میں کہا:

''میری ماں سادہ اور ان پڑھ تھی... سچ بات یہی ہے کہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے، غیر اللہ سے مدد مانگنا شرک ہے۔ اللہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے''۔

بھاگ بھری نے معاویہ کی بات سن کر پھر غصّے سے کہا:

تو سارے رستے اپنے اللہ کا کیا کرایا دیکھتا تو آ رہا ہے۔ کیا گل کھلائے ہیں تیرے اللہ نے۔ انسان انسان کے خون کا پیاسا ہے۔ جانوروں پر مصیبت ہے درخت مرتے جا رہے ہیں بس تیرا اللہ یہ سب بہتر ہی کر رہا ہے.''

معاویہ بھاگ بھری کے غصے سے بھرپور لہجے سے مرعوب ہو کر خاموش ہو گیا۔

سفر کرتے کرتے کافی دیر ہو چکی تھی۔ آسمان کا نظارہ بتا رہا تھا کہ صبح ہونے کو ہے. سورج نکلنے سے پہلے ضروری تھا کہ ان کو کوئی پناہ گاہ مل جائے، جہاں یہ سب آگ برساتے ہوئے سورج کے عذاب سے بچ سکیں۔

اِس وقت یہ لوگ میدانی علاقے میں تھے، یہاں کسی غار کا ملنا محال تھا. معاویہ نے اونٹنی پر بیٹھے بیٹھے گرد و پیش کا جائزہ لیا. صبح کی روشنی میں وہ اب دور تک دیکھ سکتا تھا۔ اُس نے خالد کو ایک سمت کو چلنے کی تجویز دی.

خالد اونٹنی کی مہار پکڑ کر معاویہ کی بتائی ہوئی سمت کو چل پڑا۔

ایک مقام پر پہنچ کر معاویہ نے اونٹنی کو بٹھانے کو کہا۔

اونٹنی جیسے ہی بیٹھی تو خالد نے معاویہ کو اترنے کا سہارا دیتے ہوئے کہا:

''کیا کسی پناہ گاہ کے ملنے کے آثار ہیں؟''۔

معاویہ نے جواب میں کہا:

''اونٹنی کو ماں جی کے پاس چھوڑ کر تم میرے ساتھ آؤ مجھے شبہ ہے کہ آگے کچھ گڑھے کھدے ہوئے ہیں۔اپنی رائفل سے تم مجھ کو کور دے کر میرے پیچھے چلنا''۔

خالد معاویہ کے پیچھے چل پڑا۔کچھ آگے چل کر معاویہ کو ایک بڑا سا گڑھا نظر آیا۔ایک ڈھلواں راستے کے ذریعے اس میں اترنے کا راستہ بنایا گیا تھا۔معاویہ اس گڑھے میں اتر گیا۔خالد رائفل تانے اُس کے پیچھے ہشیاری سے چل رہا تھا۔اس گڑھے میں چھوٹے چھوٹے بغلی گڑھے گہرائی میں بنائے گئے تھے جیسے کہ عرب میں بغلی قبریں کھودی جاتی ہیں۔ان میں سے اکثر گڑھوں میں انسانی باقیات موجود تھیں۔یہ گڑھے شاید مقامی لوگوں نے گرمی سے بچنے کے لئے کھودے تھے۔یہ بے چارے غالباً گرمی سے تو بچ گئے مگر بھوک کا عفریت ان کو نگل گیا تھا۔

اِن گڑھوں کا معائنہ کرنے کے بعد معاویہ نے خالد سے کہا:

''ان خوفناک ڈھانچوں کو نکالتے ہیں، ماں ان کو دیکھ کر نہ ڈر جائے؟''

خالد نے جواب میں کہا:

''میری ماں حالات کا بے جگری سے مقابلہ کرنے والی عورت ہے،شاید بہادری مجھے ماں کی طرف سے ہی ورثہ میں ملی ہے ویسے بھی سارے رستے میں انسانی پنجر ہی دیکھتی آئی ہے۔البتہ غار کو صاف کرنے میں کوئی حرج نہیں''۔

یہ کہہ کر اس نے ان قبر نما گڑھوں کی صفائی کرنے میں معاویہ کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔گڑھوں کو دن گذارنے کے قابل بنانے کے بعد خالد اونٹنی کو ماں سمیت نیچے اُتار لایا۔اونٹنی کو بٹھا کر اُس نے اُس پر سے لدا ہوا سامان اتارا۔بھاگ بھری نے چارے میں پانی ملا کر اونٹنی کے آگے رکھا، اور اپنے کتوں کو پانی میں روٹی بھگو کر کھانے کو دیدی۔

خالد نے معاویہ سے سولر پینلز والے پیکٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا:

''یہ امریکی امداد کا پیکٹ ہے،یقینی طور پر کام کا ہوگا، ذرا اسے کھولو تو سہی''۔

معاویہ نے اس پیکٹ کو کھولا تو خالد نے دیکھا کہ یہ ایک مکمل کِٹ تھی۔اس کی مدد سے ملحقہ بیڑی میں

سورج کی توانائی جمع کی جاسکتی تھی۔اس کِٹ میں روشنی حاصل کرنے کے لئے بلب اور کھانا تیار کرنے کے لئے برتن بھی موجود تھا۔ خالد مختلف اقسام کے بم بنانے کی مہارت کی وجہ سے آدھا انجینئر بن چُکا تھا۔اُس نے بہت ہی مہارت سے پینلز کو بیڑی سے منسلک کر کے اُن کو سورج کے رُخ کی طرف کر دیا تا کہ بیڑی کو سورج کی توانائی سے بھر دیا جائے۔۔ بھاگ بھری نے اِس دوران اونٹنی کا دودھ دوھ لیا تھا جو کہ ان تینوں کے لئے کافی تھا۔

ان تینوں نے خشک روٹی کو بھگو کر کھایا۔ بھاگ بھری کھانے کے بعد قبر نما گڑھے میں ستانے کو لیٹ گئی

خالد نے فجر کی نماز کی تیاری کرتے ہوئے معاویہ سے کہا:

''میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نماز سے دوُر ہو گئے ہو''۔

معاویہ نے جواب میں کہا:

''ہاں! یہ بات سچ ہے۔ایک عرصہ ہو گیا ہے، میرا دل نماز میں نہیں لگتا ہے''۔

خالد نے جواب میں کہا:

''دل لگے نہ لگے عبادت ہر حال میں کرنی چاہیئے''۔

بھاگ بھری نے خالد کی بات سن کر کہا:

''یہ کیا بات ہوئی، اگر دل پوُجا میں نہ ہو تو وہ پوُجا نہیں ہوتی ہے''۔

خالد نے ماں کو جواب دیتے ہوئے کہا:

''ماں! تم مسلمانوں کی نماز کو ہندوؤں کی پوُجا سے نہ ملاؤ''۔

بھاگ بھری خالد کا جواب سن کر خاموش ہو گئی۔

معاویہ نے خالد کو وضاحت پیش کرتے ہوئے کہا:

''میں جب بھی نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہوں تو دل میں خیال آتا ہے کہ:

اے اللہ! تو کیسا رب ہے جس نے اپنے مخلوق سے بسے ہوئے شہروں اور دیہاتوں کو بے دردی سے ڈبو کر اپنی ہی مخلوق کو بھوکا مارنا شروع کر دیا؟۔انہوں نے تیرا کیا بگاڑا تھا؟''۔

معاویہ کی بات سن کر خالد نے خاموشی سے نماز کی نیت باندھ لی۔

(١٦)

دن کا آخری پہر ڈھل چکا تھا، خالد نیند بھر جانے کی وجہ سے جاگ چکا تھا۔ اسے اچانک کتوں کے زور زور سے بھونکنے کی آواز آئی۔ اس کی چھٹی حس نے اسے خطرے کا احساس دلایا تو اس نے اپنی رائفل اٹھا کر احتیاط سے گڑھے سے سر باہر نکال کر دیکھا۔ دو مسلح افراد گڑھے میں اُتر رہے تھے۔ کتے ان پر بھونک کر الٹے قدموں سے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہے تھے۔ ایک حملہ آور نے رائفل تان کر ایک کُتے کی طرف کر کے فائر کر دیا۔ وہ بے زبان وہیں پر ڈھیر ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرے کُتے کو مارتا، وہ حملہ آور خالد کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ ابھی دوسرا حملہ آور آنے والی گولی کی سمت کا اندازہ کر ہی رہا تھا کہ اُسے معاویہ کی گولی نے آلیا۔ اپنا شکار کرنے کے بعد معاویہ بلا دھڑک غار سے باہر آ گیا تھا۔ کتّا اپنے مرے ہوئے ساتھی اور حملہ آوروں کی لاشوں کو باری باری سونگھ رہا تھا۔

معاویہ نے خالد سے کہا:

''میں اوپر جا کر جائزہ لے کر آتا ہوں، ہوسکتا ہے ان کے اور ساتھی موجود ہوں۔ تم مجھے پیچھے سے کور دے کر رکھو۔

معاویہ اور خالد نے اوپر آ کر صورتحال کا جائزہ لیا۔ وہاں پر دور دور تک کسی اور انسان کے آثار نہ تھے۔

خالد نے معاویہ سے کہا:

''صبح میں اونٹنی ن مینگنیاں سمیٹنا بھول گیا تھا، شاید یہ لوگ مینگنیاں دیکھ کر ہی ہم تک پہنچے تھے''۔

معاویہ نے جواب میں کہا:

''تمہارا خیال صحیح ہے۔۔۔ میں مینگنیاں سمیٹتا ہوں تم ماں سے تیار ہونے کو کہو۔۔۔ اب یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں''۔

یہ کہہ کر معاویہ نیچے کی طرف چل دیا تا کہ ماں کو تیار ہونے کو کہہ دے۔ اس نے نیچے آ کر دیکھا کہ ماں مرے ہوئے کتے کے پاس بیٹھی آنسو بہار ہی تھی۔ جبکہ دوسرا کتا اس کے برابر میں سنجیدگی سے کھڑا تھا جیسے کہ وہ بھی سوگ میں برابر کا شریک ہو۔

خالد نے ماں کو روتا دیکھ کر کہا:

''ماں! اب رونے دھونے کا وقت نہیں، ہمیں یہاں سے فوراً نکلنا ہے۔۔۔ یہ جگہ محفوظ نہیں''۔

خالد کی بات سن کر بھاگ بھری نے اونٹنی پر سامان لادنا شروع کر دیا۔ خالد نے سولر پینلز کو احتیاط سے ایک بوری میں ڈال کر بیٹری کو ایک بلب سے منسلک کر کے اونٹنی کی گردن میں باندھ دیا۔ ان کا سفر اب روشنی میں ہونا تھا۔

بھاگ بھری اونٹنی پر سوار تھی۔ خالد اور معاویہ تیز تیز قدموں سے چل رہے تھے خالد نے بیٹری سے روشن بلب کو ہاتھ میں ایک ٹارچ کی طرح تھام رکھا تھا۔ اندھیری رات میں روشنی کی وجہ سے ان کے سفر کرنے کی رفتار میں اضافہ ہو گیا تھا۔ بھاگ بھری بہت دیر تک اونٹنی پر بیٹھے رہنے سے تھک گئی تھی. اُس نے اونٹنی پر سے خالد کو آواز دے کر کہا:

''پتر! میں اب تھک گئی ہوں تو یا معاویہ اونٹنی پر سوار ہو جا''۔

خالد نے ماں کی آواز سن کر اونٹنی کو بٹھا دیا۔

جب بھاگ بھری اونٹنی سے اُتر آئی تو معاویہ نے کہا:

''کمانڈر صاحب! آپ اونٹنی پر تشریف رکھیں آپ کے بعد میرا نمبر ہوگا''۔

خالد وقت ضائع کئے بغیر اونٹنی پر سوار ہو گیا۔ بھاگ بھری خالد کو اونٹنی پر سوار کرا کے خوش ہو گئی۔ اس کا سفر معاویہ سے گپ شپ لگا کر آسانی سے کٹ جاتا تھا جبکہ خالد اپنے خیالوں میں ہی مگن رہتا تھا اور گفتگو کم ہی کرتا تھا۔

چلتے چلتے وقت گزارنے کے لئے بھاگ بھری نے حسب معمول معاویہ سے پوچھا:

''پُتر! کچھ اپنے بچپن کے بارے میں بتا۔۔۔ تیرے اور بہن بھائی بھی تو ہوں گے؟''۔

معاویہ نے جواب میں کہا:

''میرے دو بھائی اور تھے۔ ایک کو آبا نے بچپن سے ہی مکینک کی دکان پر بٹھا دیا تھا اور دوسرا اینٹوں کے بھٹے پر مزدوری کرتا تھا۔ مجھ کو پڑھائی کا شوق تھا تو آبا نے مجھے اسکول سے نکال کر مدرسہ میں ڈال دیا تھا۔

بھاگ بھری نے تجسس سے پوچھا:

''تو پڑھ لکھ کر کیا بننا چاہتا تھا؟''۔

معاویہ نے سوچتے ہوئے جواب دیا:

''میں پڑھ لکھ کر بانسری نواز بننا چاہتا تھا۔ جب بھی میں اسکول سے گھر آتا تھا تو گاؤں کے بانسری نواز کو بانسری بجاتے دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا۔ اُس کی انگلیوں میں کوئی جادو تھا جس سے وہ مدہوش کر دینے والی موسیقی فضا میں کچھ اس طرح بکھیرتا تھا کہ وقت تھم جاتا تھا۔ میں اُس کے پاس سے اُس وقت تک نہ اٹھتا تھا کہ جب تک کہ وہ بانسری بجانا بند نہ کردے۔ میں نے اُس کو کہا کہ چاچا مجھے بانسری بجانا سکھا دو گے؟ تو اُس نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں پڑھنا لکھنا سیکھ لوں گا تو وہ مجھ کو اپنا شاگرد بنا لے گا۔ اس کا کہنا تھا کہ موسیقی جاہل لوگ نہ تو سیکھ

سکتے ہیں اور نہ ہی وہ موسیقی کو سمجھ سکتے ہیں''۔

بھاگ بھری نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

''ہاں بات تو صحیح ہی کہتا تھا۔۔ مجھے اسی لئے شاید موسیقی کی کوئی شدھ بدھ نہیں''۔

بھاگ بھری یہ کہہ کر خاموش ہوگئی تو معاویہ نے مزید کہا:

''ایک روز نہ جانے میرے دل میں کیا خیال آیا کہ مدرسے کے ایک استاد سے میں نے بانسری سیکھنے کی خواہش کا اظہار کرڈالا''۔

بھاگ بھری نے بے تابی سے پوچھا:

''پھر کیا ہوا؟''۔

معاویہ نے کہا:

''ہونا کیا تھا، وہ مار پڑی کہ نہ پوچھو مار کے بعد آدھے دن دھوپ میں کھڑا رکھا گیا۔۔۔ جس سے مجھے بخار چڑھ گیا تھا۔ استاد نے مار مار کر کہا تھا کہ مسلمان کے ہاتھ تلوار اُٹھانے کے لئے ہوتے ہیں بانسری

پکڑنے کے لئے نہیں''۔

بھاگ بھری نے معاویہ کی بات سن کر کہا:

''مولبی صحیح ہی کہتا تھا۔۔ابھی تک تو میں لوگوں کے ہاتھوں میں ہتھیار ہی دیکھ رہی ہوں۔۔۔کھانے کو روٹی نہیں ہے پر ہتھیار ٹانگے پھر رہے ہیں''۔

یہ کہنے کے بعد بھاگ بھری نے پھر ایک سوال پوچھا:

''بیٹا! مدرسے میں تجھ کو ماں تو بہت یاد آتی ہوگی''۔

معاویہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا:

''ہاں! ماں۔۔۔۔شروع شروع میں تو میں اسے یاد کرنے بہت روتا تھا پر پھر وہاں پر دوست بن گئے تھے اور اُن میں دل لگ گیا تھا۔ابا سال میں ایک دفعہ آکر گاؤں لے جاتا تھا۔چار سال کے بعد پرانے مدرسے سے مجھے اکوڑہ خٹک کے مدرسے میں بھیج دیا گیا تو میں کئی برس ماں کو نہیں دیکھ پایا تھا''۔

بھاگ بھری کو معاویہ کی داستان نے رلا دیا تھا۔۔اُسے اپنے ساون کی جدائی کے دن یاد آگئے تھے۔

اُس نے ہتھیلی سے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا:

''بیٹا! تجھے کیا معلوم کہ تیری ماں تیری جدائی میں تیرے لئے کتنا روئی ہوگی۔۔۔میں نے اپنے ساون کی جدائی میں اتنے آنسو بہائے تھے کہ وہ بالکل ایسے ہی خشک ہوگئے تھے جیسے ہمارے دیس کے دریا خشک ہوگئے ہیں''۔

یہ کہہ کر بھاگ بھری نے پوچھا:

''پتر! اب نہ جانے تیری ماں اور باقی گھر والے کس حال میں ہوں گے؟''۔

معاویہ نے جواب میں کہا:

''ہمارا گھر مردہ ستلج دریا کے کنارے تھا۔اس دریا میں شاید ہی کبھی پانی آتا تھا۔جب سے ہمارے حکمرانوں نے ستلج کا پانی ہندوستان کو دیا تھا ہماری زمین بنجر ہوگئی تھی۔۔۔۔اور یہی وجہ ہماری غربت کی تھی۔بس سیلاب آئے تو راتوں رات ستلج میں غضب کی باڑھ آگئی۔کناروں پر بسے سارے گاؤں تنکے کی طرح بہہ گئے۔ہمارے گاؤں کا کوئی بھی انسان اور جانور زندہ نہ بچ پایا''۔

بھاگ بھری معاویہ کی داستان سن کر پھر رونے لگی۔ اس دوران کتا بار بار اس کی ٹانگوں سے لپٹ رہا تھا گویا اُس کا دل بہلانے کی کوشش کر رہا ہو۔

بھاگ بھری نے کتے کو پرے دھکیل کر معاویہ سے کہا:

''پتر! میں نے تجھ کو پہلے بھی کہا ہے کہ مجھے اپنی ماں ہی سمجھا کر۔ بس جب تو خالد جیسی موٹی موٹی باتیں کرتا ہے تو وہ میری سمجھ میں نہیں آتی ہیں اور مجھے کبھی کبھی غصہ آ جاتا ہے''۔

معاویہ نے کہا:

''ہاں ماں! تُو ہمارے کمانڈر صاحب کی ماں ہے تو میری بھی ماں ہے''۔

بھاگ بھری یہ سن کر خوش ہوگئی اور چہک کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا:

'ایک بات پوچھوں؟''۔

معاویہ نے کہا:

''ہاں، ہاں بھلا پوچھنے کی کیا بات ہے! پوچھو؟''

بھاگ بھری نے کہا:

''کیا میں تجھ کو تیرے بچپن کے نام سے پکار سکتی ہوں جس، نام سے تیری ماں تجھے پکارتی تھی؟''

معاویہ نے ایک بچے کی طرح خوش ہو کر کہا:

''ہاں، ہاں کیوں نہیں.. میرے کانوں میں تو وہ نام آج تک گونجتا ہے''۔

بھاگ بھری نے کہا:

''بس، میں تجھے آج سے پنوں پکاروں گی... ''معاویہ'' میرے منہ سے نکلتا نہیں ہے اور خالد میرا مذاق اڑاتا ہے۔ اسے بھی میرا دل ساون پکارنے کا بہت کرتا، اور اُس نے مجھے کہہ بھی دیا ہے کہ میں اُسے ساون پکار سکتی ہوں لیکن مجھے لگا کہ اُس نے دل سے نہیں کہا تھا، شاید میرا دل رکھنے کو کہ دیا تھا۔ اس لئے میں اسے خالد ہی کہتی ہوں''۔

خالد اونٹنی پر بیٹھا ماں کی ساری گفتگو سن رہا تھا۔

اس نے اوپر سے ہی چلا کر کہا:

''ماں! بس، اب تم اونٹنی پر بیٹھ جاؤ... تم آہستہ چلتی ہو۔ اس طرح ہم تیزی سے سفر نہیں کر سکتے. ہمارے پاس کھانے کا ذخیرہ ختم ہو رہا ہے اور تم نے باتیں کر کر کے معاویہ کے کان کھا لیے ہیں''۔

یہ کہنے کے بعد معاویہ نے اونٹنی کو بٹھا دیا۔ اونٹنی کے بیٹھنے کے بعد خالد نے ماں کو اونٹنی پر بٹھا کر اُس کی مہار معاویہ کے ہاتھ میں دیدی۔ اب ان کے قافلے نے قدرے تیز رفتاری سے سفر کرنا شروع کر دیا۔ شمسی توانائی سے روشن بلب کی وجہ سے ان کو آگے بڑھنے میں دشواری کا سامنا نہ تھا۔

راتوں کو سفر کرتے اور دن میں سورج کی کرنوں سے دبکتے، چھپتے، مختلف قصبوں اور شہروں سے ہوتے ہوئے آخر کار لاہور شہر میں داخل ہو گئے۔ باغوں اور کالجوں کا یہ شہر اب ایک آسیب زدہ شہر کا منظر پیش کر رہا تھا۔ نہ جانے اس شہر کے باسی کہاں چلے گئے تھے۔ شہر میں جا بجا بکھرے ہوئے انسانی پنجر اِس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ اس شہر کے باسی یہاں پر دم دوڑ چکے ہیں یا یہاں سے کوچ کر گئے ہیں۔ معاویہ اس شہر کے چپے چپے سے واقف تھا۔ اِس نے اِس شہر میں بہت سی جہادی کاروائیاں انجام دی تھیں۔ وہ ہر جہادی کاروائی کے بعد اپنے مجاہد ساتھیوں کو گوال منڈی میں پیڑے والی لسی پلانے ضرور لاتا تھا۔

خالد اور معاویہ نے شہر کی گلیوں سے گزرتے ہوئے اپنی بندوقوں کو چابک دستی سے تھاما ہوا تھا۔ ان کو کسی بھی اجاڑ مکان سے حملہ آوروں کے برآمد ہونے کا خدشہ تھا۔

صبح کی روشنی ہوئی تو معاویہ نے دیکھا کہ کتے کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔

معاویہ نے کتے کی اس حالت کو دیکھ کر کہا:

''سیلابی پانی پینے سے بہت سے انسان اور مویشی اس مہلک بیماری سے مر چکے ہیں. یہ بیماری اڑ کر ہم کو اور ہماری اونٹنی کو بھی لگ سکتی ہے''۔

خالد نے معاویہ کی بات سن کر کہا:

''ہمیں اسے مار کر اس تکلیف سے نجات دلا دینا چاہیئے''۔

معاویہ نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں سے پہلے ہی آنسو بہنا شروع ہو گئے تھے۔ ماں کو یوں روتے دیکھ کر خالد نے ماں سے کہا:

''ماں یہ بے زبان تکلیف میں ہے۔ ہم اس کو دوا نہیں دے سکتے لیکن اس کو تکلیف سے نجات دلا سکتے

ہیں۔ایک آخری درد سے اس کی زندگی سے درد و تکلیف ختم ہو جائے گی۔تم یہ بھی نہیں چاہو گی کہ اس کی بیماری ہم کو یا تمہاری اونٹنی کو لگ جائے"۔

بھاگ بھری نے آنسو پونچھ کر اونٹنی پر لدے ایک تھیلے سے روٹی کا ٹکڑا نکال کر کتے کے آگے ڈال دیا اور اونٹنی کی مہار پکڑ کر آگے نکل گئی۔کچھ ہی دیر میں اس کے کانوں میں فائر کی آواز گونجی بھاگ بھری میں پلٹ کر دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔ اِن کو دھوپ سے بچنے کے لئے پناہ کی ضرورت تھی۔ابھی تک ان کو کوئی مناسب مکان نہیں مل پایا تھا کہ جہاں وہ سر چھپا سکیں۔زیادہ تر مکانات کی حالت بہت مخدوش

تھی۔کافی تلاش کے بعد ان کو ایک بڑا سا بنگلہ پسند آ گیا۔اس بنگلے کی چہار دیواری ڈھ چکی تھی۔اس بنگلے پر پیلے رنگ کی مٹی کا لیپ بتا رہا تھا کہ یہ کافی عرصے پانی میں ڈوبا رہا ہے۔اس بنگلہ میں گاڑیوں کے گیراج میں اونٹنی بہت آرام سے سائے میں بیٹھ سکتی تھی۔ یہ سب لوگ اس بنگلے میں آ گئے۔خالد نے اونٹنی کو گیراج میں بٹھا کر اس پر سے سامان اتار لیا۔

سامان اتارنے کے بعد اس نے ماں سے کہا:

"تم اونٹنی کے چارے کا بندوبست کرو۔میں ذرا اِس بیڑی کو چارجنگ پر لگا دوں تا کہ تم کچھ کھانے کو تیار کر سکو۔ان کمبخت کافروں نے کتنی شاندار چیز ایجاد کی ورنہ ہم کچا اناج کھا کھا کر بیمار ہو جاتے۔کاش! یہ امریکن مسلمان ہوتے"۔

یہ کہہ کر خالد سولر پینلز کو ایسی جگہ رکھنے چلا گیا جہاں سورج کی کرنیں براہ راست پڑتا تھیں۔بھاگ بھری نے ضروری صفائی کرنے کے بعد خالد اور معاویہ کو اونٹنی کا تازہ دودھ اور کچھ چھوہارے کھانے کو دیئے۔یہ لوگ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد آرام کرنے کو لیٹ گئے تا کہ سورج ڈھلتے ہی اپنی منزل کو روانہ ہو جائیں۔

(۱۷)

اب تک کے سفر میں ان کو صرف ایک دفعہ ڈکیتوں سے واسطہ پڑا تھا۔لوٹتا بھی کون! شاید اب آس پاس کے علاقوں میں کوئی زندہ ہی نہیں بچا تھا۔اِس وقت اِن کا یہ چھوٹا سا قافلہ راوی دریا کو پار کر رہا تھا۔تباہی سے پہلے کے زمانے میں بھی اس دریا میں پانی سیلابی زمانے میں ہی آتا تھا اس وقت کے حکمرانوں نے اس دریا کو ایک گندے نالے میں تبدیل کر دیا تھا۔سارے لاہور شہر کا گند اِس دریا میں انڈیل دیا جاتا تھا، جب کہ ہندوستان سے بھی گندے نالے کا پانی اس دریا میں آتا تھا۔اِس وقت دریا کی زمین خشکی سے ایسی چٹخی ہوئی تھی کہ جیسے دریا سے کبھی پانی نہ گذرا ہو۔

راوی پار کرنے کے بعد معاویہ نے خالد سے کہا:

''میں دو مرتبہ راوی کے اس پار لشکرِ طیبہؔ کے مرکز میں درس حاصل کرنے کا شرف حاصل کر چکا ہوں۔ ہم کشتی کرائے پر لے کر دریا کی سیر کو آتے تھے اور کبھی کبھی کشتی کھینے کا مقابلہ بھی کرتے تھے''۔

خالد نے جواب میں کہا:

''مجھے بھی مرکز میں خصوصی درس بعنوان ''جہاد کامیابی کا آخری راستہ'' حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔اللہ رحمت کرے مولانا سعود اظہر پر انہوں نے ہم مجاہدین میں بجلی سی بھر دی تھی۔ہم دُنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرانے کو تیار تھے اور اللہ کا فضل ہے کہ اب بھی تیار ہیں''۔

معاویہ نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا:

''یہاں کے دورۂ دَرُوس کے بعد میرا انتخاب جہاد کشمیر کے لئے ہو گیا تھا. میں خود بھی پنجاب میں شیعوں اور احمدیوں کو مار مار کر اُکتا چکا تھا اور کوئی مشکل اور بڑا کام کرنا چاہتا تھا''۔

خالد نے معاویہ کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا:

''تم نے بالکل صحیح کہا بھائی، کشمیر میں ہندوستانی قابض افواج کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کارروائی کرنے کا ایک الگ ہی مزہ تھا''۔

یہ لوگ دریا پار کر چکے تھے لیکن ابھی تک ایک ویران اور پتھریلے علاقے سے گذر رہے تھے۔ انہیں کہیں سے کھانسنے کی آواز آئی۔ انہوں نے فوراً ہی اپنی رائفلوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔ جب کھانسنے کی آواز دوبارہ آئی تو ان کو لگا کہ شاید لیمپ کی روشنی کی وجہ سے کوئی انکی توجہ

حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ خالد نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے لیمپ کو آواز کی سمت کر کے دیکھنے کی کوشش کی۔ کچھ جدوجہد کے بعد اُسے ایک انسانی وجود زمین پر رینگتا نظر آیا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا جس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی، اُس کا پیٹ کمر کو لگا ہوا تھا۔

خالد نے اُس کے قریب آ کر پوچھا:

''تم بستی سے دُور اس ویرانے میں کیا کر رہے ہو؟''۔

اجنبی نے کہا: ''ویرانے میں ہوں شاید اسی لئے ابھی تک زندہ ہوں''۔

معاویہ نے بیچ میں دخل دیتے ہوئے کہا:

''کیا مطلب ہے تمہارا اس بات سے؟''

اجنبی آدمی نے کہا:

شہر میں انسان انسان کو مار کر اس کا گوشت کھانے لگے تھے۔ میں ویرانے میں سکون کی موت مرنے کے لئے ایک غار میں آ کر رہنے لگا. کچھ عرصہ پہلے سفید قوم کے لوگوں نے یہاں خیمہ لگایا تھا۔ وہ لوگ ان علاقوں میں بیج ڈھونڈ کر جمع کرتے پھر رہے تھے۔ وہ مجھے کھانے کو دیتے تھے۔ جاتے وقت وہ ساری خوراک میرے غار میں بھر گئے تھے''۔

اس آدمی نے یہ بات غار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہی۔

خالد نے اُس سے سوال کیا:

''تو تم اس کھلے آسمان کے نیچے کیا کر رہے ہو؟

اجنبی نے جواب میں کہا:

''میرے سارے جسم میں جلد کا کینسر پھیل چکا ہے، اب تکلیف برداشت نہیں ہوتی کل جب سورج نکلے گا تو شاید میں گرمی سے جل کر مر جاؤں گا اور میری تکلیف ختم ہو جائے گی''۔

اتنی دیر میں معاویہ ایک برتن میں پانی لے کر آ گیا۔

اس نے اجنبی کو پانی دیتے ہوئے کہا:

''یہ لو بابا پانی پی لو اب ہمارے پاس تھوڑا ہی پانی بچا ہے۔ ہمیں اس پانی کے ساتھ افغانستان تک سفر کرنا ہے''۔

اجنبی نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

''مجھ مرتے ہوئے پر پانی ضائع نہ کرو۔ پانی کی کچھ بوتلیں اور کافی سامان اب بھی میرے غار میں ہے۔ گوروں نے نشیب میں بورنگ کر کے ہینڈ پمپ بھی لگایا تھا، بس مجھے زندگی سے آزاد کرا دو۔ مجھ سے درد برداشت نہیں ہوتا۔ دھوپ میں مرنے کی موت زیادہ اذیت ناک ہو گی، میں اپنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ اللہ تمہیں اس احسان کا بہت اجر دے گا''۔

یہ کہنے کے بعد اجنبی کا سانس اکھڑنے لگا۔

معاویہ نے خالد کو اشارہ کیا۔

خالد نے رائفل کی نال کو اس کے سر کے پیچھے رکھ کر فائر کر دیا۔

اُس آدمی کا جسم تڑپے بغیر ہی ٹھنڈا ہو گیا۔

بھاگ بھری نے دور سے آواز دی:

''خیر تو ہے؟''

خالد نے کہا:

''ہاں ماں! سب خیر ہے''۔

خالد نے معاویہ سے کہا:

''چلو! نشیب کی طرف چل کر پمپ تلاش کرتے ہیں اور اجنبی کے غار کو ڈھونڈتے ہیں''۔

پہلے یہ لوگ اجنبی کی بتائی ہوئی سمت کی طرف گئے۔ واقعی اس کے غار میں کھانے پینے کا کافی سامان

موجود تھا۔ ان کو خاصی بڑی مقدار میں چائے، کافی، صابن بسکٹ پانی اور ٹن میں پیک غذا مل گئی۔ خالد اس خزانے کو ملنے پر پھولے نہیں سما رہا تھا۔

خالد نے معاویہ سے کہا:

''تم فوراً دوڑ کر جاؤ اور اونٹنی پر سے خالی تھیلا لے کر آؤ. معاویہ پھرتی سے اونٹنی کی طرف گیا جہاں بھاگ بھری زمین پر بیٹھی ان سب کی منتظر تھی۔

معاویہ نے بھاگ بھری سے کہا:

''ماں کچھ کھانے پینے کا سامان مل گیا ہے، میں ابھی آتا ہوں''۔

یہ کہہ کر وہ خالی تھیلا لے کر کر غار کی طرف چلا گیا۔ یہ تھیلا بہت سے سامان سے بھر گیا تھا. انہوں نے تھیلے کو اٹھا کر غار کے دھانے پر رکھ دیا تا کہ اونٹنی کو وہاں پر لا کر جاتے وقت تھیلا اُس پر لاد دیں۔

اس کام سے فارغ ہو کر خالد نے کہا:

''چلو اب نشیب میں ہینڈ پمپ تلاش کرتے ہیں، شاید پانی مل جائے''۔

نشیب میں جا کر ان کو ہینڈ پمپ ڈھونڈنے میں دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ خالد دوڑتا ہوا پمپ کی طرف آیا اور اس نے بے تابی سے پمپ چلانا شروع کر دیا، اس کی یہ کوشش بے سود رہی۔ خالد نے کچھ دیر سوچا اور پھر معاویہ سے لیمپ کی روشنی پمپ پر مرکوز کرنے کو کہا۔ اس نے پمپ کو کھولنا شروع کر دیا۔ پمپ کو کھول اس نے پسٹن نکال کر خشک چمڑے کے وال کو نکال لیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے معاویہ کو کہا:

''تھیلے میں سے چائے کے پیکٹ اور پانی کی بوتلیں نکال لو اور چلو ماں کی طرف چلتے ہیں''۔

یہ دونوں تھیلے سے سامان نکال کر ماں کی طرف چل پڑے۔

ماں کے پاس آ کر خالد نے کہا:

''ماں! ہم کو سامان میں سے چائے بھی ملی ہے''۔

یہ خبر سن کر بھاگ بھری خوشی سے جھوم اٹھی. اسے چائے بہت ہی پسند تھی. کئی برسوں سے وہ چائے کو ترسی ہوئی تھی۔ معاویہ کے ڈیرے پر قہوہ بھی ان کو کئی برسوں بعد نصیب ہوا تھا۔

یہ خبر سن کر بھاگ بھری نے کہا:

''پتر! میں ابھی تازہ تازہ دودھ دھوتی ہوں۔تو ذرا اپنے سورج والے چولہے پر پانی گرم کرنے کو رکھ دے''۔

خالد نے چولہے پر پانی اُبالنے کے لئے رکھ دیا۔اس دوران اس نے پانی کی خالی بوتل کو آدھا کاٹ دیا۔جب بھاگ بھری اونٹنی کا تازہ دودھ لے کر آئی تو خالد نے پمپ کا خشک چرمی وال ملائم کرنے کے لئے دودھ میں بھگو دیا. بھاگ بھری نے پانی پر اُبال آنے پر چائے ڈالی تو ہر طرف چائے کی مہک آنے لگی۔اُبال آنے کے بعد اس نے چائے میں کھجور کا گڑ اور اونٹنی کا دودھ برتن میں ڈال دیا.تینوں نے سکون سے چائے پی، اِس دوران معاویہ ملنے والے سامان کی تفصیلات مزلے لے کر بتاتے رہا۔

اس نے بھاگ بھری سے کہا:

''ماں جی! بس دعا کرو کہ پانی نکل آئے۔ہمیں ہینڈ پمپ مل گیا ہے مگر وال سوکھا ہوا تھا شاید تمہاری دعا سے پانی نکل آئے''۔

بھاگ بھری نے یہ سن کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''ہے ایشور! اگر تیرا وجود ہے تو پانی ضرور ملے گا تو میری اونٹنی کو پیاس سے نہ مرنے دینا''۔

(۱۸)

خالد اور معاویہ نے چائے پینے کے بعد پانی کی بوتلیں اپنے ساتھ لیں اور پمپ کے قریب پہنچ کر خالد نے دودھ میں بھیگے ہوئے وال کو نکالا۔ اب چمڑے کا بنا ہوا یہ وال دودھ میں بھیگ کر خاصا نرم ہو چکا تھا۔ خالد نے وال کو پسٹن پر چڑھانے کے بعد پمپ میں کچھ پانی ڈالا اور اس کے نٹ بولٹ کسنے کے بعد معاویہ کو کہا:

''اب اللہ کا نام لے کر اِسے آہستہ آہستہ چلاؤ''۔

معاویہ نے پمپ کو چلانا شروع کیا۔ پمپ نے آہستہ آہستہ ہوا کا دباؤ پیدا کرنا شروع کر دیا۔ اب معاویہ کو پمپ کو چلانے کے لئے کچھ طاقت کا استعمال کرنا پڑ رہا تھا۔ کچھ جدو جہد کے بعد مٹیالے رنگ کا پانی باہر آنے لگا۔ معاویہ نے پانی کا ذائقہ چکھا، ذائقہ بہت اچھا تو نہیں لیکن پانی پینے کے قابل تھا۔

خالد نے معاویہ سے کہا:

''میرے بھائی پمپ کو چلاتے رہ۔۔ میں ماں کو اور اونٹنی کو لے کر آتا ہوں۔۔۔ اس پانی پر اونٹنی کا حق سب سے پہلے ہے''۔

اس نے دور سے ہی چلانا شروع کر دیا:

''ماں! پانی مل گیا ہے۔۔۔ پانی مل گیا ہے''۔

بھاگ بھری یہ سن کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ خالد نے اونٹنی کی مہار پکڑ کر اسے کھڑا کیا اور ماں کو کہا:

''چل ماں! ہم سب نہا بھی سکتے ہیں۔۔۔ کپڑے بھی دھو سکتے ہیں، مجھے غار میں ملنے والے سامان میں سے صابن بھی مِلا ہے۔ تو اپنی اونٹنی کو بھی نہلانا۔ ماں مجھے تو یاد ہی نہیں کہ میں آخری بار کب نہایا تھا''۔

خالد اونٹنی کی مہار پکڑے اُسے نشیب کی طرف لے کر چل دیا۔ راستے میں بھاگ بھری نے کہا:

''پتر! صرف آدھی مشک پانی بچا تھا، میں تو سمجھی تھی کہ اب ہم سب کو بھی پیاس سے مرنا ہوگا، بھگوان بچائے بھوک اور پیاس سے مرنا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہوگا۔

خالد نے جواب میں کہا:

''ماں! جب تک زندگی اس پروردگار نے لکھی ہے زندہ رہنا ہے اور پھر قاری صاحب کی بشارت جھوٹی نہیں ہوسکتی۔ مجھے لشکرِ خراسان کی رہبری کرنا ہے. غزوَہ ہند میں شرکت کرنا ہے۔ ابھی میرے مرنے کا وقت نہیں آیا ہے''۔

بھاگ بھری کے کان اس کی یہ باتیں سن کر پک چکے تھے۔ وہ اس کی بات کو ان سُنی کرتی ہوئی اونٹنی کے پیچھے چل دی۔

(۱۹)

یہ تینوں سورج کے قہر سے بچنے کے لئے دن بھر قبر نما گڑھوں میں پناہ لیتے ہوئے اور رات کو سفر کرتے کرتے ایک کھنڈر نما شہر سے گذر رہے تھے. اس شہر خموشاں کو معاویہ نے فوراً ہی پہچان لیا۔

اس نے شہر پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے خالد سے کہا:

''یہ شیخوپورہ ہے. مجھے اس شہر کے ایک بزرگ نے بتایا تھا کہ یہ شہر مغل بادشاہ نے شہزادہ جہانگیر کے نام پر بسایا تھا۔ شہزادے کا باپ اسے پیار سے شیخو پکارتا تھا۔ اس لئے اس شہر کا نام شیخوپورہ پڑ گیا تھا۔ اس شہر سے میری حسین یادیں وابستہ ہیں''۔

خالد نے حیرانی سے معاویہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''حسین یادیں! کیا کسی کو اس شہر میں پسند کر لیا تھا؟

معاویہ نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا: ''ہم مجاہدین کو عورت کے متعلق سوچنے کا وقت ہی کب ملتا تھا. میری حسین یادوں کا کسی حسینہ سے کوئی تعلق نہیں''۔

معاویہ نے بات کو مزید کریدتے ہوئے دریافت کیا:

''تو پھر کون سی حسین یادیں ہمیں بھی تو پتہ چلے''۔

معاویہ نے خشک، چٹخی ہوئی زمین پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا:

''میں اس شہر کے نوجوان دینی طلباء کو جہاد کشمیر میں بھرتی کرنے کے لئے اکثر یہاں آتا تھا۔ یہاں کی زمین اتنی زرخیز تھی کہ سبزے کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ایک بار میں یہاں آیا تو باسمتی چاول کی فصل کٹنے میں کچھ وقت تھا۔ میں اپنے مستقبل کے نوجوان مجاہدین کو روز صبح، فجر کی نماز کے بعد کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر دوڑاتا تھا۔ باسمتی چاول کی جوان ہوتی ہوئی فصل سے چاولوں کی خوشبو ہر طرف ایسے پھیلی ہوئی ہوتی تھی کہ جیسے ہم کسی بارات میں آئے ہوئے ہوں اور پلاؤ کی دیگیں چڑھی ہوئی ہوں''۔

خالد نے نہایت افسردہ لہجے میں کہا:

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جنگ کا انجام ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ جنگ موسم اور ماحول پر بھی اثر انداز ہوسکتی ہے''۔

معاویہ نے جواب میں کہا:

''اللہ عذاب نازل کرے سفید کافروں پر جنہوں نے یہ ایٹمی ہتھیار ایجاد کئے''۔

خالد نے جواب میں کہا:

''کمانڈر صاحب! ایسے نہ کہیں، ہمارے سینکڑوں مسلمان سائنسدانوں نے بہت محنت سے ایٹم بم ایجاد کیا تھا''۔

معاویہ نے خالد کی اصلاح کرتے ہوئے کہا:

''ہم نے ایٹم بم ایجاد نہیں کیا تھا، چوری کیا تھا''۔

معاویہ خالد کی بات سن کر خاموش ہوگیا۔

خالد کو خاموش دیکھ کر معاویہ سوچنے لگا:

''اگر مجھے ایٹم بم کی تباہی کا اندازہ ہوتا تو میں قاری صاحب کو مشورہ دیتا کہ وہ ہندوستان کو جنگ پر نہ اُکسائیں''۔

لیکن ...لیکن، وہ غزوۂ ہند! وہ حدیث میں ہند پر غلبہ کی بشارت! نہیں، نہیں۔

حدیث کبھی جھوٹی نہیں ہوسکتی۔ یقیناً، یہاں پر مسلمان حکومت کریں گے. اس خطے کے چپے چپے پر مسجدیں ہوں گی تب بُت پرستی کا نام ونشان تک ڈھونڈنے سے نہ ملے گا''۔

معاویہ نے خالد کو سوچوں میں گم دیکھ کر کہا:

''سوچوں سے نکل آؤ، دور سے کوئی آواز آرہی ہے، دیکھو آواز مسلسل آرہی ہے، میرے کان نہیں بج رہے ہیں''۔

معاویہ نے پیش قدمی روک دی اور ساکت ہوکر سننے کی کوشش کرنے لگا۔

کچھ دیر آواز کی طرف کان لگا کر سننے کے بعد اُس نے کہا:

''رائفل لوڈ کرلو، عجیب سی آواز آرہی ہے، جیسے کہ کوئی لکڑی کے ایسے دروازے کو ہلا رہا ہو جس کی چول خشک ہوچکی ہو''۔

خالد نے سولر لیمپ کا رُخ آواز کی جانب کرلیا۔ کچھ ہی دیر میں اسے کچھ ہیولے بڑھتے ہوئے نظر آنے لگے۔ خالد نے اِن ہیولوں پر نگاہ ٹکاتے ہوئے گرجدار آواز میں کہا:

''کون ہواوئے... پہچان کراؤ''۔

ہیولوں کی جانب سے جواب ملا:

''سجن ہیں... سجن... دشمن نہیں... مسافر ہیں''۔

خالد نے ہیولوں کا جواب سن کر معاویہ سے کہا:

''یہ چال بھی ہوسکتی ہے... تم فائر کرنے کے لئے تیار رہنا''۔

اب یہ ہیولے اور واضح نظر آنے لگے تھے۔ کچھ آدمی ایک گاڑی کو کھینچ رہے تھے۔ جس کے چوبی پہیوں سے چوں چوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ ان لوگوں کے قریب آنے پر واضح ہوا کہ یہ سکھوں کا ایک گروہ تھا۔ اِس گروہ میں جوان لوگ پیدل چل رہے تھے جب کہ دو بزرگ مرد اور دو عورتیں گاڑی پر سوار تھیں، ان لوگوں کے ساتھ عورتوں کو دیکھ کر خالد کو یقین ہوگیا تھا کہ یہ لوگ ڈاکو نہیں تھے۔ خالد اور معاویہ نے اپنی رائفلیں نیچے کرلیں۔

ایک پیلے رنگ کی پگڑی پہنے ہوئے آدمی نے آگے بڑھ کر خالد کو پرتپاک انداز میں گلے لگا کر ست سری اکال کہا۔

خالد نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سوچنے لگا کہ کسی کافر کو سلام کرنا شرعاً ممنوع ہے، اس لئے خاموش رہنا ہی بہتر ہے''۔

ایک ایک کر کے سب لوگ خالد اور معاویہ سے گلے ملے اور انہوں نے دور سے دونوں ہاتھ جوڑ کر بھاگ بھری کی تعظیم کی۔ بھاگ بھری اس طرح سے اپنی تعظیم ہوتے دیکھ کر سکتے میں آگئی تھی۔ اسے وہ دن یاد آگئے تھے جب وڈیرہ اور اس کے کارندے اسے کسی جانور سے بھی بدتر سمجھتے تھے۔ جو آدمی خالد سے سب سے پہلے گلے ملا تھا اس نے خالد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''میرا نام کرنل شمشیر سنگھ ہے اور گاڑی پر بیٹھے ہوئے بزرگ میرے دادا صوبیدار کھڑک سنگھ ہیں ان کے برابر بیٹھی ہوئی خاتون میری ماں اور میری پھوپھی ہیں۔ باقی سارے ہمارے گاؤں اور آس پاس کے بچ جانے والے افراد ہیں''۔

یہ سب افراد خالد سے اتنے تپاک سے ملے کہ خالد نہ چاہتے ہوئے بھی آگے بڑھ کر گاڑی پر سوار بزرگ سے ملنے پر مجبور ہو گیا۔اس نے آگے بڑھ کر پر صوبیدار صاحب سے ہاتھ ملایا۔انہوں نے بڑی گرمجوشی سے خالد کے ہاتھ کو دباتے ہوئے ست سری اکال کہا، اس بڑھاپے میں بھی صوبیدار صاحب کے ہاتھوں میں جوانوں جیسی گرمجوشی تھی...

مصافحہ کرنے کے بعد صوبیدار صاحب نے کہا:

''پتر! ہم سب کو ننکانہ صاحب جانا ہے..اب سب لوگ ایک ایک کر کے مر ہی رہے ہیں تو ہم سب نے سوچا کہ کیوں نہ ایک اللہ والے کی سمادھی پر ماتھا ٹیک کر دم توڑا جائے۔ہم کو ننکانہ صاحب کا رستہ معلوم نہیں...سارے رستے میں کوئی انسان نہ مل سکا کہ ہماری مدد کر دیتا۔۔پتر! تم تو جانتے ہو گے کہ ننکانہ صاحب کس طرف کو ہے؟''

معاویہ نے بیچ میں دخل اندازی کرتے ہوئے کہا:

''بزرگو! آپ لوگ ننکانہ صاحب سے زیادہ دور نہیں، لیکن اب صبح ہونے والی ہے، گرمی میں سفر ممکن نہیں ہوگا''۔

بھاگ بھری اونٹنی پر بیٹھے بیٹھے اکتا چکی تھی۔۔یوں بھی اس کا دل گاڑی پر سوار عورتوں سے ملنے کو بے چین تھا۔

بھاگ بھری نے معاویہ سے کہا:

''پتر! ذرا اونٹنی کو بٹھا دے''۔

معاویہ نے اونٹنی کو بٹھا کر ماں کو اترنے میں مدد دی۔ بھاگ بھری اونٹنی سے اُتر کر سب کو ہاتھ جوڑتے ہوئے گاڑی پر سوار عورتوں سے ملنے کے لیے چلی۔

خالد نے حیرانی سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''ہمیں، کوئی ایسا بڑا گھر ڈھونڈنا چاہیئے کہ جہاں ہم سب دن آرام سے گزار سکیں''۔

معاویہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

''تم مجھ کو لیمپ دے دو۔ میں شہر میں کوئی مناسب جگہ ڈھونڈ کر آتا ہوں''۔

خالد نے لیمپ معاویہ کے حوالے کر دیا۔وہ لیمپ لے کر شہر میں مناسب پناہ کی تلاش میں نکل گیا۔

(۲۰)

معاویہ کو شیخوپورہ کی ایک بڑی سڑک پر بنی ہوئی پرانی حویلی دن گزارنے کے لئے پسند آ گئی تھی۔ اونچائی پر واقع ہونے کی وجہ سے یہ حویلی مکمل تباہی سے بچ گئی تھی۔

معاویہ نے حویلی کا معائنہ کرنے کے بعد واپس آ کر خالد سے کہا:

''کمانڈر صاحب!، ایک اچھی جگہ دن بسری کے لئے مل گئی ہے، اب دیر نہ کریں سورج نکل آیا تو ہم سب کو دو قدم چلنا محال ہو جائے گا''۔

خالد نے معاویہ کی بات پر رضامندی سے سر ہلاتے ہوئے آواز لگائی:

''سب لوگ چلنے کو تیار ہو جائیں، پناہ گاہ مل گئی ہے''۔

یہ کہہ کر خالد نے اونٹنی کی مہار ہلا کر اسے کھڑا کیا اور معاویہ کے پیچھے چلنے لگا۔ سکھوں کا مختصر سا قافلہ بھی اُس کے پیچھے چل پڑا۔ صوبیدار صاحب نے اصرار کر کے بھاگ بھری کو اپنی بہن کے ساتھ گاڑی پر بٹھا لیا تھا۔

یہ تمام افراد سورج نکلنے سے پہلے ہی حویلی میں آ گئے۔ سب نے مل کر حویلی کے بڑے کمرے کو صاف کر کے اُسے بیٹھنے کے قابل بنا دیا۔ سکھوں نے دیوار کے ساتھ فرش پر ایک سفید چادر بچھا کر صوبیدار صاحب کو بہت احترام سے وہاں بٹھا دیا۔ اِن کے بیٹھنے کے بعد باقی افراد بھی بزرگ صوبیدار کے ارد گرد بیٹھ گئے۔

سب افراد کے بیٹھ جانے کے بعد، صوبیدار صاحب نے کھنکھارتے ہوئے کہا:

''سجنو اور مترو! اگر اچھے وقتوں میں ملے ہوتے تو میں تمہاری دل و جان سے اس طرح خاطر و مدارت کرتا کہ آپ سب زندگی بھر یاد رکھتے، مگر اب کیا کریں، حالات بُرے ہیں۔ جسم و جان کے بیچ رشتہ قائم رکھنا ناممکن ہو گیا ہے۔ زندگی کے شاید کچھ ہی روز بچے ہیں۔ پھر بھی ہمارے پاس تھوڑا سا گُڑ بچا ہے۔ آپ لوگ

شکریہ کے طور پر اِس چھوٹے سے تحفہ کو قبول کرلیں''۔

یہ کہہ کر صوبیدار نے کرنل شمشیر سنگھ کو اشارہ کیا تو اُس نے ایک چھوٹی سی پوٹلی بھاگ بھری کے قدموں کو چھو کر اس کے پیروں کے سامنے رکھ دی۔

بھاگ بھری نے صوبیدار کو جواب میں کہا:

''ہمارے حالات بھی آپ لوگوں سے مختلف نہیں۔ کس کس طرح موت کے مُنہ سے بچتے بچتے یہاں تک آپہنچے ہیں۔ ہمیں کہیں سے چائے مل گئی تھی! ہمارے پاس سورج سے جلنے والا چولہا ہے اور ہماری اونٹنی کے تھن ابھی خشک نہیں ہوئے ہیں۔ میں آپ سب کے لئے اپنے ہاتھ سے گُڑ کی چائے بناؤں گی۔ ہم سب مل کر گرم گرم چائے پیئیں گے''۔

یہ بات سن کر کئی سکھ جوانوں نے بے اختیار نعرہ لگایا:

''خیر ہووے ماں جی کی خیر ہو''۔

ان کے نعرے سن کر کھڑک سنگھ نے کہا:

''دیکھو! بچے تو کیا! مجھ جیسا بوڑھا بھی چائے کا نام سن کر خوش ہو گیا ہے۔ ہم لوگوں نے برسوں سے چائے کی خوشبو تک نہیں سُونگھی''۔

بھاگ بھری نے صوبیدار کھڑک سنگھ کی بات سن کر معاویہ سے کہا:

''معاویہ پُتر! یہ کہہ اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا:

''پرانا نام ہی زبان پر چڑھا ہوا ہے. پنوں پتر! تو حویلی میں ذرا تلاشی لے شاید برتن بھانڈے مل جائیں۔ ہمارا برتن کافی چھوٹا ہے''

بھاگ بھری کی بات سن کر خالد اور معاویہ اٹھ کر حویلی کی تلاشی لینے کو چلے گئے۔

بھاگ بھری نے صوبیدار کھڑک سنگھ سے کہا:

''یہ جو معاویہ ہے ناں بڑا ہی محبت کرنے والا ہے. بس، میرے بیٹے جیسا ہی ہے۔ بھگوان ہی مولویوں کو سمجھے جنہوں نے اس کا نام بدل ڈالا تھا۔ اس کی ماں نے اس کا پنوں رکھا تھا''۔

'صوبیدار نے بھاگ بھری کی بات سن کر ہاتھوں کو دعائیہ انداز میں اٹھاتے ہوئے کہا:

''اوپر والے پُتوں کو یوں اکیلے نہ بھٹکنے دینا اسے اُس کی ُسکی سے ضرور ملانا''۔

صوبیدار کی دعا سن کر بھاگ بھری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

بھاگ بھری کو یوں روتے دیکھ کر صوبیدار نے کہا:

''معاف کرنا بیٹی شاید میں نے تمہارا دل دکھا دیا''

بھاگ بھری نے کہا:

''ناں ناں! میں تو اپنے نصیب کو رو رہی ہوں۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے ساون کا گھر بسایا تھا لیکن وہ بس نہ سکا. میرا بیٹا اپنا بسا بسایا گھر اُجاڑ کر دنیا پر اِسلام کا جھنڈا لہرانے کو نکل پڑا ہے''۔

اس سے پہلے کہ بھاگ بھری کی بات پر صوبیدار کوئی تبصرہ کرتا، معاویہ اپنے کندھے پر دو گدّے لادے ہوئے آ گیا۔

اس نے گدّے نیچے رکھ کر سلیقے سے بچھاتے ہوئے کہا:

''بزرگو! آپ آرام سے اس گدّے پر بیٹھیں ہم لوگوں کو کچھ برتن بھانڈے بھی مل گئے ہیں، کچھ ہی دیر میں ماں جی اپنے ہاتھ سے چائے بنائیں گی''۔

یہ کہہ کر معاویہ دوبارہ حویلی کے اوپر کے حصّے کی طرف چلدیا، وہاں پر خالد اس کا منتظر تھا۔

خالد نے معاویہ کو آتے ہوئے دیکھ کر آہستہ سے کہا:

''یار! ماں کو دیکھو ذرا دشمنوں کی خاطر تواضع میں لگا دیا ہے''۔

معاویہ خالد کی بات سن کر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا، پھر اُس نے ایک ٹھنڈی آہ بھرنے کے بعد کہا:

''اب کیسے دشمن اور کیسی دشمنیاں؟ ہم سب مصیبت کے مارے، بھوک و پیاس سے لڑ رہے ہیں، یہ بھوک ہی ہم سب کی مشترکہ دشمن ہے''۔

خالد کو معاویہ کا جواب پسند نہ آیا، اس نے قدرے تلخی سے کہا:

''شاید تجھے معلوم نہیں، مجھے قاری صاحب نے بتایا تھا کہ ان سکھوں نے سارے پنجاب میں مسلمانوں کو چن چن کر ذبح کیا تھا اور ہماری نوجوان لڑکیوں کو اپنے گھروں میں رکھ لیا تھا''۔

معاویہ نے خالد کو سمجھاتے ہوئے کہا:

’’کمانڈر صاحب! آپ اس بات کو اپنے دل میں نہ رکھیں بلکہ ان سکھوں کے بزرگ کو کہہ دیں کہ آپ ان لوگوں کے بارے میں کیا سوچ رکھتے ہیں، اس طرح سے آپ کے دل پر بوجھ نہیں رہے گا‘‘۔

خالد نے معاویہ کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا:

’’ہاں! تیری یہ بات صحیح ہے، جو میرے دل میں ہے میں ضرور اُن کے منہ پر کہوں گا‘‘۔

خوش قسمتی سے خالد اور معاویہ کو حویلی کی بالائی منزل سے روزمرہ کی ضرورت کا سامان مل گیا تھا۔لگتا تھا کہ لوٹ مار کرنے والوں کو حویلی کے بالائی حصے کا خیال نہ آیا تھا۔ وہ دونوں ایک بڑا دھاتی پتیلا اور چینی کے پیالے کر نیچے آ گئے۔ بھاگ بھری پہلے ہی اونٹنی کا دودھ دوھنے کو جا چکی تھی۔

خالد نے غار میں سے ملنے والے سامان سے چائے کی پتی اور بسکٹوں کا پیکٹ نکال کر معاویہ کو تھماتے ہوئے کہا:

’’تم مشک سے پانی نکال کر پانی ابلنے کو رکھ دو اور یہ چائے کی پتی ماں کو دے دینا، وہ چائے خود ہی بنائے گی‘‘۔

معاویہ نے چائے کی پتی برآمدے میں چولہے کے پاس رکھ کر پتیلے میں پانی اُبلنے کے لئے رکھ دیا۔ کچھ ہی دیر میں بھاگ بھری ایک برتن ہاتھ میں لئے آ گئی جو تازہ دودھ کے سفید جھاگ سے چھلک رہا تھا۔ اس نے اُبلتے ہوئے پانی میں پتی ڈالی تو چائے کی مہک سے سارا برآمدہ معطر ہو گیا۔

جیسے ہی چائے کی خوشبو اندر کمرے میں پہنچی تو اس خوشبو کا تعاقب کرتے ہوئے کئی سکھ جوان برآمدے میں آ گئے۔

بھاگ بھری نے ان کو دیکھ کر کہا:

’’جاؤ! خالد سے کہو پیالے اِدھر ہی لے آئے، چائے تیار ہے‘‘۔

یہ جوان بچوں کی طرح سے خوشی خوشی بھاگتے ہوئے گئے اور آناً فاناً پیالے لے کر آ گئے۔ اس دوران خالد بھی بھاگ بھری کے پاس آ گیا۔ بھاگ بھری نے اسے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا:

’’جا! پتر اِن سب کے لئے بسکٹ نکال کر رکھ۔ یہ بھگوان کے خاص بندے ہیں جو کرم کی آشا میں ایک اوتار کی سمادھی پر ماتھا ٹیکنے جا رہے ہیں‘‘۔

خالد ماں کی بات سن کر منہ بناتا ہوا اندر چلا گیا۔

سب کے آگے گرم گرم چائے رکھی ہوئی تھی، بھوک کی شدت کے باوجود سکھ جوان بزرگوار صوبیدار کی اجازت کے منتظر تھے۔ صوبیدار کھڑک سنگھ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر بھاگ بھری کو دیکھا اور ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر اس تعظیم میں گردن کو جھکا کر چائے کا پہلا گھونٹ بھر کر کہا:

''سدا خوش رہنا پتری!''۔

یہ سب دیکھ کر بھاگ بھری کی آنکھوں میں آنسو اُمڈے چلے آرہے تھے، اس اُمڈتے ہوئے سیلاب کو روکنا اس کے بس میں نہ تھا۔

اُسے یوں روتا دیکھ کر صوبیدار کھڑک سنگھ نے کہا:

''پتری! یہ تو خوش ہونے کا سمے ہے کہ اس جان لیوا قحط میں ہم سب کو خوشی کا یہ لمحہ میسّر ہوا ہے''۔

بھاگ بھری نے آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے جواب میں کہا:

''بابا جی! یہ خوشی کے ہی آنسو ہیں آپ نے مجھ اُچھوت عورت کو اتنے دل سے عزت دی ہے۔ ایک ایسی عورت کو کہ جس کا ہاتھ کسی کو لگ جائے تو وہ نہانے چلا جاتا تھا۔ جو گاؤں کے سب باسیوں کے لئے سر سے پیر تک پلید تھی''۔

صوبیدار کھڑک سنگھ نے اپنی سفید اور لمبی داڑھی کو مُٹھی میں لیتے ہوئے جواب میں کہا:

''بابا گرونانک جی نے فرمایا:

''میں ہندو ہوں نہ مسلمان ہوں۔ میں پہلے انسان ہوں''۔

یہ کہنے کے بعد صوبیدار صاحب نے فضا میں دیکھتے ہوئے کہا:

''پتری ہم سب انسان برابر ہیں، ہم میں نہ کوئی چھوٹا ہے نہ کوئی بڑا۔ اگر کوئی بڑا ہے تو اپنے اچھے کرم کی وجہ سے، نہ دولت سے۔۔۔۔ نہ دھن سے۔۔۔ نہ ذات پات سے''۔

خالد صوبیدار صاحب کی باتیں بہت غور سے سن رہا تھا۔ وہ اُن سے اپنے دل کی بات کر کے اپنے دل پر سے بوجھ اُتارنا چاہتا تھا۔

آخر کار اس نے گفتگو کے بیچ میں داخل انداز ہوتے ہوئے کہا:

''بزرگو! برا نہ ماننا۔ آپ کتنی ہی اچھی اور میٹھی میٹھی باتیں کرو، لیکن آپ لوگ ہمارے لئے کافر بھی ہو اور دشمن بھی. کافر اس لئے کہ آپ لوگ مسلمان نہیں ہو۔ اور دشمن اس لئے کہ تقسیم کے وقت آپ لوگوں نے لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا تھا''۔

کھڑک سنگھ خالد کی بات بہت تحمل سے سننے کے بعد معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ یوں گویا ہوا:

''پتر! بابا فرید نے کہا تھا:

پنج رکن اسلام دے تے چھیواں فریدا ٹُک

جے نہ لبھے چھیواں، تے پنج ای جاندے مک۔

مطلب بابا جی کا یہ تھا کہ اگر پیٹ میں روٹی نہ ہو تو کوئی دین دھرم نہیں رہتا، پتر! اس ظالم بھوک نے

سارے ہندوستان سے دین و دھرم

کا نشان مٹا دیا ہے نہ کوئی مسجد آباد ہے نہ کوئی مندر اور نہ ہی لوگ کلیسا میں جانے کو تیار ہیں، اس وقت

سب سے بڑا خدا روٹی ہے۔ پتر! روٹی''۔

خالد نے صوبیدار صاحب کی بات سن کر دل میں سوچا:

''قاری صاحب نے بری امام کے مزار پر بم دھماکے کا حملہ ناکام ہونے پر کہا تھا کہ اب پاک پٹن والے بابا فرید مشرک کے مزار کو ایسے اڑانا کہ اس کا ملبہ بھی نہ بچ پائے۔ لیکن لگتا تو نہیں کہ بابا فرید مشرک تھا! اگر وہ مشرک ہوتا تو دین کے پانچ ارکان کی بات کیوں کرتا''۔

صوبیدار کھڑک سنگھ نے خالد کو سوچ میں گم دیکھ کر کہا:

''پتر! جہاں تک ہمارے کفر کی بات ہے تو تم کو اختیار ہے کہ تم ہم کو جو چاہے سمجھو، لیکن بات یہ ہے کہ جب بابا جی نانک صاحب نے دیکھا کر ہندوستان میں انسانوں کے بیچ میں بٹوارہ ہے، ذات پات کی تقسیم ہے، اونچ نیچ کے مسائل ہیں۔ لوگ علامتی خداؤں کی پوجا میں مگن ہو کر اصل خدا کو بھول گئے ہیں تو گرو جی نے کہا:

''نہ کوئی ہندو نہ کوئی مسلم، اللہ واحد ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں''۔

اپنی بات کو مزید بڑھاتے ہوئے صوبیدار صاحب نے کہا:

''پُتر! اپنے کلمے میں مسلمان بھی یہی بات کہتے ہیں؟''۔

خالد اور معاویہ صوبیدار کھڑک سنگھ کے سوال کے جواب میں اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا. ان دونوں کو مطمئن دیکھ کر صوبیدار صاحب نے مزید کہا:

''گرو جی کعبہ کی زیارت کو بھی گئے تھے اور انہوں نے بغداد میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر مراقبہ بھی کیا تھا. بغداد کے لوگ آج بھی اس مراقبے والی جگہ کو ''نبی ہندی'' کی جگہ کہتے ہیں۔ گرو نانک نے کبھی جناب محمد کو بُرا نہیں سمجھا بلکہ تمام پیغمبروں کی طرح اُن کا بھی احترام کیا۔ ہماری کتابوں میں یہ واقعہ بھی درج ہے کہ جب گرو نانک کعبہ گئے تھے تو سوتے ہوئے ان کے پاؤں جس جانب مڑ جاتے تھے وہیں کعبہ بھی اپنا رُخ کر لیتا تھا... بھلا جس ہستی کو کعبہ بھی پسند کرے وہ ہستی کافر کیسے ہو سکتی ہے!''۔

خالد نے کھڑک سنگھ کی بات سننے کے بعد کہا:

''میرے لئے آپ کی کہی ہوئی باتیں نئی ہیں ہم کو تو صرف یہ ہی بتایا گیا تھا کہ سکھ ہر وقت ایک خنجر اپنے نیفے میں رکھتے ہیں، تاکہ جیسے موقع ملے مسلمان کی گردن کاٹ ڈالیں''۔

کھڑک سنگھ نے یہ بات سن کر اپنی سفید داڑھی کو مٹھی میں لے کر کہا:

''یہ ہماری کرپان، پگڑی کنگھا اور کچھا پاس رکھنا ہمارے گرو جی کی نصیحت تھی۔ شاید یہ بات تم نے تاریخ کے مضمون میں نہیں پڑھی!''۔ خالد نے جواب میں کہا:

''مدرسے میں تاریخ کی کتابیں پڑھنے پر پابندی تھی. ہمارے استادوں کا کہنا تھا کہ تاریخ کا اور ریاضی کا علم جھوٹا اور شیطانی ہے''۔

کھڑک سنگھ نے خالد کو جواب دیتے ہوئے کہا:

''پُتر! پنڈت اور مُلا کو ہر وہ علم جو دماغ کو روشن کر دے شیطانی ہی لگتا ہے''۔

یہ کہنے کے بعد اس نے چائے کا آخری گھونٹ سڑک دار آواز سے بھرنے کے بعد کہا:

''رہی تقسیم کی فسادات کی بات تو بڑے افسوس کی بات ہے کہ دو قوموں نے اپنے ہی خون اور اپنی ہی ذات کے لوگوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا تھا۔ سب سے زیادہ خون خرابہ پنجاب اور بنگال میں ہوا تھا۔ میں تقسیم کے وقت جوان تھا اور برٹش فوج میں ملازم تھا۔ ہمارے گاؤں کا نام کہوٹہ تھا جو راولپنڈی کے قریب

تھا۔ جب راولپنڈی کے لوگوں کو خبر آئی کہ امرتسر کے اکالیوں نے مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کردیا ہے تو راولپنڈی سے مسلمانوں کے جتھوں نے کہوٹہ پر حملے کرنا شروع کیے۔ صرف ایک ہی دن میں راولپنڈی کی سڑکوں پر ہزاروں سکھوں کو قتل کیا گیا تھا۔ نہ جانے کیسی وحشت تھی کہ دادا پر دادا کے زمانے سے ساتھ رہنے والوں نے ایک دوسرے کی گردنیں اتارنا شروع کردیں، ایک دوسرے کے گھروں کو آگ لگانا شروع کردیا تھا۔ میں آج بھی اس وقت کو یاد کرتا ہوں تو میرا دل کانپ اٹھتا ہے۔ میرا باپ اسکول ماسٹر تھا، اس نے ہزاروں مسلمان شاگردوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا تھا۔ بس، پُتر! نہ پُوچھ دونوں طرف کے لوگوں پر شیطان سوار تھا۔ پنجابی پنجابی کا خون بہار ہاتھا اور بنگالی بنگالی کا اور یہ سب اوپر والے کے نام پر ہورہا تھا۔

پُتر! تو یہ سوچ کہ اگر لاہور میں

مسلمان عیسائیوں کی بستی کو آگ لگادیں تو اس کے جواب میں گوا کے عیسائیوں کو مسلمانوں کی بستی کو آگ لگانا چاہیے؟''۔

خالد نے مختصر جواب میں کہا:

''نہیں، یہ انصاف نہیں ہے''.

کھڑک سنگھ کے پوتے کرنل شمشیر سنگھ نے اپنے دادا کے پیالے میں چائے ڈالتے ہوئے کہا:

''دادا! تم اور چائے پی لو۔ دیکھو یہ بہن بھاگ بھری کے ہاتھ میں کتنا سواد ہے!''۔

دادا کو چائے دینے کے بعد کرنل شمشیر سنگھ نے کہا:

''فوج میں کمیشن ملنے کے بعد میری پہلی تعیناتی بمبئی میں ہوئی تھی۔ وہاں پر فلموں کے لئے گیت لکھنے والا ایک شاعر میرا دوست بن گیا تھا. وہ اسی شیخوپورہ کا رہنے والا تھا، وہ گلشن باورہ کے نام سے مشہور تھا، اس کے ماں باپ کو بلوائیوں نے اسی شیخوپورہ کے سڑک پر اس کے سامنے ہی مار ڈالا تھا۔ اُس کا لکھا ہوا ایک گیت ابھی تک میرے کانوں میں گونجتا ہے''۔

یہ کہنے کے بعد کرنل شمشیر سنگھ نے اپنی خوبصورت آواز میں گلشن باورہ کا لکھا ہوا گیت گنگنانا شروع کردیا:

''قسمیں وعدے نبھائیں گے ہم۔

مل کے رہیں گے جنم جنم"۔

کرنل صاحب نے گانا اتنی درد بھری آواز میں گنگنایا کہ بھاگ بھری اپنی آنسوؤں کو روک نہ سکی۔ گیت گانے کے بعد کرنل صاحب نے خالد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"اب پرانی باتوں کو کیا دہرانا. چھوڑو گزرے ہوئے وقت کو، تم بتاؤ تم لوگوں کا رُخ کہاں کو ہے؟ ہم لوگ تو اپنی باقی زندگی گرو جی کے در پر پڑے گزاریں گے"۔

خالد کے دماغ کو صوبیدار کھڑک سنگھ کی باتوں نے کھڑ کا کر رکھ دیا تھا۔ وہ ابھی تک اس کی باتوں میں الجھا ہوا تھا۔

کرنل صاحب کے سوال کرنے پر وہ چونک اٹھا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا:

"ہم لوگ افغانستان جانا چاہتے ہیں، وہاں اب تک خلافت اسلامیہ کے سیاہ جھنڈے لہرائے جا چکے ہوں گے۔

وہیں سے ہم دنیا پر اسلام نافذ کرنے کی ابتدا کریں گے"۔

کرنل صاب نے خالد کا جواب سن کر سنجیدہ لہجے میں پوچھا:

"میرے بھائی! تم کو دنیا پر اسلام نافذ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ شاید تمہیں نہیں معلوم کہ پاکستان وہندوستان پر کیا قیامت گزر چکی ہے"۔

خالد نے جواب دینے کے لئے جوشیلے انداز میں منہ کھولا، لیکن اسے زوردار کھانسی کا دورہ پڑ گیا. اس کے منہ سے اڑنے والے خون کے چھینٹوں نے اس کی ہتھیلی کو تر کر دیا۔ اس نے گھبرا کر معاویہ کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا. معاویہ نے خالد کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا تو اسے خالد کے نتھنوں سے خون بہتا ہوا نظر آیا۔ اس نے قریب پڑی ہوئی چادر سے خالد کے نتھنوں سے بہتے ہوئے خون کو صاف کیا۔ بھاگ بھری کا چہرہ یہ منظر دیکھ کر زرد ہو گیا۔

خالد نے ماں کو پریشان دیکھ کر کہا:

"تو ایک مجاہد کی ماں ہے! اور خون کے ان چند قطروں کو دیکھ کر ڈر گئی؟"

بھاگ بھری نے جواب میں کہا:

''مجھے یہ اس منحوس بیماری کا خون لگتا ہے جو میرے کتے کو لگ گئی تھی۔اس بے چارے کے نتھنوں سے بھی ایسے خون ہی نکلنا شروع ہو گیا تھا۔۔تو تم لوگوں نے اس بے زبان کو گولی مار دی تھی''۔

خالد نے ماں کی بات پر جھنجھلاتے ہوئے کہا:

''ماں!وہ بات اور تھی۔۔۔میں بالکل ٹھیک ہوں''.

یہ بات کہنے کے بعد اس نے کرنل صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''آپ نے سوال کیا تھا کہ ہم دنیا میں اسلام کیوں نافذ کرنا چاہتے ہیں؟میں آپ کے اس سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں''۔

کرنل صاحب نے خندہ پیشانی سے جواب میں کہا:

''ہاں۔۔۔ہاں۔۔کیوں نہیں،شاید تیرے جواب سے مجھے کچھ سیکھنے کو مل جائے''۔

خالد کرنل صاحب کے جواب میں پوشیدہ طنز کو نہ سمجھ سکا،اس نے جواب میں کہا:

''یہ دنیا ایک عظیم جہالت سے دوچار ہے۔مغربی ممالک گناہ کی دلدل میں گردن گردن دھنس چکے ہیں۔اور اب ان سے یہ گندگی اسلامی معاشروں میں درآمد ہونے لگی ہیں۔یہ ریڈیو،ٹی وی،انٹرنیٹ،فلمیں یہ سب ان بھٹکی ہوئی اقوام کے شیطانی ہتھیار ہیں۔۔ہمیں ان اقوام کو تہذیب انسانی سے روشناس کرانا ہے''۔

کرنل صاحب نے خالد کی بات تحمل سے سننے کے بعد کہا:

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ انگریز ہندوستان پر قبضہ کرنے کی شرمناک عمل کی کیا توجیہ پیش کرتے تھے؟''

خالد نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

''معلوم نہیں،وہ لٹیرے اس بات کی کیا توجیہ پیش کرتے تھے''۔

کرنل صاحب نے جواب میں کہا:

''انگریزوں نے اپنی نئی نسل کو یہ بتایا تھا کہ انہوں نے ہندوستانیوں کو تہذیب سکھانے کے لئے ہندوستان پر قبضہ کیا تھا''۔

خالد نے یہ سن کر بلا سوچے غصے میں کہا:

''بکواس کرتے ہیں یہ انگریز، جنم جنم کے مکار اور جھوٹے''۔

کرنل صاحب نے جواب میں کہا:

''میرے بھائی! اس میں جھوٹ کیسا؟ یہ ریل کا نظام، نہروں کا جال، چھاپہ خانہ، سکول، کالج، یونیورسٹیاں، یہ سب انگریزوں کی ہی دین تو ہیں۔ سچ کو مان لینے میں کیا حرج ہے۔ البتہ سامراج سامراج ہوتا ہے اور سامراجیت کے اپنے تقاضے بھی ہوتے ہیں''۔

خالد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:

''چلیں ترقی والی بات کو مان بھی لوں تو کیا! یہ ترقی انگریزوں نے قرآن ہی سے تو سیکھی ہے لیکن یہ آپ کی سامراج والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ قاری صاحب سے یہ لفظ بارہا سنا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم نے افغانستان سے روسی سامراج کو مار بھگایا ہے اور امریکی سامراج کو بھی وہاں پر شکست دیں گے۔ یہ سامراج ہوتا کیا ہے؟''

خالد اور کرنل صاحب کی گفتگو میں سب لوگ دلچسپی لینے لگے تھے۔ سب نے ایک دوسرے سے گفتگو بند کر دی تھی۔

کرنل صاحب نے خالد کے سوال کا یوں جواب دیا:

''پرانے زمانے میں ہمارے پنجاب میں بڑے جاگیردار ہوتے تھے۔ یوں سمجھ لو کہ گاؤں کا سب سے بڑا جاگیردار گاؤں کی حد تک وہاں

کا سب سے بڑا سامراج ہوتا تھا۔

''حد سے زیادہ طاقت ملنے پر اُبھر کر سامنے آنے والے ظالم اور جابر کردار کو سامراج کہتے ہیں''۔

خالد نے کرنل صاحب کی بات سن کر جواباً کہا:

''مسلمان کے ہاتھ میں چاہے کتنی ہی طاقت آجائے کبھی سامراج نہیں بن سکتا''۔

کرنل صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب میں کہا:

''یار! تم تاریخ کے معاملے میں بالکل ہی کورے ہو''۔

جب ترکوں کو حد سے زیادہ طاقت ملی تھی تو ترک سلطان نے آس پاس کے ملکوں کو فتح کرنا شروع

کیا تھا، یہاں تک کہ ترک فوجیں فرانس تک گھس آئی تھیں''۔

خالد کرنل صاحب کا جواب سن کر کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگیا۔اُس کی ناک سے خون بہنا بند نہیں ہورہا تھا۔کرنل صاحب نے اُس کی حالت دیکھ کر کہا:

''تم نے شاید تابکاری سے آلودہ پانی پیا ہے!تم کو لیٹ جانا چاہیئے۔

بھاگ بھری نے کرنل صاحب کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا:

''پُتر!اپنے سے بڑے کی بات مان لینی چاہیئے، چل!آ۔لیٹ جا!۔۔ماں کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ جا۔اس طرح میرے کلیجے میں تھوڑی ٹھنڈک پڑ جائے گی''۔

خالد نے ماں کو قدرے خفگی سے جواب دیتے ہوئے کہا:

''میں ٹھیک ہوں ماں!مجھے کچھ نہیں ہوا''۔

یہ کہنے کے بعد پھر خالد نے کرنل صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''مجھے یقین نہیں آتا کہ خلافت کو لوگوں نے زمین پر قبضہ اور دوسرے قوموں کو غلام بنانے کیلئے استعمال کیا ہوگا..خلیفہ اس روئے زمین پر اللہ کا نائب ہوتے ہیں..وہ اس کے احکامات کو زمین پر نافذ کرتے ہیں''۔

کرنل صاحب نے اس بار تحمل کا دامن ہاتھ سے چھوڑتے ہوئے قدرے غصے میں کہا:

''میرے بھائی تم مدرسے سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکے ہو،اب میں تم کو اس مصیبت کے موقع پر مسلمانوں کی تاریخ پڑھانے سے تو رہا،تم خود ہی سوچو مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ کو قتل کیا گیا تھا،تیسرے کو بھی، چوتھے کو بھی اور پانچواں خونریز جنگیں لڑتے رہا۔یہ سب خونی کھیل مسلمانوں کے بیچ ہی میں کھیلا گیا تھا۔میرے بھائی خلافت اور اس کی طاقت کو حاصل کرنا ایک راج نیتی کا جھگڑا تھا جس میں مذہب کو استعمال کیا گیا تھا۔ہندوستان پر جو یہ مصیبت نازل ہوئی ہے۔وہ بھی مذہب کے نام پر آئی ہے سرپھرے اور کوڑھ مغز جہادی اگر یوم جمہوریہ پر مذہب کے نام دہشت گردی نہ پھیلاتے تو شاید دھرم کے زہرے ڈسے ہوئے جنرل کو ہندوستان پر ایٹمی حملہ کرنے کا موقع نہ ملتا۔یہ تہذیب ، یہ دھرتی مذہب کے نام پر اُجاڑ دی گئی ہے۔یہ کیسا سلامتی کا مذہب ہے کہ جس نے کروڑوں بے گناہوں کو موت کی نیند سلا ڈالا ہے،ان بے عقل حملہ آوروں کا خیال تھا کہ اس طرح دہشت گردی کے ذریعے وہ ہندوستان پر خلافت کا راج

نافذ کر دیں گے پھر یہاں کے وسائل، زمین، یہاں تک کہ ہمارے جوان بوڑھے، عورتیں ان کی ملکیت بن جائیں گے۔ خلیفہ صاحب جس مجاہد کو چاہیں گے ہماری دوشیزائیں، مالِ غنیمت کے طور پر تحفہ میں پیش کر دیں گے"۔ کرنل صاحب اپنی بات کر کے خاموش ہو گئے تھے، لیکن ان کی آنکھوں میں غصے اور رنج کی پرچھائیاں ابھی تک نمایاں تھیں۔

خالد نے کرنل صاحب کے جذبات کو نظر انداز کرتے ہوئے انکشاف کیا:

"کرنل صاحب! یوم جمہوریہ کے موقع پر وہ حملہ میں نے ہی کیا تھا، اور مجھے اس اقدام پر کوئی ندامت نہیں ہے بلکہ فخر ہے"۔

خالد کا یہ انکشاف سن کر دو جوان غصے کے عالم میں اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ کرنل صاحب کے دادا نے جوانوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اِن کے بیٹھنے کے بعد کرنل صاحب نے سرد لہجے میں کہا:

"حیرت ہے! تمہارے ضمیر پر، اتنے بے گناہوں کے قتل پر تم کو ندامت کے بجائے فخر ہے"۔

خالد نے سپاٹ لہجے میں یوں جواب دیا:

"مجاہدین اپنے امیر کے ہاتھ پر بیعت کیے ہوتے ہیں، اس لیے ان کا اسلامی فریضہ ہوتا ہے کہ وہ آنکھ بند کر کے اپنے امیر کی اطاعت کریں۔ آپ ایک فوجی افسر ہیں۔ کیا آپ اپنے سے بڑے افسر کا حکم ماننے سے انکار کریں گے؟"۔

کرنل صاحب کی شائستگی خالد کے جوابات سن کر ساتھ چھوڑتی جا رہی تھی۔

انہوں نے تلخ لہجے میں کہا:

"تم ہم پیشہ ور سپاہیوں کا اپنے ساتھ کیسے موازنہ کر سکتے ہو؟"

خالد نے جواب دینے میں ذرا وقفہ لیا، اس کے گلے میں درد ہو رہا تھا۔ وہ اپنے اس کرب کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر میں اس نے درد پر قابو پانے کے بعد کہا:

"ہمارا اور آپ کا تقابل کیوں نہیں ہو سکتا؟ آپ لوگ بھی بندے مارتے ہو اور ہم بھی، بس فرق صرف اتنا ہے کہ ہم لوگ بغیر وردی کے

ہوتے ہیں اور آپ لوگ وردی پوش، ذرا خلافت بحال ہونے دیں پھر ہمارے جسم بھی وردی سے سج جائیں گے''۔

اب کرنل صاحب اپنے غصے پر قابو پا چکے تھے۔

انہوں نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا:

''بھائی میرے! بے شک ہم اپنے افسر کا حکم نہیں ٹالتے ہیں لیکن ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکم ایک نظام کے تحت آیا ہے۔ ہمارے افسران اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ ہماری درجہ بدرجہ کمان کے علاوہ ہمارے جرنیلز کے اوپر حکومت کا حکم اور کنٹرول ہوتا ہے۔ ہم ایک ریاست کے تابع ہوتے ہیں اور تم لوگ غیر ریاستی عناصر ہو۔ تم جیسے لوگوں کی ڈور نامعلوم افراد کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ اب تم خود ہی بتا دو کہ تمہارا امیر کون تھا اور وہ کس سے احکامات لیتا تھا؟''۔

خالد نے کرنل صاحب کے سوال کا جواب دینے کے لئے ایک وقفہ لیا پھر کہا:

''میرے امیر قاری سفیان ہیں اور مجھے وہی احکامات دیتے تھے۔ انہوں نے ہی مجھے دین اسلام میں داخل کیا تھا، انہوں نے غزوہ ہند کی بشارت دے کر مجھے غزوہ خراسان و ہند کا کمانڈر مقرر کیا تھا، ان کے اوپر کمانڈر کون تھا مجھے معلوم نہیں! بس میرے لئے صرف یہی بات اہم ہے کہ میں افغانستان میں لشکرِ اسلام سے جا ملوں''۔

کرنل صاحب نے ہنستے ہوئے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''یار! بہت ہی بھولے بادشاہ ہو، تم کئی برسوں سے ایک وادی میں محصور رہے تھے شاید اس لئے تمہیں معلوم نہیں کہ ہندوستان و پاکستان کی مشترکہ فورس نے قاری سفیان کو پکڑ لیا تھا، اس نے سب کچھ بتا دیا تھا کہ وہ کس کے احکامات پر عمل کرتا تھا۔ شروع میں تو وہ پاکستانی خفیہ ایجنسیوں کی آنکھوں کا تارا تھا، لیکن بعد میں انہوں نے اپنے روابط عرب امیر ملکوں کے دولت مند شیخوں سے بڑھا لئے تھے۔۔ وہ تو بعد میں ان کے ہی اشاروں پر چلنے لگا تھا۔ وہ اندرونی اور بیرونی ممالک کے بنکوں میں غیر ملکی کرنسیوں کی دولت کا مالک تھا۔ اس بے ضمیر کو تو عدالت سے موت کی سزا بھی ہوگئی تھی لیکن اس کو قید خانے میں ایک قیدی نے ہی مار ڈالا تھا''۔

کرنل صاحب سے یہ انکشاف سن کر خالد کو کھانسی شدید دورہ پڑ گیا۔

وہ کپڑا منہ پر رکھ کر کھانستے کھانستے دہرا ہوگیا۔ پاس بیٹھی ہوئی بھاگ بھری نے اُس کی کمر کو سہلانا شروع کردیا۔

جب خالد کی کھانسی میں افاقہ ہوا تو اس نے ماں کی طرف دیکھے بغیر کہا:

''ماں! میں ٹھیک ہوں، مجھے کرنل صاحب سے بات کرنے کردیں''۔

بھاگ بھری نے یہ سن کر بیٹے کی کمر کو سہلانا بند کردیا۔

خالد نے کرنل صاحب کو مخاطب کرکے دریافت کیا:

''کیا آپ نے جو کچھ کہا وہ سچ ہے؟، کیا غزوہ خراسان کا رن نہیں پڑا! کیا خلافت کے کالے جھنڈے عرب اور افغانستان سے ہوتے ہوئے ہندوستان کی طرف نہیں بڑھ رہے۔ غزوہ ہند کا ذکر حدیثوں میں آیا ہے، حدیث کبھی جھوٹی ثابت نہیں ہوسکتی، حدیث میں بیان ہوئی ہے بات ہو کر رہے گی''۔

کرنل صاحب نے خالد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

''بھائی میرے! تقریباً سارا ہندوستان اپنے باسیوں سے خالی ہوچکا ہے جو چند لوگ بچے ہیں، موت ان کا تعاقب سرُعت سے کررہی ہے۔ میرے بھائی! ایسی مصیبت میں کوئی بھی انسان بھی جھوٹ بولنے کا سوچ نہیں سکتا، میں کچھ ماہ پہلے تک اقوام متحدہ کے امدادی افسروں کے ساتھ رابطے میں تھا۔ اس لئے مجھے موجودہ حالات سے آگاہی ہے۔ افغانستان میں اب بھی ایک جمہوری حکومت قائم ہے۔ وہاں کے پاکستان سے ملحقہ علاقوں میں قحط پڑا ہوا ہے۔ اس لئے وہاں سے آبادی کا بڑا حصہ محفوظ علاقوں کی طرف نقل مکانی کر گیا ہے۔ رہی بات لشکر اسلام کی، تو بات یہ ہے کہ عرب علاقوں میں موسم کی تبدیلی نے بہت شدید اثر ڈالا ہے۔ صرف وہی لوگ زندہ بچے ہیں جنہیں ائرکنڈیشن کی سہولت میسر تھی۔ صحراؤں اور شہروں کی سڑکوں پر لڑنے والے خلیفہ کے مجاہدین مچھر اور مکھیوں کی مانند موسم کی شدت سے مارے گئے ہیں، عرب سرزمین میں گرمی کی شدت کی وجہ سے ایک بڑی آبادی مرچکی ہے''۔

کرنل صاحب کی بات سن کر خالد کی سانس رکنے لگی۔ اُس کو ہچکیاں لگ گئیں۔ معاویہ اسکے برابر میں آکر بیٹھ گیا۔

کرنل صاحب نے خالد کے لبوں پر چائے کا پیالہ لگاتے ہوئے کہا:

''خالد، خالد...حوصلہ کر!۔ چائے کا گھونٹ بھر شاباش!''

خالد کو چائے کا ایک گھونٹ بھر کر سکون آیا تو اس نے کہا:

''میں خالد نہیں ہوں مجھے اب کوئی اس نام سے نہ پکارے۔ میں ساون ہوں۔ میری ماں نے میرا نام ساون رکھا ہے۔ مجھے اب آپ ساون ہی نام سے پکاریں اب میرا اسلام سے کوئی رشتہ ناطہ نہیں۔ جس نے مجھے ساون سے خالد بنایا تھا اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ غزوۂ ہند ہوگا خراسان کی جنگ ہوگی۔ آہ یہ سب جھوٹ تھا! میرے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوا ہے۔ شاید مجھے ماں کو اکیلے چھوڑ جانے کی سزا ملی ہے یہ..

اتنا کہہ کر وہ زاروقطار رونے لگا۔ بھاگ بھری نے اپنے ساون کو کبھی روتے نہیں دیکھا تھا۔ بیٹے کا گریہ سن کر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں ہوگیا۔ یہ منظر دیکھ کر بزرگوار کھڑک سنگھ نے ایک جوان کو اشارہ کیا۔ اس جوان کی مدد سے وہ بھی خالد کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے خالد سر پر ہاتھ رکھ کر شفقت سے کہا:

''پُتر! تیرے دل میں کوئی بات پھانس کی طرح کھبُ گئی ہے. نکال پھینک اُسے. یہاں سب تیرے اپنے ہی ہیں''۔

خالد کو کھڑک سنگھ کی بات سن کر کچھ دلاسہ ہوا تو اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا:

''میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ میں آپ سب کا مجرم ہوں۔ یوم جمہور پر تباہی میں نے ہی پھیلائی تھی۔ قاری صاحب کا خیال تھا کہ

پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ چھڑنے پر پاکستان آرمی ہم مجاہدین کو بھی دعوت جہاد دے گی۔ اس طرح ہم ان کے ساتھ مل کر لال قلعے پر اسلام کا جھنڈا لہرانے میں کامیاب ہوجائیں گے''۔

یہ کہنے کے بعد خالد اپنا گلا پکڑ کر کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگیا۔ درد کی شدت اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہورہی تھی۔ کچھ دیر میں خالد نے اپنی توانائی کو بحال کرنے کے بعد سلسلہ گفتگو کو یوں شروع کیا:

''قاری صاحب کو غزوۂ ہند کی حدیث پر پورا یقین تھا، انہوں نے مجھے خرُاسانی کا لقب دے کر غزوہ ہند کا کمانڈر مقرر کیا تھا۔ خالد کی سانس پھرا ٹکنے لگی۔

کھڑک سنگھ نے خالد کی کمر پر ہاتھ مار کر اسے سانس لینے میں مدد کی۔ایک زوردار ہچکی سے اس کا سانس بحال ہوا،تو اس نے کہا:

''مجھے کیا خبر تھی کہ یوم جمہور یہ پر حملہ عام جنگ کے بجائے ایٹمی جنگ چھیڑ دے گا۔میں قاتل ہوں...کروڑوں انسانوں کا قاتل..سب جھوٹ تھا...خلافت کے کالے جھنڈے،خراسانی کا لقب،غزوہ ٔہند کی بشارت،آہ یہ سب سراب تھا''۔

یہ سب کہنے کے بعد خالد کی آواز پھر سے رندھنے لگی۔اس کا سانس دوبارہ سینے میں اٹکنے لگا تھا..کرنل صاحب نے اسے لٹا کر اس کے سینے کو دبایا تا کہ اِس کو سانس لینے میں آسانی ہو سکے۔اس کے نتھنوں سے سانس لینے کے ساتھ ساتھ خُرخُر کی آوازیں نکل رہی تھیں۔اور دونوں نتھنوں سے دوبارہ خون بہنا شروع ہو گیا تھا....بھاگ بھری نے اس کا سر اٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیا۔اب اسے سانس نہیں آرہا تھا۔وہ سانس نہ آنے کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔بھاگ بھری کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو خالد کے چہرے پر ٹپک رہے تھے۔

کرنل صاحب نے خالد کے نتھنوں سے خون صاف کر کے اس کے منہ پر منہ رکھ کر اس کے پھیپھڑوں میں ہوا بھرنے کی کوشش کی لیکن خالد کی روح اُس کے جسم کا ساتھ چھوڑ چکی تھی...بھاگ بھری میرا ساون...میرا ساون کہہ کر سینہ کوبی کر رہی تھی...

سرزمین ہند سے ساون ہمیشہ کے لئے روٹھ چکا تھا۔

صفدر زیدی نے ایک بڑے کینوس پر ناول لکھ کر ہمیں حیران کر دیا ہے۔ موجودہ حالات اور سیاسی منظرنامے کے پیش نظر ماضی اور مستقبل کے کولاژ سے صفدر زیدی نے ایک ایسے موضوع کو اٹھانے کی کوشش کی ہے، جہاں راستہ بھی ہے، زندگی بھی۔ یہ ناول موجودہ سنگین حالات کے لئے چیلنج بھی ہے، عوام میں بیداری پیدا کرنے کا مشن بھی۔

میں ان کی جرأت رندانہ کو سلام کرتا ہوں۔

مشرف عالم ذوقی

''بھاگ بھری'' پاکستان کی حشر سامانیوں، عدم مساوات اور ریاستی جبر پر نوحہ کناں ہے۔ اس ناول نے لفظی مصوری کے اظہار اور پُر اثر جمالیاتی علامتوں کے استعمال سے معاشرتی خول میں بند دیمک زدہ معاشرے کے چہرے سے نقاب اُلٹ کر رکھ دی ہے۔

احمد سہیل

صفدر زیدی کا ناول ایک طاقتور بیانیہ ہے، جس میں جنوبی ایشیا کے دو اہم حریفوں کے مابین تاریخی کشمکش ناممکنات کو ممکنات سے ہمکنار کرتی نظر آتی ہے۔ یہ ناول حقیقت نگاری اور فکشن کا زبردست امتزاج ہے۔

اقبال لطیف

AKSPUBLICATIONS
Book Street, Data Darbar Market, Lahore.
Ph 042-37300584,Cell # 0300-4827500-0348-4078844
E-mail:publications.aks@gmail.com